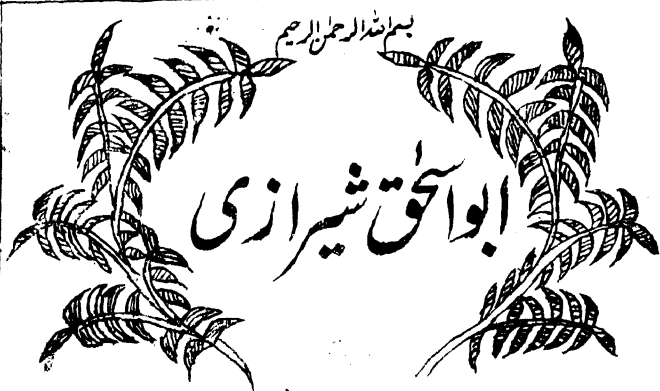


UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222863

UNIVERSAL
LIBRARY



از مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شریعہ (رحمہم اللہ)

شیخ جمال الدین ابوالسحق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی خاک پاک شیراز نے
 جان حافظ کا ایسا غزل سراور سعدی کا ایسا شاعر غزلی اور ناصح پیدا کیا وہ ان ابوالسحق
 کا ایسا ایک عالم بھی اسلامی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس کی شہرت مقبولیت اور
 علمی وقت دنیا سے علم کو ہمیشہ اُس کا احساندہ بنائے رکھی گی۔ اکثر علما کسی خاص فن اور
 خاص علم میں ناموری حاصل کر سکتے ہیں مگر علامہ ابوالسحق کو خدا نے ہر علم میں ایسا بحر
 عطا کیا تھا کہ ہر طبقہ کے اہل کمال مقتدا کی کامند آج تک اُن مرحوم کے لیے خالی
 کر دیتے ہیں۔ لیون تو اُن کا شمار فقہائے شافعیہ میں ہے لیکن اہل میں وہ ہر فن کے مرد
 میدان میں یتکلمین ان کی دقت نظر اور خیال آفرینی کے والد رشید ابن محمد میں اپنے
 قدیم اور مستند شیوخ میں شمار کرتے ہیں جن کی روایت عموماً بے کسی قسم کی جرح کے تسلیم
 کر لی گئی ہے اور جن پر روایت کا مدار ہے۔ اصول فقہ کے متعلق علامہ ابوالسحق نے اپنی
 تصانیف میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے اہل اصول آج تک نفع اٹھا رہے ہیں۔ اہل فقہ
 نے بھی نہایت ذوق و شوق اور فروغ و عزت کے ساتھ ان کے اجتہاد اور استخراج مسائل کا
 تتبع کیا ہے۔ اور سب پر طرہ یہ کہ صوفیہ کرام ان بزرگ کو اپنے مشائخ اور اہل دل
 امہ میں تسلیم کرتے ہیں۔ علامہ ابوالسحق نے جس طرح اپنے ظاہر کو نور علم و فضل
 سے آراستہ کیا تھا اسی طرح باطن کو بھی سلوک کی ریاضتوں سے پیرا ستہ بنا لیا
 تھا۔ وہ فقیری کی گڈری پہن کے مسند علم پر جلوہ افروز ہوئے تھے۔

تمام مصنفوں نے اپنی کتابوں کے اوراق کو علامہ مدوح کے اوصاف سے
 زیب و زینت دی جو اور بڑے بڑے معتبر و مستند مورخین اُن کی مدح سرائی
 اپنا خیر سمجھتے رہے ہیں کتاب منظرہ کے مصنف نے کیا خوب جملہ لکھا ہے "شیخنا
 ابواسلمی حجۃ علی ائمة العصر" (ہمارے شیخ ابواسلمی زمانے بھر کے ائمہ کے لیے حجت
 ہیں) موفق حقی نے اس سے بھی بڑھ کے لکھا ہے "الشیخ ابواسلمی اصیل المومنین
 فیما بین الفقہاء" (شیخ ابواسلمی تمام فقہاء میں وہ حیثیت رکھتے ہیں جو کوئی بادشاہ
 اپنی رعایا میں رکھتا ہو) محب الدین بن بخار نے اپنی تاریخ بغداد میں اس امام
 علوم کی شان میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "علامہ ابواسلمی علماء شافعیہ
 کے امام تھے اور وہ شخص تھے کہ ان کے علم و فضل کا شہرہ دور دور کے شہروں
 میں پھیل گیا اور یہ حیثیت علم و نہ ہد اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گئے۔ بہت
 سے مالک شے اکثر علماء اُن کے شاگرد ہیں" ان چند جملوں سے علامہ ابواسلمی کے ایسے
 کتابے عصر کے فضائل کا ہر مہر ہو سکتے۔ وہ تمام کتابیں جن کے مصنفوں کو دنیائے
 اعتبار اور استناد کے خلعت دیے سب ان کے تذکرہ کمالات اور علوم سے بھری
 پڑی ہیں۔

خراسان کے شہر فردز آباد کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اسکے سوا دین ۳۹۳ء یا
 ۳۹۵ء یا ۳۹۶ء میں (علی اختلاف الروایات) علامہ ابواسلمی پیدا ہوئے بچپن
 کا زمانہ اسی شہر میں گذرا۔ یہ نہیں معلوم کہ اُنھوں نے مان باب کے دامن تربت میں
 وہاں کہاں تک تعلیم پائی۔ اور اُن کی وہ ابتدائی زندگی کیونکر گزری مگر خود اُنھیں
 کے دل میں علم کا ذوق و شوق جوشا رہا تھا جس نے وطن مالون میں نہ رہنے دیا۔ پندرہ
 سولہ برس کی عمر ہوئی ہوگی کہ سلاطین میں صرف بغرض تحصیل علم فردز آباد چھوڑ
 کے دارالعلم شیراز میں آئے۔ جوان دنوں علم و فضل کا بڑا مرکز تھا۔ اور جس کی کشش نے
 آخر اُنھیں اپنا بنا لیا۔ شیراز کا ہر مہر گلی کو چہ دولت علم سے مالا مال تھا۔ ابواسلمی کو اپنے
 شوق کے مناسب یہ ایسا شہر مل گیا کہ ذوق علم نے ہر گلی کو چہ میں پھرایا اور ہر دروازے
 پر پہنچایا۔ وہاں جتنے علماء تھے سب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سب کی صحبت
 سے فائدہ اٹھایا۔ تو اُن اس مہر کے پیچھے پیچھے رہے جس پر ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ

بیضاوی۔ بیچ کے درس دیا کرتے تھے۔ اور ایک عرصہ تک ابو احمد عبد الوہاب راین کے حلقہ درس میں شریک ہوتے رہے۔ جب ابواسحق کو استخراج مسائل اور اصول فقہ کے دلائل شرعیہ سے خوب واقفیت ہو گئی تو انھوں نے اپنے آپ کو مدرسین اور اساتذہ شیراز اور وہان کے فقہا کی صحبت سے مستغنی پایا۔ مگر آتش شوق کی حدت ابھی تک بدستور تھی۔ آخر اس نے شیراز بھی چھوڑا۔ اور وہان سے روانہ ہو کے بصرے میں پہنچے۔ ایک عرصہ تک اس شہر میں قیام رہا اور ابن خوزی کی محفل درس میں برابر بلا ناغہ شریک ہوتے رہے۔ زمانہ قیام بصرہ میں ابواسحق معمولاً مشکل مشکل مسائل ابن خوزی کے سامنے پیش کر کے حل کرتے تھے۔ اور اپنے دل کے خیالوں کو شبہات وغیرہ سے صاف کیا کرتے تھے۔ ان کی جستجو نے بصرہ کے علمی خزانے بھی جان ڈالے مگر شوق علم بدستور باقی تھا تو بصرہ کو بھی چھوڑا اور دارالسلام بغداد کی راہ لی۔

۱۵۸۵ھ میں بغداد پہنچے۔ بغداد کی علمی شہرت اس عہد میں اس انتہائی درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ تمام دنیا کا مرجع بن گیا تھا۔ اور کون علم و فن تھا جس کے باکمال سواد اعظم بغداد میں مجتمع نہ تھے۔ بغداد میں اگرچہ طالب علمی نے علامہ ابواسحق کو بہت سے مکاتب سے دوچار کرایا۔ مگر ان کے ذوق و شوق کو فرو کرنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ ہر استاد کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا۔ اور ہر عالم کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا۔ یہ معمول تھا کہ ابواسحق اپنے اساتذہ سے روز جو کچھ حاصل کرتے تھے اُس کو گھر جا کے بالالتزام سوا بار تکرار کرتے تھے۔ یوں تو علامہ مندوج نے بغداد کے اکثر اساتذہ کی صحبت اور تعلیم سے فیض اٹھایا مگر خاص جس فخر بغداد اہل کمال کے دامن تعلیم میں ترقی کر کے وہ رتبہ مرجعیت اور مقبولیت کو پہنچے وہ قاضی ابو الطیب طبری ہیں۔ علامہ ابواسحق کو شاید قاضی طبری کے ساتھ زیادہ محسن عقیدت تھا۔ اس لیے کہ حاضر ہونے کو تو وہ ہر ایک کی محفل فیض میں حاضر ہوئے مگر جس التزام اور سرگرمی کے ساتھ انھوں نے قاضی طبری کی صحبت سے نفع اٹھایا وہ کوشش اور کسی کی خدمت میں نہیں کی۔ خود علامہ ابواسحق کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

یافعی اپنی تاریخ مرآة الجنان میں لکھتے ہیں کہ علامہ ابواسحق نے اپنی تاریخ طبقات الفقہاء میں اپنے اساتذہ میں سے دس متبحر حکماء کے نام بتائے ہیں۔ مگر ان میں

سے بھی جس کے لمذہب اُنھوں نے فخر کیا ہے۔ اور جس کی خدمت باریکت سے زیادہ فیض اُٹھانے کا اعتراف کرتے ہیں وہ وہی قاضی ابوالطیب طبری ہیں۔ بلکہ تاریخ ابن خلکان کے دیکھنے سے اس کی اور تصریح ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اُس مورخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابواسحق عرصہ تک نیابتاً قاضی طبری کی طرف سے اُن کے تلامذہ اور شاگردوں کو درس دیا کرتے تھے۔ اور اکثر اوقات خود قاضی صاحب کی تقریر تلامذہ کے سامنے بیان کر دیا کرتے تھے۔

آخر شوق علم میں یہ سرگرمیان اور ایسی جفا کشیان ظاہر کرنے اور ایسے دور و دراز کے سفر اختیار کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ اکثر علوم میں خصوص فقہ۔ اصول فقہ۔ حدیث۔ کلام۔ اور تصوف میں کمال حاصل ہو گیا۔ اور طالب علمی کے درجے سے گزرتے مذہب شافعی کے اعلیٰ رُکن بن گئے۔ زمانے نے اُن کے کمالات کو تسلیم کر لیا۔ ایک طرف تو فقہاء اور طلبہ کے قافلے اُن کے فیض صحبت سے نفع اُٹھانے کے لیے اور دوسری طرف صوفیہ کرام اور اہل ذوق پاکبازان فقر و تصوف کے گروہ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے واسطے چلے آتے تھے۔ اُن کا دروازہ ایک عالم کا مرجع بن گیا۔

افسوس قدیم مورخوں نے گزشتہ امور و ن کی سوانح عمری بیان کرتے وقت اُن کا حلیہ بتانے کی طرف بہت کم توجہ کی ہے۔ اور اسی وجہ سے ہم اپنے احباب کو علامہ ابواسحق کی تصویر نہیں دکھا سکتے۔ بغداد کے ایک شاعر عاصم کا خدا بھلا کرے کہ اُس نے علامہ مدوح کی محرابی پر دوشِ عروں کے ذریعہ سے اتنا بتا دیا جو کہ وہ بہت دُبلے پتلے اور نحیف الجسمہ شخص تھے۔ وہ کہتا ہے۔

”تَوَلَّاهُ مِنَ الزَّكَاءِ نَحِيفَ جِسْمٍ عَلَيْهِ مِنْ قَدِيدِ الدَّلِيلِ
اِذَا كَانَ الْفَتَى ضَخْمَ الْمَعَانِي فَلَيْسَ يَضُرُّهُ الْجِسْمُ الْفَحْلُ

یعنی دُبلے پتلے ہونا اس کی دلیل ہے کہ اشتعالِ ذکاوت نے انھیں کھلا اور جبکہ انسان علما اور معنی عالی رتبہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر وہ نحیف و ناتوان ہے۔

علامہ ابواسحق کو اپنی مقبولیت عامہ کے علاوہ ایک حیثیت سے یہ فخر

بھی حاصل تھا کہ کسی حد تک بلکہ بہت کچھ وہ اپنے اوپر خود ہی نازل کر سکتے تھے۔ سمعانی نے خود علامہ مددوح سے روایت کی کہ وہ لکھتے ہیں ایک مرتبہ میں نے عالم مشاہدہ میں جال پاک حضرت رسالت پناہ صلوٰۃ اللہ علیہ وآلہ کی زیارت کی۔ اس وقت اصحاب کبار میں سے دس جلیل القدر شخص بھی آنحضرت کی خدمت میں حاضر تھے۔ آنحضرت کی صورت پاک دیکھتے ہی ایک بے تابانہ شوق سے جھپٹ کے میں قریب گیا۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ کی بہت سی احادیث بذریعہ صحابہ و تابعین مجھے تک پہنچی ہیں اور میں نے ان کے ذریعہ سے اپنے سینہ و دل کو بہت کچھ نورانی بنالیا ہے۔ اور ان اخبار و احادیث کو اہل اسلام میں پھیلانے اور رواج دینے میں میں نے انتہا سے زیادہ تکلیفیں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ اپنے سر سے میں نے یہ فرض بھی ادا کر دیا ہے کہ آپ کے عشاق اور آپ کے کلام کے مشاقون کو میں نے اخبار و روایات کی اجازت روایت دیدی اب آرزو مند ہوں کہ خاص آپ کی زبان فیض ترخان سے بے واسطہ کوئی حدیث سنوں اور اس کو روایت کر کے عالم میں خاص امتیاز کا ستی قرار پاؤں۔ اگر یہ فخر مجھے حاصل ہوا تو مجھے دیگر مورخوں کے مقابل میں اپنے اوپر زیادہ ناز کرنے کا موقع ملے گا۔

جواب رسالت آب صلعم نے سیری التجا و زاری شن کے سیری طرت توجہ کی اور یہ کلمات ہدایت ارشاد فرمائے۔ ”یا شیخ من اذکاد السلا مۃ فلیطلبہا فی سلا مۃ غیرہ منہ“ اسے شیخ جو کوئی بھلائی اور سلاستی چاہتا ہو اسے چاہیے کہ سب کو اپنے سے خوش رکھے اور کسی کو بھی آرزو نہ کرے۔ مورخین کا بیان ہے کہ علامہ ابو اسحق حبیب تک زندہ رہے اس خواب کو یاد کر کے خوش ہوتے تھے۔ اور اس امر پر فخر کرتے تھے کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے ”شیخ“ کے لفظ سے یاد فرمایا۔

علامہ ابو اسحق اگرچہ بغداد میں بطور طالب علمی کے اور صرف بغرض تحصیل علم آئے تھے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ خاک دار السلام بغداد نے اس فاضل گمانہ کے قدم اس مضبوطی سے پکڑے کہ اُن کو پھر اپنے وطن میں جا کے قیام کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اس لیے کہ اُن کی زندگی کے واقعات عموماً بغداد ہی سے متعلق ہیں سلطان ملک شاہ کے مشہور وزیر خواجہ نظام الملک کو علامہ مددوح کے ساتھ انتہا سے

زیادہ حسن عقیدت تھا ۱۹۵۹ء میں جب وزیر موصوف نے عالیشان مدرسہ نظامیہ کھولا جس کی شہرت آج تک دنیا میں ایک حیرت و استعجاب کا تماشہ دکھلاتی ہے تو علامہ ابوالحسن ہی کو اس کی پروفیسری کے لیے منتخب کیا۔ اس مدرسہ کا تفصیلی حال ہم دگلڈاز کے کسی پرچہ میں لکھ چکے ہیں۔ جس تاریخ مدرسہ نظامیہ کھلنے والا تھا اس روز بغداد میں بہت بڑا اہتمام کیا گیا تھا۔ مدرسہ کے تمام لوگ اور طلبہ تمام اطراف و جوار سے آکے جمع ہوئے خاص ارکان سلطنت اور امرائے بغداد میں سے بہتوں نے صرف اس لیے کہ رسم افتتاح نہایت شان و شوکت سے ادا ہو طلبہ و دانشمندان علوم میں اپنا نام لکھوا دیا۔ علاوہ برین کل ارکان دولت و مناصب اور امرائے بغداد اس کا رخیر کو بخیر و خوبی انجام دینے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ مدرسہ کے دروازے پر اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ علامہ ابوالحسن آئیں تو ان کو ہاتھوں ہاتھ لین اور اس منبر پر بٹھائیں جو پروفیسر کے لیے بنائے مدرسہ میں رکھا گیا تھا۔ اس انتظار میں بہت دیر ہو گئی۔ اور لوگ بیٹھے بیٹھے اکتانے لگے۔ مگر علامہ مدد و روح نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ آخر مایوس ہو کر سب لوگ کہنے لگے معلوم ہوتا ہے شیخ ابوالحسن اس وعدہ کو قبول کرنا اپنے لیے باعث تنگ اور اپنے خیال میں مستکہ سمجھے جب یقین ہو گیا کہ اب وہ نہ آئیں گے تو ابو منصور بن یوسف اور عبد ابو سعد نے جن کے اہتمام و انتظام سے مدرسہ تیار ہوا تھا باہم مشورہ کر کے یہ قرار دیا کہ علامہ ابوالحسن نہیں منظور کرتے ہیں تو اس کام پر امام ابو نصر بن صباغ کو جو علامہ مدد و روح کے معاصر تھے اس مسئلہ قضا پر بلائے بٹھائیں۔ اور تعلیم و درس کا کام ان کے سپرد کر دیں۔ اس راس کے قرار پانے ہی ابن صباغ طلب کر لیے گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو لوگ آج پہلے ہی روز بے درس کے چلے جائیں۔ اگرچہ امام ابو نصر ابن صباغ نے آنے میں بہت کچھ عذر و انکار کیا مگر ابو منصور نے ان کو اطمینان دلایا اور وعدہ کیا کہ نظامیہ کی پروفیسری ہمیشہ انھیں کے متعلق رہے گی۔ اور وہ اس منصب سے کبھی نہ ہٹائے جائیں گے۔ ابو نصر نے مدرسہ نظامیہ میں افتتاح کے دن درس دیا۔

لوگوں کو حیرت ہوئی کہ علامہ ابوالحسن نے کیوں حاضری سے روپوشی کی

ان کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ اور اُن سے مضبوط وعدہ لے لیا گیا تھا وقت معین پر نظامیہ میں جانے کے لیے وہ اپنے گھر سے بھی نکلے مگر تھوڑی ہی دیر گئے ہوں گے کہ راہ میں ایک لڑکا ان کے سامنے آیا اور کہنے لگا "ایہا الشیخ کیف تدا دس فی مکان مغبوب" یعنی صاحب آپ ایک غصبی مقام میں کیوں درس دین گے اتنا سنا تھا کہ علامہ مددوح دہین سے پلٹ پلٹے۔ اور ایک مخفی مقام میں چھپ کے بیٹھ رہ کر کہیں ایسا نہ ہو مجھے مجبوراً ہان جانا پڑے۔ دوسرے روز جب معلوم ہو گیا کہ ایام الوفصر نے نظامیہ میں درس دیا تو اطمینان سے اپنی خاص مسجد میں جو باب المرتب میں بھی بیٹھ کے اپنے شاگردوں کو درس دیا اور قصد کر لیا کہ اپنے شاگردوں اور تلامذہ کو وہیں جمع کر کے درس دیا کریں۔ مگر اُن کے تلامذہ بھی اُن کی اس کارروائی سے ناراض ہو گئے تھے۔ اکثر دن نے شیخ ابوالسختی کے پاس کھلا بھیجا کہ اگر آپ اپنے اس ارادے پر قائم رہیں گے تو ہم سب آپ کو چھوڑ کے ابن صباغ کی شاگردی اختیار کر لیں گے۔

اوجہ جب وزیر نظام الملک کو یہ خبر ہوئی کہ علامہ ابوالسختی کے نہ آنیکی وجہ سے انصاف صباغ نے نظامیہ میں درس دیا تو وہ نہایت ہی برہم ہوا اور سارا الزام عید ابوسعید پر لکھ کر کہنے لگا کہ چونکہ اس کو قدیم دستہ شیخ ابوالسختی کے ساتھ مخالفت اور عداوت ہے اس وجہ سے اس نے ابوالسختی کو محروم کر کے ابن صباغ کو نظامیہ کا پروفیسر مقرر کر دیا۔ عید ابوسعید نے یہ قباب آمیز کلمات سنے تو اس سے سوا اس کے اور کچھ نہ بن پڑا کہ علامہ مددوح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور نہایت التجا اور گریہ و زاری کے ساتھ عرض کیا کہ وزیر نظام الملک کے میری نسبت یہ خیالات ہیں۔ اگر آپ میری التجاؤں کو نہ سنیں گے تو وزیر نظام الملک غضب آلود ہو کر میرے مال ہی پر اکتفا نہ کریں گے بلکہ میری جان کو بھی اُن کے ہاتھ سے حذر پرہیز کا اندیشہ ہے۔ بعد میں حال بدترس کھائے اور نظامیہ کی مدرسہ قبول فرمائے۔ آپ کے تشریف لے چلنے سے خواجہ نظام الملک اور تمام متعلقین مدرسہ اور کل شائقین علوم کو بڑی خوشی اور مسرت ہوئی یہ باتیں سن کے علامہ ابوالسختی دیر تک غور کرتے رہے۔ اور رحم نے دل میں ایسا جوش مارا کہ اس عہدے کو قبول کر لیا اور افتتاح کر لیا۔ اور بعد چلے مدرسہ نظامیہ میں درس دیا۔ ان کے جانے کی نظام الملک کو اتنی خوشی ہوئی کہ عید ابوسعید کا احسان مند اور شکر گزار ہوا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ علامہ ابوالسختی کو مدرسہ نظامیہ کی بعض چیزوں کے

منصوب ہونے کا یقین تھا اور یہ خیال آخر تک اُن کے دل میں رہا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ نماز اُس مدرسہ میں کبھی نہ پڑھی نماز کا وقت آیا اور وہ مدرسہ کے صحن سے نکل گئے نظامیہ کے قریب ایک اور مسجد تھی اُس میں جا کے نماز ادا کیا کرتے تھے۔

علامہ ابو اسحق نے جو وقعت اور عزت ہر دل میں پیدا کر لی تھی وہ کسی اور عالم کا نسبت شاید بہت کم سنی گئی ہوگی۔ واقعی ان کی مقبولیت عام کے وقائع ایسے ہیں کہ انسان حیرت میں رہ جائے۔ خلیفہ بغداد قائم بامر اللہ عباسی نے جب جان فانی سے کوچ کیا تو اسکے بعد دوسرا خلیفہ تجویز کرنے میں بڑی دقتیں پیدا ہوئیں۔ تمام اہل بغداد نے متفق اللفظ کہہ دیا کہ علامہ ابو اسحق جس کسی کو تجویز کریں اُس کے ہاتھ میں خلافت دیجائے۔ علامہ ابو اسحق کو اگرچہ انتظام ملک میں کوئی دخل نہ تھا۔ مگر دنیا میں جس نفاذ کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا اسکے خوف سے اُنھوں نے لوگوں کی خواہش کے بموجب خلیفہ تجویز کرنے کا بار اپنے سر پر اٹھالیا۔ اور مقتدی بامر اللہ کو خاندان ابو عباس میں سب سے زیادہ اہل حق اور راستباز خیال کر کے تجویز کر دیا۔ مقتدی کو اصل میں پوچھتے تو علامہ مدد ورج ہی نے خلیفہ بنایا۔ ان کی تجویز کو سب نے تسلیم کیا اور روز جمعہ ۱۳۳۱ شعبان ۳۸۵ھ میں مقتدی بامر اللہ نے سفید لباس پہنا۔ سفید عمامہ سر پر باندھا۔ اور مقام دار الشجرہ میں سر پر خلافت پر جلوہ افروز ہوا۔ سب سے پہلے ابو جعفر ابو موسیٰ حبیبی نے بیعت کی۔ اور بیعت کرتے وقت ایک قدم شعر کا پہلا مصرع "اذا مسیدنا مضی" قائل ہو گیا۔ پڑھا۔ مگر دربار کے رعبد و داب نے کچھ ایسا خوف طاری کر دیا کہ دوسرا مصرع بھول گئے۔ مقتدی بامر اللہ سمجھ گیا کہ دوسرا مصرع یاد نہیں اُس نے خود پڑھ دیا۔ مقتدی بامر اللہ کی اس حرکت نے پہلی ہی صحبت میں تمام اہل دربار کو اس کا دلدادہ و شیعہ بنادیا اور گویا زبان حال سے علامہ ابو اسحق کے انتخاب کی داد دی۔ اس کے بعد مولانا الملک ابن نظام الملک فخر الدولہ اور ان کے بیٹے عمید الدولہ نے اعان و اثران بغداد میں سے بیعت کی۔ پھر علما اور مشائخ میں سے شیخ ابو اسحق نیرازی شیخ ابو جریج اور شیخ ابو محمد حبیبی نے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

مقتدی بامر اللہ کو امر خلافت کے لیے منتخب کرنے میں علامہ مدد ورج نے کچھ ایسا کام کیا اور انھیں اسندی سے کام لیا تھا کہ شہر بغداد میں ہر شخص ان کا مدح و ثناء

بن گیا شعرانے توصیف میں قصائد اور مختلف اشعار کے اور اپنی طبع آزمائیوں کے جوہر دکھائے۔

ابن اثیر اور دیگر مورخوں نے لکھا ہے کہ اسی مقتدی بامر اللہ کو ابو الفتح بن ابی الیث سے جو عمید عراق کے لقب مشہور تھا دل میں کچھ لال تھا اس لال نے زیادہ طول کھینچا۔ اس لیے کہ اس کے ہاتھوں مقتدی کے ملازمان دولت اور متعلقین کو برباد کرنا اور صدمہ پہنچانا تھا۔ اور وہ ان لوگوں کے آزار کے درپے ہو گیا تھا۔ مقتدی کو آخر کار یہی بن پڑا کہ سلطان ملک شاہ سلجوقی اور اسکے وزیر نظام الملک سے خط و کتابت کی جائے۔ اور کسی ہوشیار اور لائق شخص کے ذریعہ سے سلطان مذکورہ کے مستقر خاص شہر نیشاپور میں سفارت بھیجی جائے۔ اس لیے کہ ابو الفتح بن ابی الیث اسی کے متعلقین میں سے تھا سلطان ملک شاہ کی بیٹی مقتدی بامر اللہ کے عقد میں تھی اور مشہور ہے کہ یہ شادی جس دھوم دھام سے ہوئی تھی دبی دھوم دھام اہل بغداد نے اور کسی عہد میں نہیں دیکھی تھی! الغرض تجویز کیا جانے لگا کہ اس سفارت پر کون شخص امور کر کے نیشاپور روانہ کیا جائے۔ سب نے متفق لفظ ہو کر کہا علامہ ابواسحق اگر قبول کریں تو اس کام کو ان سے زیادہ اور کوئی شخص حسن و خوبی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ خلیفہ مقتدی نے بھی اس رائے کی تائید کی۔ اور علامہ روح کی خدمت میں آدمی بھیجا گیا کہ وہ محل سلطانی میں تشریف لائیں۔ اور خود خلیفہ بالکل تنہا ان سے مل کے قبول سفارت کی درخواست کرے اور اغراض سفارت بھی بخوبی سمجھا دے۔ علامہ ابواسحق کے آنے سے پہلے ہی سب لوگ ہٹا دیے گئے۔ خلوت میں خلیفہ نے ان سے ملاقات کی۔ اور کہا: میں چاہتا ہوں کہ آپ اس وقت میری مدد کریں اور عہدہ سفارت کو قبول فرمائیں۔ یا فعی نے اس موقع پر ایک ایسا واقعہ لکھا ہے کہ سن کے سب لوگوں کو حیرت ہو جائے گی۔ بلکہ یہ روایت قابل قبول بھی نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اول تو ثبوت ہی نہیں ہو چکا۔ ثانیاً یہ کہ عقل سے بھی بعید معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جیسے ہی خلیفہ مقتدی نے اپنی طرف سے سفیر مقرر کرنے کا نام لیا ابواسحق نے بخیاں احتیاط کماہنجے ایک سلطنت میں چچام لیجا نا ہے تو پہلے اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ خود آپ ہی خلیفہ وقت مقتدی بامر اللہ ہیں اس کی تصدیق ہو جانے کے بعد مراد ب سفارت

طہ ہون گے میں بالکل نہیں جانتا کہ اصل میں آپ ہی امیر المومنین ہیں یا کوئی اور۔ اس لیے کہ میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ یہ کلمہ سن کے مقتدی ہنسنا اور شیخ کی یہ احتیاط اسے بہت پسند آئی۔ فوراً مقرران خلافت میں سے چند معتبر اور مستند آدمیوں کو بلا یا جن کو علامہ ابوالفتح بھی پہچانتے تھے اور ان سے درخواست کی کہ میرے امیر المومنین ہونے کی تصدیق کر دو۔ ان سبھوں نے شہادت دی اور مقتدی کے خلیفہ ہونے کا یقین دلایا۔

بدیہۃً اس روایت کا غیر معتبر ہونا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود شیخ ہی نے مقتدی کو خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور تخت نشینی کے روز اس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اسے پہچانتے نہ ہوں۔ بہر حال شیخ ابوالفتح نے سفارت قبول کی اور شہادۃ میں دارالاسلام بغداد سے بھروسہ نیشاپور روانہ ہوئے۔ اس سفر میں بغداد کے بہت سے علماء و فضلا اور ارکان دولت بھی ان کے ہمراہ تھے۔ یہ مقدس اور محترم قافلہ نہایت شان و شکوہ کے ساتھ بغداد سے نکلا۔ اور بڑی عزت و احترام کے ساتھ مالک عجمین قطع منازل کرتا روانہ ہوا۔

علامہ ابوالفتح نے بحیثیت علم جو مقبولیت عام حاصل کر لی تھی اور تمام دنیا سے اسلام میں وہ جس وقت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اسکا حال ان کے اس سفر کے حالات سے معلوم ہو سکتا ہے۔ ہمارے معاصرون نے موجودہ زمانے کے بڑے بڑے ریاضیاء و ادیبوں اور گلیسٹون کے سے پولیٹیشنوں کے سفر اور وہ بھی انگلستان کی سنی مہذب پر جوش و تعلیم یافتہ رعایا میں دیکھے ہوں گے اب وہ دیکھیں کہ ایک گوشہ نشین زاہد اور ایک مدرسہ کے اعلیٰ مدرس نے آج سے آٹھ سو برس پہلے جب دنیا اس ترقی سے بہت پیچھے تھی جو سفر کیا تھا اس میں عام لوگوں نے کس جوش و خروش سے اس کا استقبال کیا۔

انسرخ الفی کے مصنف صاحب لکھتے ہیں کہ شیخ ابوالفتح جس شہر اور جس قصبہ کے قریب پہنچتے تھے اُس گاؤں یا شہر کے تمام لوگ کیا چھوٹے کیا بڑے اور کیا مرد و کیا عورت سب کے سب ان کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آتے تھے۔ شیخ کو اپنے چھڑ ٹھٹھ میں لے کے اور گردن جوڑ کر کے بڑے تزک و احتشام سے اپنے شہر میں داخل کرتے تھے۔ اللہ اللہ حسن عقیدت کا جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ ہر شخص بڑے بڑے قدم چومتا تھا۔ اور ان کے پتھر کے پاؤں کے پیچھے کی خاک کو لوگوں بڑے ذوق و شوق سے اٹھا لیتے

تھے اور تیناوتہ کا انا حزر جان بناتے تھے شیخ کی سواری جب شہر کے بازاروں میں گزرتی تھی تو اہل بازار اور مختلف پیشہ والوں کو جو کچھ توفیق ہوتی تھی لے کے آتے تھے۔ اور شیخ پرشار کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جب شیخ کا گور شہر سادہ کے بازاروں میں ہوا تو پہلے نان بایون کی دکان میں عین فرط شوق میں وہ ایسے اندر خود رفتہ ہو گئے کہ سہیون نے روٹیاں اچھال اچھال کے لٹا کر شروع کر دیں شیخ ابواسمعیل تھے (ایک قسم کی غنیمت) بیٹھے تھے وہ روٹیاں ان کی ڈولی پر برابر آ کے گرتی تھیں۔ آگے بڑھے تو سیوہ فرشتوں کی دکان میں تھیں انھوں نے اپنے میوے لٹا دیے۔ اُس کے آگے سب حلوائیوں کا بازار تھا۔ انھوں نے انواع و اقسام کی مٹھائیاں جو ان کے سامنے رکھی تھیں سب اچھال کے لٹا دیں شیخ ان باتوں سے برابر اہل شہر کو منع کرتے جاتے تھے۔ مگر ان کے روکنے سے ان کا جوش اور ترقی کرتا جاتا تھا۔ تمام بازاروں میں عوام کے جوش و خروش کا یہی حال رہا۔ بیان کیا کہ شیخ کا گور جو چون اور حوتے والوں کی ڈولوں پر ہوا علامہ ابواسمعیل کی صورت دیکھتے ہی وہ لوگ ایسے بے ہوش ہو گئے کہ اور کوئی چیز پاس نہ تھی۔ فرط محبت میں جو کچھ سامنے رکھا تھا اٹھا اٹھا کے لٹا دیتے۔ اور تمام جوتے اچھال اچھال کے صدقہ کر دیے چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور کامدار زیریاں شیخ کے ہلے سہیون اور خود شیخ کی ڈولی کے گرد اس قدر آ کے گرے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ تمام باتیں سب عوام کے متبادر ہوئے۔ بے اختیار نہ جوش کو ظاہر کر رہی ہیں جس سے زیادہ جوش شاید اور کسی کے استقبال میں دنیائے نہ ظاہر کیا ہو گا۔

شہر سادہ کے علما و فضلاء میں ہر عالم اس امر کا معنی تھا کہ شیخ اُسی کے مکان پر قیام فرمائیں۔ سب خدمت میں حاضر ہوئے اور ہر شخص نے عرض کیا کہ اگر آپ میرے غیبت کہہ پر قدم رنجہ فرمائیں تو میرا سرفرازاں سان پر پھونچ جائے۔ علامہ نے بجز اس خیال کے کہ جس کسی کے گھر میں قیام کیا جائے گا باقی اندہ لوگوں کے لیے جو بھال ہو گا کسی کی درخواست نہ قبول فرمائی اور ایک علیحدہ مکان لے کے قیام کیا۔

جب شیخ شہر بسطام میں پہنچے تو ان دنوں امام سہلکی مشائخ صوفیہ صافیہ کے مقتدا اور پیشوا تھے۔ اور ان کے صفائے باطن اور ریاضات سلوک کی دور دور شہرت تھی اور ان کی دنیا ان سے حسن ارادت رکھتی تھی۔ انھوں نے جو خبر سنی کہ شیخ ابواسمعیل بسطام میں آتے ہیں

تو اور اہل شہر کے ساتھ وہ بھی استقبال کی غرض سے باہر نکلے شیخ نے جو ان کے آنے کا حال
سنا تو پابریہ نہ ان کی طرف بچھنے لگا امام سہلکی شیخ کی صورت دیکھنے ہی گھوڑے سے اتر
پڑے اور بڑھ کے شیخ کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ شیخ نے اسکے معاوضہ میں جھک کے امام
سہلکی کے قدم چوم لیے جب آکے منزلی پر ٹھہرے تو امام سہلکی کو صدر مقام پر بٹھایا۔ اور
خود ادب سے دو زانو سا بنے بیٹھ گئے۔ رسم مزاج پر سہی کے بعد امام سہلکی نے کچھ گہیوں
نکالے اور بطریق ضیافت شیخ ابواسحق کے سامنے رکھ دیے اور کہا: یہ وہ گہیوں ہیں
جو شیخ طریقت حضرت بایزید بطنامی نے مجھے مرحمت فرمائے تھے یہ سن کے علاوہ
ممدوح نے بڑی مسرت ظاہر کی اور نہایت فخر و مباهات کے ساتھ ان گہیوں کو
قبول کیا۔

ہیان سے روانہ ہو کے شیخ نے دار السلطنت نیشاپور کی راہ لی جب سوادغیا پور
نظر آیا تو دیکھا کہ تمام اہل نیشاپور استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے ہیں۔ اور لوگوں
کا اس قدر ہجوم ہرگز نگاہ اندازہ نہیں کر سکتی۔ اسی ہجوم میں امام الحرمین ابوالمعالی جو بھی
بھی موجود ہیں شیخ کی سواری قریب پہنچی تو امام الحرمین نے بڑے ذوق و شوق
سے بڑھ کے پہلے تو شیخ کے محفہ کا بانس اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ پھر سواری کے آگے آگے
اہتمام کرتے اور لوگوں کو ہٹاتے اور ادب کی تعلیم و تلقین کرتے شہر نیشاپور میں داخل ہو
شیخ نے بھی ان کی وقعت و مرتبت کی بہت قدر کی اور اس مجمع عام میں امام الحرمین کی نسبت
یہ کلمات ارشاد فرمائے: "یا مفید اهل المشرق والمغرب انت الیوم امامکم الائمة"
یعنی اے وہ شخص جس سے اہل مشرق و مغرب کو فائدہ پہنچ رہا ہے تو آج تمام مامون
کا امام ہے۔

الغرض بیان شیخ سلطان ملک شاہ کے محل میں تشریف لے گئے۔ اس نے بھی
شیخ کی تعظیم و تکریم میں کوئی بات فرو گذاشت نہیں کی تھی۔ نہایت اہتمام سے ان کا استقبال
کیا اور نہایت ادب سے ملا۔ اور سفارت کے متعلق جو جو باتیں اور جو جو شرطیں شیخ
نے پیش کیں سب کو اس نے بلا عذر قبول کر لیا۔ ملک شاہ کے وزیر خواجہ نظام الملک
جو خود بادشاہ سے زیادہ صاحب اثر تھے اور جن کو سلطان ملک شاہ "باب" کے
لفظ سے پکارا کرتا تھا وہ تو شیخ کے پہلے ہی سے معتقد تھے۔ انھوں نے اور زیادہ

قدر و منزلت کی۔ یہاں شیخ نے چند روز قیام کیا۔ اور اگر خواجہ نظام الملک دزیری
 صحبت میں شریک ہوا کیے۔ جان امام الحرمین ابو المعالی بھی موجود ہوتے تھے۔ اور شیخ
 اور ابو المعالی میں اکثر مسائل علمیہ بحثیں بھی ہوئیں۔ مگر ہر بحث میں ہمیشہ شیخ ہی غالب
 آئے اور امام ابو المعالی کو سکوت کرنا پڑا۔ مورخین کہتے ہیں کہ اس سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہیے
 کہ امام الحرمین علما شیخ سے اونے درجہ پر تھے۔ اس لیے کہ شیخ ابو اسحق کو علم مناظرہ میں کمال
 حاصل تھا۔ اور ان کی تقریر عموماً نہایت مدلل اور جامع و مانع ہوتی تھی۔ بخلاف امام الحرمین
 کے کہ اس امر خاص میں ان کو زیادہ کمال نہ تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ علامہ ابو اسحق کے مقابل
 میں ان کو ہمیشہ ساکت ہونا پڑا بلکہ خود امام الحرمین نے نیک نبی کے ساتھ اس امر کو علامہ
 مدوح کو سامنے ظاہر کر دیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے شیخ کی بزرگی کو اور حیثیت سے مانا تھا۔ ایک صحبت میں
 وہ کہنے لگے۔ میں تم کھاکے کہتا ہوں کہ ان تمام مباحث اور تقریروں میں باعتبار وسعت نظر
 اور زیادتی علم کے آپ مجھ پر غالب نہیں آئے۔ آپ کا غلبہ صرف آپ کی پرہیزگاری کی قوت
 اور صلاح باطن کی وجہ سے ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ اس عہد کے علما میں کس قدر صفات باطنی اور
 انصاف پسندی تھی۔ باوجودیکہ امام الحرمین نے ایک ایسا جملہ کہا تھا کہ اگر ہمارے موجودہ
 مقتداؤں کی نسبت کہا جاتا تو ان کی آتش غضب فوراً جھک اٹھتی مگر علامہ ابو اسحق کے دل
 میں ان کی وقت ویسی ہی رہی جیسی پہلی تھی۔ بلکہ کسی قدر زیادہ ہو گئی۔ کیونکہ جب
 چند روز کے بعد علامہ مدوح نیشاپور روانہ ہونے لگے تو اکثر اہل نیشاپور رخصت
 کرنے آئے تھے اور ایک اثر و حام عام تھا جن میں امام الحرمین ابو المعالی بھی تھے۔ اس وقت
 علامہ ابو اسحق نے سب لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر امام ابو المعالی کی طرف اشارہ
 کر کے کہا: "تمتعوا بهذا الامام فإنه نزهة هذا الزمان" یعنی اپنے ان امام سے
 تم لوگ فائدہ اٹھاؤ۔ اس لیے کہ یہ اس عہد میں عیسویں سے پاک اور کمالات سراسر تھیں
 خواجہ نظام الملک اگرچہ ایک بڑی سلطنت کا وزیر بلکہ مالک تھا مگر اسے مزاج میں
 خون خدا اس قدر تھا کہ خاص خاص قسم کے علما میں بھی کم نظر آئے گا۔ ایک بار اس کو دل
 میں خیال آیا کہ اپنی عدالت اور انصاف پسندی اور اہل ملک کو خوش رکھنے اور اپنے
 عہد میں ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے ثبوت میں اگر میں ایک کاغذ پر اکثر لکھ دیا
 اور تمام دوسرا دوسرا سے اور خصوصاً علما و فضلا سے دستخط کراؤں کہ میں نے کوئی

ظلم و زیادتی نہیں کی تو قیامت کے روز خدا کے سامنے وہ کاغذ میرے لیے ایک عمدہ حجت ہو گا۔ اس تجویز کے بموجب اُس نے لوگوں سے دستخط کرنا شروع کیا۔ لوگوں نے بڑی بڑی عبارت آرائیان کین اور اسکی تعریف و توصیف میں زیادہ الفاظ صرف کیے۔ وہ کاغذ جب علامہ ابوالوہابؒ کے سامنے آیا تو اُنھوں نے باوجود اُس حسن عقیدت کے جو نظام الملک کو علامہ مددوح کے ساتھ تھا صرف یہ جملہ لکھ کے دستخط کر دیا۔

”خَيْرُ الظَّالِمَةِ حَقٌّ“، یعنی حسن اور سب ظالموں میں اچھا ہے حسن خواجہ نظام الملک کا نام جو۔ خواجہ نظام الملک کو یہ جملہ لکھ کے نہایت رقت ہوئی اور بہت گریہ و زاری کر کے کہنے لگا ”اس بارے میں ابوالوہابؒ سے بڑھ کے کسی نے راست بازی سے نہیں کام لیا“ کہتے ہیں نظام الملک کے مرنے کے بعد کسی نے اُسے خواب میں دیکھا اور پوچھا ”بزرگ عالم نے تمھارے ساتھ کیا سلوک کیا“ اُس نے جواب دیا۔ صرف اُس ایک کلمہ کی وجہ سے جو ابوالوہابؒ نے میرے بارے میں لکھا تھا۔ خداوند تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔

اور درحقیقت شیخ ابوالوہابؒ میں انصاف بندی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ خود اپنی وقعت کے خیال سے بھی کنارہ کر لیا تھا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ایک بار لوگوں نے ایک استفتاء اُن کی خدمت میں پیش کیا۔ اُنھوں نے اُس وقت جو خیال میں آیا لکھ دیا اتفاقاً وہ استفتاء مع جواب کے امام ابو نصر بن صباغ کی نظر سے گزرا۔ اُن کو علامہ مددوح کی ہمسری کا دعویٰ تھا اور واقعی تھے بھی وہ اسی پائے کے بزرگ۔ ابن صباغ نے دیکھتے ہی صاحب فتویٰ سے کہا کہ اس کاغذ کو ابوالوہابؒ کے پاس پھر لے جاؤ اور کہو کہ اس پر نظر ثانی کیجیے۔ علامہ ابوالوہابؒ نے دیکھا تو حقیقت میں وہ فتویٰ غلط تھا۔ اپنے فتوے کو درست کیا۔ اور اُس کے نیچے یہ جملہ لکھ دیا ”الحق ما قاله الشيخ ابو صباغ و ابوالوہابؒ معنی یعنی جو ابن صباغ نے لکھا وہ صحیح ہے اور ابوالوہابؒ غلطی پر ہے۔“

باوجود ان سب باتوں کے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی زندگی زیادہ تر احتیاج اور افلاس میں گزری اور اگر یہ غلط ہو تب بھی اتنا ضرور ہے کہ اُن کو کبھی اطمینان اور دنیاوی مرفع الحالی نہیں نصیب ہوئی۔ ابن جوزی نے اپنی تاریخ منتظم میں تعجب اور حیرت کے ساتھ لکھا ہے کہ شیخ ابوالوہابؒ کو باوجود اس مقبولیت عامہ اور اس قدر وسعت کے شرف حج سے بہرہ یاب ہونے کی عزت نہ حاصل ہوئی۔ کبھی

اتنا روپیہ نہ فراہم ہوا کہ حج کا قصد کر سکتے۔ محمد بن سعد کہتے ہیں کہ قاضی محمد بن محمد فرماتے تھے "امامان مآل تنفق لہما الحج الشیخ ابی اسحق الشیرازی وقاضی ابو عبد اللہ المغانی۔ اما ابو اسحق کان فقیرا و لو ان اراد لا یجوز علی الاعتناء و اما الدامغانی فذی اراد الحج علی السند من الاستسرق لا ممکنہ" یعنی دو اماموں کو حج کی نوبت نہ آئی شیخ ابو اسحق شیرازی وقاضی ابو عبد اللہ المغانی ان میں سے ابو اسحق محتاج تھے۔ اور اگر چاہتے تو لوگوں کے کندھوں ہی کندھوں کہ مغلوبہ جاتے۔ لیکن قاضی ابو عبد اللہ کو خدا اتنی دولت و ثروت دی تھی کہ اگر وہ قصد کرنے تو ممکن تھا کہ ان کے مکان سے ارض حجاز تک سندس اور استسرق (حریر و مخمل) کا فرش بچھ جاتا۔

علامہ مددوح کبھی کبھی نظم بھی فرماتے تھے۔ مگر ان نئی شاعری اسی شان کو لیے ہوئے تھی جو ایک مقتدا اور عالم کے شایان ہے۔ دنیا میں دوستوں کے نہ ملنے کا خیال ان دو شعروں میں نہایت خوش اسلوبی سے ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مسئلت الناس عن خلّ و فی فقاکو اما الی هذا سبیل
تمسک ان ظفرت بذیلی سرّا فان الحرفی الدنیا قلیل

یعنی میں نے لوگوں سے وفادار دوست کے بارے میں سوال کیا تو کہنے لگے دنیا میں نہیں مل سکتا۔ اگر کوئی جو انمول جائے تو اُس کا دامن نہ چھوڑنا اس لیے کہ جو انمول دنیا میں تھوڑے ہی ہیں۔

مگر دنیا ایسی بیوفان چیز ہے کہ کسی کی قدر نہیں کرتی۔ آخر اُس نے علامہ ابو اسحق کے سے گرانمایہ مقتدا سے عصر کو بھی نصرت ہی کر دیا۔ افسوس اسے دینا سمجھے ان کے ساتھ بیوفائی نہ کرنا چاہیے تھا۔ اگر تیر کام اُن سے نکل گیا تھا تو تو نے ہم سے معتقدین اور مشاققوں کے لیے ہی اُن کو لگا کر رکھا ہوتا۔ الغرض دنیا نے جیسا بیوفائی کا کھیل ہر شخص کے ساتھ کھیلا ہے ویسا ہی اُن بزرگ کے ساتھ بھی کھیلا۔ ۲۱۔ جمادی الاول ۷۳۵ھ میں چار شبہ کی رات کو علامہ ابو اسحق نے سفر آخرت کیا۔ ابو المظفّر بن رئیس الرّیّ کے مکان میں غالباً شیخ سکونت پذیر تھے جو شریقی بغداد میں تھا۔ کیونکہ اُسی مکان میں انتقال ہوا اور ابو الوفاء بن عقیل نے جو اس عہد کے مشہور علما میں تھے شیخ کی تجہیز و تکفین کی۔ اور خود ہی نہلا یا۔ اُن کے جنازے کی نماز میں خود خلیفہ وقت

مقتدی ہمارے بھی شریک تھا۔ ان کے جنازے پر دو بار نماز پڑھی گئی۔ پہلے باب الفرووس میں۔ پھر دوبارہ تاج قصر میں۔ دوبارہ نماز ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ جب پہلے نماز پڑھی گئی ہے اس وقت بغداد کے مامور اور سربراہ آوردہ لوگوں میں سے اکثر لوگ نہیں موجود تھے جب سب لوگ فراہم ہو گئے اور بہت بڑا مجمع ہو گیا تو دوبارہ پڑھی گئی۔ اور سب شریک ہوئے۔ نماز کے بعد لوگ جنازے کو کندھوں پر اٹھا کے لے چلے اور باب آبرض میں زمین پر رکھا۔ اور وہیں مدفون ہوئے۔ انا للہ وانا الیکہ راجعون۔

دو تین بیان کرتے ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد نظامیہ کے طالب علموں کو اتنا بڑا ملال ہوا کہ تین دن تک برابر حلقہ قائم باندھ کے بیٹھے اور رقت وزاری میں مشغول رہے۔ تمام امرا اور ارکان بغداد اور نیز کل شرفا برسم عزت آئے اور طالب علموں کو تسلی و تسفی دیتے رہے جب اس سوگاری اور ماتم سے فراغت ہوئی تو وزیر نظام الملک کریمیہ نوید الملک نے جو بغداد میں موجود تھا۔ ابوسعبد اللہ حمن بن مامون کو ان کی جگہ نظامیہ کا مدرس اعلیٰ مقرر کیا۔ جب یہ خبر خود نظام الملک کو پہنچی تو اُس نے نہایت رنج و الم ظاہر کر کے کہا "مؤید الملک نے بالکل خلافت کیا۔ علامہ ابوسعبد اللہ حمن بن مامون کی جو خدمتیں کی تھیں اور جس اتقا و زہاد و علم و فضل کے وہ عالم تھے اُس کے خیال سے چاہیے تھا کہ کامل ایک برس تک نظامیہ پر جسرت برسا کرے۔ اُس کے دروازے بند پڑے رہیں۔ اُسکے حجرے خالی ہوں۔ اور کوئی شخص اُن مرحوم کی جگہ نہ مقرر کیا جائے۔ اگر اب درس و تدریس کا سلسلہ قائم ہی کر دیا گیا ہے۔ اور ابوسعبد کو بے ادبی سے اُن کے مقام پر مامور کر دیا ہے تو اُس کے پاداش میں ابوسعبد کو معزول کر دو اور امام ابو نصر بن صبیح کو نظامیہ کا پروفیسر مقرر کر دو۔ جنھوں نے دروزاقتناح کو بھی درس دیا تھا۔ اس لیے کہ نیز بہ حیثیت علم و فضل اور نیز باعتبار زہاد و ورع وہ علامہ ابوسعبد کے حریف مقابل تھے۔ علامہ ممدوح کی سب سے اول درجے کی کتاب "تنبیہ ہے جو ان کی زندگی ہی میں رواج پا چکی تھی۔ دوسری کتاب کا نام "مہذب" ہے جس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ اور یہ دونوں کتابیں علم فقہ میں ہیں۔ تیسری کتاب اصول فقہ میں "لمع" لکھی جس کی خود ہی شرح بھی کی۔ ان کے علاوہ کتاب التلخیص کتاب الکلت کتاب البصرہ کتاب المغونہ کتاب طبقات الفقہاء بھی علامہ ممدوح کی مشہور کتابیں ہیں جن میں سے اکثر اباباب ہیں۔

نوری اطلاع

دو دگلہ زہر جلد ۲۸
اصول کو لکھ کر
یہاں اس باب میں
نیکوئی کے بیان
سے زیادہ ذکر کیا
اتنا دہا دہا
میں بغداد حضرت
ابو یونس کو در
انت رکھ کر انھوں
نہاں کی خدمت
نہاں کی دگلہ زہر
علاوہ چند علم
میں اور دیگر جگہ
کتاب "مسلمان
نہاں طلبہ زہر
نور دگلہ زہر



انسان کو جس امر کے پیکھنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ کونکر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ انسان کو زندگی سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہیں۔ اور پھر طفت یہ کہ اس سے زیادہ بے پروائی بھی کسی امر میں نہیں کی جاتی۔

یہ کوئی آسان معاملہ نہیں بقراط اپنی ایک ڈاکٹری کتاب **افوریزیم** کے شروع میں لکھتا ہے: "زندگی خود ہی ہے۔ علم وسیع ہی موقع ہاتھ سے نکلا چلا جاتا ہے۔ تجربہ غریب متیقن ہے۔ اور اس حالت میں کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے۔"

سرت و کامیابی کا دار و مدار ہماری حالتوں پر نہیں بلکہ خود ہماری ذات پر ہے۔ غیروں کے ہاتھ سے مہرباد ہونے کی جگہ بہت سے لوگ خود اپنے ہی ہاتھ سے مہرباد ہوئے ہیں۔ جتنے مکانات اور شہروں کو طوفانوں یا زلزلوں نے ویران کیا ہوگا۔ اُن سے زیادہ خود انسان کے ہاتھ سے مہرباد ہوئے ہیں۔ مہربادی دو طرح کی ہوتی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں اور خود انسان کے ہاتھوں۔

جو مہربادی انسان کے ہاتھوں ہوتی ہے وہ تمام مہربادیوں سے زیادہ افسوس ناک ہے۔ اور بقول **سینیکا حکیم** کے انسان کا سب سے بڑا دشمن وہ ہے جو خود

سے بقرطیونان کا نائی گرامی طبیب اور حکیم تھا۔ جو اعلیٰ طب کا موجد بنا جاتا ہے۔ حضرت مسیح سے ۴۰ برس قبل پیدا ہوا۔ اور ۶۱ سال قبل مسیح وفات پائی۔
۱۔ ملے سینکاروم کے مشہور اور مستند فلسفیوں میں ہے۔ حضرت مسیح کا معاصر تھا۔ اُن کی ولادت تقریباً تین سال پیشتر پیدا ہوا۔ اور اُن کے ۴۵ سال بعد وفات پائی۔

اس کے سینے میں بیٹھا ہوا ہر لائبریری سیرکتا ہے۔ بہت سے لوگ اپنا زیادہ وقت دوسروں کو آزار پہونچانے میں صرف کرتے ہیں۔ لکھی کا قول ہے کہ اکثر اوقات جوانی کے یہ شہوت خون سے وہ افعال سرزد ہوتے ہیں جن کا خمیازہ بڑا چاہے گی بوسیدہ ہڈیاں بھگتتی ہیں۔ اس لیے کہ بقول لوشیان کے ”جو گزر گیا اور ہو گیا اُسے نہ قلو تو بیا سکتا ہے نہ اتر و لوس بگاڑ سکتا ہے۔ انسان اپنے سے محبت کرتے ہیں۔ مگر عقلمندی سے نہیں بلکہ بہت اچھی طرح سے۔ مجھے بعض اوقات الزام دیا گیا ہے کہ میں اس بات کا قائل ہوں کہ دنیا میں مسرت بمقابلہ الم کے زیادہ ہے۔ مگر میں نے زندگی کی دشواریوں اور اُس کے الموں سے نہ کبھی انکار کیا۔ اور نہ کبھی اُن کی طرف سے غفلت کی۔ میں نے کبھی نہیں کہا کہ آدمی خوش ہیں۔ ہاں صرف اتنا کہا کہ وہ خوش ہو سکتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر اُن میں مسرت نہیں حاصل ہے تو عملاً یہ خود اُن میں کی کوتاہی ہے۔ یا یہ مطلب سمجھا جائے کہ جتنی مسرت سے ہم لطف اٹھا سکتے ہیں اُس سے زیادہ مسرت تو ہم ضائع کر دیتے ہیں۔ اور اسی سے سارے تمدنات پیدا ہیں۔ ورنہ ہر کے ایک شعر کا ترجمہ کر کے جتنے اند و ہنساں لفظ زبان یا قلم سے نکلتے ہیں اُن سب میں زیادہ اند و ہنساں الفاظ یہ ہیں کہ ”یہ ہو سکتا ہے۔“

۱۔ جیویر فرانس کا ایک مقبول و مستند مصنف ہے جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۹۱۹ء میں راہی عدم ہوا۔ ۲۔ لکھی جس کا پورا نام جان لکھی ہے انگلستان کا ایک لائق مصنف تھا جس کے ڈراما کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۳۔ لکھی ال۔ جتھ کے عہد کا زیور ایک یہ شخص بھی تھا جو ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۱۹ء کے قریب فوت ہوا۔

۴۔ لوشیان ایک یونانی مشہور فیلسوف تھا۔ جس کا سنہ ولادت و وفات نہیں معلوم لیکن یہ مشہور ہے کہ اُس نے بہت عمر پائی اور دوسو برس کا ہو کے مرا۔

۵۔ اہل یونان نے قدیم زمانے میں ہر کام کے لیے اک دیوتا مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ ان میں سے ایک قلو اور ایک اتر و لوس بھی تھے۔ پہلے کے معنی زندگی کا تار جوڑنے والے کے اور دوسرے کے معنی زندگی کا تار توڑنے والے کے ہیں جو کام کہ ان دیوتاؤں کی طرف منسوب تھے۔

۶۔ ڈیٹر بھی یورپ کا ایک نامی شاعر ہے۔ ۷۔ مطلب یہ کہ

بہت سے معاملات میں جس چیز کو ہم بُرا کہتے ہیں وہ اصل میں خوبی ہی ہے جو بُری طرح استعمال کی گئی یا اسکے برتنے میں ہم حد سے بڑھ گئے۔ کسی پیسے یا کسی کیل کو بھی اسکی ٹھیک جگہ اور موقع سے شاد و نوساری کل بگڑ جائے گی۔ اسی طرح اگر ہم اپنے آپ کو نظام عالم کی ترتیب سے علیحدہ کر دیں گے تو ہمیں بھی ایسی ہی خرابی کی امید رکھنی چاہیے۔ حد سے زیادہ شجاعت دلوانی محنت کمزوری۔ اور کفایت شجاری حرص و طمع بن جاتی ہے۔ یہ ضرب المثل ہے کہ جو چیز ایک آدمی کے لیے غذا ہو دوسرے کے حق میں زہر ہو جاتی ہے۔ اس بات کا دعویٰ کرنے کی کوئی جرات نہیں کر سکتا کہ نظام قدرت میں تغیر و تبدل ہونے سے کوئی فائدہ حاصل ہو گا۔ ایک شخص گر پڑے۔ باہر اور اسکا پاؤں ٹوٹ جا۔ اگر اُس سے کشش زمین کے مسئلہ میں جو تغیر ہو تا ہے اُسے کوئی کسی قسم کی ترقی نہیں کہہ سکتا۔

اہل فارس مسرت کو ہر مزد یعنی خدا کی روح کی طرف منسوب کرتے تھے اور رنج و تکلیف کو **اہل مرگ** کی طرف جسے وہ بدی کا شیطان خیال کرتے تھے۔ مگر حقیقت میں دیکھو تو زندگی کی مصیبتوں اور تکلیفوں کو اپنے اوپر اپنی لغزشوں اور غلطیوں سے ہم خود ہی لاتے ہیں۔ دو دنوں طرح کی لغزشوں سے۔ پہلی اُن افعال کا ارتکاب جن کو ہم ہر وقت بُرا جانتے ہیں۔ اور دوسری جن میں غالباً لوگ زیادہ مبتلا ہیں یہ کہ بُرے افعال کو نادانی سے برائے سمجھا۔ جہاں تک پہلی قسم کی غلطیوں سے تعلق ہے اُن سے بچنے کے لیے ہم نے اپنے سینوں میں ایک ایسا رہبر قائم کر لیا ہے جو کبھی خطا ہی نہیں کرتا۔ اگر اس پر بھی خطا کریں تو گو یا ہم آنکھیں کھلی رہنے پر بھی ضلالت کے گڑھے میں گرے ہیں۔ کیونکہ اگر ہم نے جان بوجھ کے آنکھوں کو نہیں بند کیا ہے

(یہ جاتیہ مضمون) کسی چیز کی امید کرنے ہی سے سارے صدمات پیدا ہوتے ہیں جب ہمارے دل میں ہوتی ہے کہ یہ ہو سکتی ہے تو سمجھتے ہیں کہ ہو بھی جائے گی۔ پھر اسکے بعد جب وہ نہیں ہوتی تو دل کو صدمہ ہوتا ہے اور ہمارے اندر گم کسی چیز کی امید ہی نہ کیا کریں اور یہ خیال ہی نہ کریں کہ ہوگی تو ہمیں کبھی کسی بات کا بھی صدمہ نہ ہو۔ منزعہ سے باری لوگ جنہیں آتش پرست کا لقب دیا گیا ہے انکی اور نور کا خالق یزدان کو اور بُرائی و گناہ اور ظلمت کا خالق آہرن کو سمجھتے تھے۔ یہ مذہب اگرچہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم الایام سے چلا آتا ہے مگر زرتشت نے بالکل نئی اور دلچسپ ترتیب سے اُسے باخاطب بنایا۔ اور اسی وجہ سے وہ اس مذہب کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔

اور وہ یونین بند ہیں تو سمجھنا چاہیے کہ ہم بے عقلی سے کام کرتے ہیں۔ لیکن اسے گناہ نہیں کہا جاسکتا۔

ہم دوسری قسم کی غلطیاں اُن سے بچنے کے لیے ہمیں عقل اور دلیل سے مدد لینی چاہیے۔ ان باپ۔ بزرگوں۔ اور دوستوں کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے۔ اپنی تعلیم اور خود اپنی ذات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ تعلیم دراصل ہماری ہی ذات کا ایک حصہ ہے۔ ہم سب کے پاس ایک شاگرد ہے۔ اور وہ چاہیے جس درجہ اور جس لیاقت کا ہو۔ مگر ہمیں ضرور ہے کہ اسے سکھائیں اور تعلیم دیں۔

مقابل اُن چیزوں کے جو ہم نے اردو دن سے سیکھی ہیں وہ باتیں ہماری زندگی سے زیادہ وابستہ ہو جاتی ہیں جنہیں ہم نے خود اپنی ذات سے سیکھا ہے۔ جب ہم اسکول کو چھوڑتے ہیں اس وقت تعلیم ختم نہیں ہو جاتی۔ ختم ہونا کیسا یہ بھی شکل سے کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت سے تعلیم شروع ہو گئی۔ پھر اس کے بعد بڑی بڑی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ **سینیکا حکیم** نے کہا ہے جس طرح لوگ ورزش کر کے بدن کو بنایا کرتے ہیں اگر اسی طرح ریاضت کر کے دماغ کو ٹھیک کیا کرتے۔ اور جتنی دشواریاں مسرت حاصل کرنے کے لیے برداشت کرتے ہیں اتنی ہی تکلیفیں نیکی کے شوق میں برداشت کرتے تو کیا خوب ہوتا۔

بعض تو یہ نظریہ کی قائل ہیں۔ اُن کی نظر میں ہر چیز پہلے ہی سے مقرر ہو چکی ہے۔ اور جو ہو نا ضرور ہو گا۔ عام اس سے کہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں۔ انسان اُن کے خیال میں کسی دوسرے محرک کے حرکت دینے سے کام کرنا ہے یا یوں کہیں کہ اُس اعلیٰ قوت خلاق کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے پہلے اس پر غور کرنا چاہیے کہ دنیا میں زندگی اور جائزہ ہونا کوئی چیز ہے۔ یا نہیں۔ ہم اپنے جواز کو زمانے کے سمندر کے پار لے جاسکتے ہیں۔ یا اس بات کے پابند ہیں کہ جدھر ہوا جالے جاسے۔ یہ جائیں؟

جواب صاف ہے۔ **جو جین پول** شیر نے دیا ہے کہ انسان انسان ہے اور اپنی قسمت کا مالک ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو سمجھنا چاہیے کہ گناہ اور نفرت ہر وقت اس کے دروازے پر کھڑی ہے۔ جو کچھ کہ تم ہونا چاہتے ہو وہی ہو۔ کیونکہ ہماری مرضی اُس ذات

جو جین پول شیر ایک جرمن فلسفی اور مصنف ہے۔ جو ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۷۲ء میں وفات پائی۔

واجب الوجود سے مل کے اس قدر قوی ہو گئی ہے کہ تنانت کے ساتھ اور سچے ارادے سے ہم جو ہو نا چاہیں وہی ہو جائیں گے ۴

اس صورت سے اگر یہ قدرت ہم اپنے انجام پر رکھتے ہوں تو ہمیں اپنے دل سے یہ نہایت ہی اہم سوال کرنا چاہیے کہ ہم کیا ہونا چاہتے ہیں اور کیونکر ہم اپنی زندگی کو بہت زیادہ سرسبز بنا سکتے ہیں۔ بعض اشخاص زندگی میں کوئی غرض رکھتے ہیں اور بعض کی کچھ غرض نہیں ہے۔ ہماری پہلی غرض یہ ہونی چاہیے کہ اپنے آپ کو عمدہ اور جس کام کے قابل ہو سکتے ہوں اُس کے قابل بنائیں ہم لوگ لٹ کتا ہر شخص کا مقصود یہ ہے کہ اپنے قوی کو نہایت ہی اعلیٰ اور مناسب ترتیب سے ترقی دے کے مکمل اور مستقل بنائے۔ جین پول شتیر کا مقولہ ہے کہ انسان کو حتی الوسع اپنے تین بہتر بنا لیا جائے۔ ہم کو اپنے بہتر بنانے میں کسی قسم کی خود غرضی کا قصد نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ ہمیں بیشتر ہی سے یہ خیال کر لینا چاہیے کہ ہماری قسمت میں ناکامی ہی لکھی ہوئی ہے۔ پس کتنے کتا ہر انسان کی اس زیست کی یہ عمدہ غرض نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے ہی واسطے دولت جمع کرے بہتر اور زیادہ الوالہرم لوگ جیسے افلاطون۔ ارسطو۔ مبدھا۔ اور لولوس مقدس۔ اس بات پر بھی قانع نہیں ہوئے کہ اپنی ذات کو صرف اپنے ہی واسطے تکمیل کو پہنچائیں۔

اب میں اس بات کو مان لوں گا کہ ہمیں اپنی ذات کو اور دن کے لیے درست اور بہتر بنانا چاہیے۔ اور مجھے اب بتلانے دو کہ یہ ایک کیسا دلچسپ کام ہمیں دیا گیا ہے۔ ایک یونانی مسلک البتوت مقولہ بتانا ہے کہ خود اپنے آپ کو بچانا کس قدر دشوار ہے۔ فرانسیسی مصنف مونتا نے یہ کہنا ہے کہ میں نے خود اپنے نفس سے بڑھ کے نہ ساری دنیا میں

۱۷۵۱ء میں ایک نہایت ہی باوقفت اور مستند جرمنی فلسفی اور حکیم تھا جس کی سیاحت بھی مشہور ہے۔ وہ ۱۷۶۸ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۵۸ء میں اُس نے وفات پائی۔

۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۵۸ء میں اُس نے وفات پائی۔

۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۵۸ء میں اُس نے وفات پائی۔

۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۵۸ء میں اُس نے وفات پائی۔

۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۵۸ء میں اُس نے وفات پائی۔

کوئی طلسم کھیا اور نہ اس سے بڑا کوئی سحر پایا۔ سترنی برون جس کی زندگی بہت ہی کم پڑے ماجر ایسا بر جوش تھی ہم کو یقین دلا۔ اسے کہ "اپنی زندگی اُسے ایک تیس برس کا سحرہ نظر آئی جس کو اگر وہ بیان کرتا تو مارتے نہ سمجھی جاتی۔ بلکہ اس پر ایک شاعرانہ خیال یا افسانے کا اطلاق ہوتا۔"

نصیحت کرنا راجہ جام (حضرت سلیمان کے بیٹے) کے زمانے سے لارڈ جسٹر فیلڈ کے زمانے تک ایک محض بیگمار سمجھا گیا۔ اور مجھ کو نیوز ملینڈ کے اُس نے ایمان لانے والے کا حال بھی بھولا نہیں ہے جس کی بابت وہ ان کے سردار نے ایک پادری سے بیان کیا کہ اُس نے بہن اس قدر زیادہ نصیحت کی کہ ہم نے عاجز آ کر اُسے قتل کر ڈالا۔ تاہم للی کا قول ہے کہ جو شخص نصیحت کو ابتداء میں سستے دامنوں میں قبول کرے گا وہ آخر میں پختا کے اور اپنے اوپر ملامت کر کے قبول کرے گا۔ لہذا میری غرض یہ ہے کہ میں اُن لوگوں کے واسطے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کو حتیٰ الوسع عمدہ بنانا چاہتے ہیں چند باتیں بیان کر دوں۔ یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگ موقعوں کو ہاتھ سے نکل جانے دیتے ہیں۔ جو برکتیں بے پروائی اور بیہودگی سے ضائع کر دی گئیں اُن سے کتنے آدمی مسرت حاصل کر سکتے ہیں؟

خیال رکھو کہ تمہاری سترنی محض خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہیں۔ ہم بہت سو کام کرتے ہیں اور اس لیے کہ اُنھیں مسرت سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے ہیں کہ اگر اُنھیں کسی اور نام سے یاد کیا جاتا تو ہم نفرت کرنے لگتے۔ بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں کہ اُنھیں مسرت حاصل ہے۔ اور محض اس بنا پر کہ وہ کوئی مفید کام نہیں کرتے بعض اور لوگ ہیں جن کو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک مسرت کو صرف اس ظاہری ہی سے تعلق ہے۔ حالانکہ بخلاف اس کے دلی سرترین نہایت ہی تشفی بخش بھی ہیں۔ اور زیادہ پائدار بھی ہیں۔

سلہ برون جس کا اصلی نام اس برون تھا انگلستان کا ایک زبردست اور شہرہ فاشی تھا مسئلہ ۶
میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۲۰ء میں مرا۔
۱۸۲۹ء میں مرا۔ اور ۱۸۳۰ء میں مرا۔

ہم اپنے صرف ایک جسم کو جس کی صحت پر دل کی صحت منحصر ہے غفلت و
بے پروائی سے ضرر ہو نچا لیتے ہیں۔ اور ہنرمندی کے ذریعہ سے جتنی مسرتیں
حاصل ہو سکتی ہیں ان کی نصف بھی ہمیں نہیں نصیب ہوتیں۔ میں یہ خیال کر کے تعجب
ہو جاؤں کہ جن لوگوں نے **نیشنل گیلری** سے فائدہ اٹھایا وہ لندن کی پوری

آبادی کے مقابلے میں کتنے ہیں؟ ہم اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں بناتے کہ علم طبعی
کی ایجادوں کی قدر کر سکیں۔ برلن میں **موزیم** کی کتنے لوگ سیر کر چکے ہیں؟ اور ان
میں کتنے ہیں جنہوں نے اپنے نفس کو ایسا درست کر لیا ہو کہ اس کی قدر کر سکیں؟
جس زمین پر ہم رہتے ہیں جو آسمان ہمارے سر دھرتی ہے ان کی خوبیاں اور
ان کی خوبصورتیوں سے ہم لطف نہیں اٹھاتے۔ موسیقی شاید ہمارے بڑا وسعہ
میں زیادہ داخل ہے مگر وہ بھی اس قدر نہیں جتنی کہ ہو سکتی ہے۔ ہم غر کر رہے
ہیں کہ حیوانات میں ادراک اور سمجھ نہیں ہے۔ اور انسان عقل و تیز دیکھنا ہے۔ مگر غور
کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اس عقل نے جس پر ہمیں فخر ہے انسانی مسرت میں کس قدر کم
اضافہ کیا ہے۔ شینک خیال دہلے فلسفیوں کے سوال کے مطابق ابھی تک اس
میں شبہ کیا جاسکتا ہے کہ آیا نفس پر قابو حاصل کرنا جس حیث المجموع مصیبت و
تکلیف کا باعث ہے یا مسرت و عیش کا؟ حیوانات اپنے آپ کو تکلیف نہیں دیتے
مگر ہم اپنے نفس کو تکلیف دیتے ہیں۔ انسان بیکار امور میں فکر کرتا ہے اور بے ضرورت

لے نیشنل گیلری لندن کی ایک عمارت کا نام ہے جس میں دہان کی حرفت و صنعت کے مکمل نمونے
دکھائے گئے ہیں۔ اور جس میں جا کے انسان کو معلوم ہو سکتا ہے کہ انگلش قوم نے صنعت اور
دستکاری میں کس قدر ترقی کی ہے۔

یہ لندن کا سب سے بڑا عجائب خانہ ہے جس میں دنیا کے عجائبات کا سب سے بڑا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے
اسکے متعلق جو کتب خانہ ہے وہ بھی عجیب چیز ہے فرانس کے کتب خانے کے بعد ساری دنیا کے کتب خانوں
سے بڑا ہے۔ اور اس میں ہر علم ہر فن اور ہر زبان کی پرانی اور نئی کتابیں جمع ہیں۔

یونانی فلسفیوں میں سے ایک خاص خیال کے حکمایہنک کہلاتے تھے ان کا خیال تھا کہ انسان
باطح عشرت پرستی اور شہوت پرستی کی طرف مائل ہے۔ اور اسی خیال کی وجہ سے وہ لوگ دنیا کی تمام
رسوئیوں اور بہانوں کی ہر چیز کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور قابل نفرت جانتے تھے۔

بکناڑ ٹکون۔ خطلون۔ نکر دن۔ اور تردد دن سے ہم خود ہی اپنا نشانہ کیے ڈالتے ہیں
نا معلوم رموز ہیں ہر طرف سے گھبرے ہوئے ہیں۔ مگر ہمیں ان کی وجہ سے بے صبر
نہ ہونا چاہیے۔

لیکن باوجودیکہ ہمیں تردد نہ ہونا چاہیے پھر بھی ضرور ہے کہ اپنی حفاظت
کے لیے ہم فکر کریں جن لغزشوں میں مبتلا ہونی کا ہمیں ادنیٰ دم ہواں سوچنے کے لیے جتنی عقل تیز کی ضرورت
ہو اس سے زیادہ عقل و تیز بھلائیوں اور نیکیوں کا امتیاز کر نیکے لیے درکار چڑ بڑائی کی صورت باوجود
اس کی تمام خرابیوں کو ایسی بدل دی گئی ہے کہ پہلی نظر سے دیکھتے ہی ہم فریفتہ
ہو جاتے ہیں۔ اور پہلی نظر سے دیکھتے وقت اگر اُس کے منہ پر کسی خوبی کا چہرہ نہ لگا
ہو نظر آتا تو وہ بہت مشکل سے ہمیں بدکار بنا سکتی۔ ایسے لوگوں سے ہم سب لے ہیں
جنہوں نے عمدہ خیالات ہی کی بنا پر اپنے آپ کو کھوسی اور سنگدلی کا لازم بنالیا ہے۔
لارڈ پامرسٹن نے ایک مرتبہ خود اپنے اوپر اس پہلو سے کلمہ چینی کی کہ سب کو
پیدائش کے وقت نیک ہی ہونے ہیں۔ مگر خود ہی زحمت اٹھا اٹھا کے اپنی استعداد کے
سابق شریعہ بن جاتے ہیں۔ **سری برون** نے کہا خوب کہا ہے: "اتنا ہی رحم قیمت ہر
کہ دنیا کے بدکاری کے راستوں میں جمل کے ہم یک بیک شریعہ بنیں ہو جاتے۔ بلکہ چارے
بگڑنے میں عقوڑا وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ اور کسی قدر زحمتیں بھی برداشت کرنی
پڑتی ہیں جس طرح آسمان سے تارہ ٹوٹ کے گرنا ہو اس طرح ہم ایک ہی دن میں نیکی
کے امن سے نہیں گر پڑتے۔"

لیکن اگر ہم اس شخصی حالت سے تجاوز کر کے قومی حالت کی طرف توجہ کریں تو
یہ دیکھ کے کہ کیسے کیسے موقع ہاتھ آنے کے بعد ہم نے کھودیے ہیں کیا ہمارے لیے زیادہ
چونکا دینے والا نہ ہو گا؟ نوع انسانی **نیوٹن** کے سامنے اب بھی اس کا قرار

لارڈ پامرسٹن انگلستان کا ایک مشہور مؤرخ ہیں اور تمدن کا بڑا دست ام رکڑا جو ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوا
تھا اور ۱۹۶۷ء میں ۹۰ سالہ اسلام میں اسی مضمون کی یہ حدیث موجود ہے کہ مولود یولد علی الفطرۃ فاولا
فی فطرۃ کافۃ و تمقرنہ و یحسنا ذہ۔ ہر بچے کی ولادت نیکی ہی پر ہوتی ہے مگر ان باپ اسے ہودی نھرتی اور محوسی
بناتے ہیں یہ ساری نون انگلستان کا یہ شہر اور بہت ہی علمی و روحانی ہے جس نے قدرت کی وسعت اور انسان
کی ادا فقی کی بھی مثال دی ہے کہ ساری تحقیق و تفتیش اور ایجاد و اختراع اس سے زیادہ وقعت
نہیں کہ جڑ بچہ سمندر کے کنارے پیدا ہوا ہے۔ وہ نہ کلمہ میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۸۷۷ء
میں ملک عدم کو سدھا رہا۔

کر سکتی ہو کہ ہماری جنیت محض اُن بچوں کی سی ہو جو سمندر کے کنارے کھیل رہے ہوں
 اور ادھر ادھر سے ڈھونڈنے کے معمول سے زیادہ خوبصورت سیبیون یا سمندر کی نازک
 شاخوں کو جمع کر رہے ہوں۔ حالانکہ حقیقت کے اصلی سمندر پر اس وقت تک بالکل لاعلمی
 کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ دنیا میں ایک چیز بھی ایسی موجود نہیں ہے جس کے کل منافع اور
 اس کے تمام خواص ہم نے دریافت کر لیے ہوں۔ ہم صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں
 اور اس سے بھی زیادہ محنت کرنے کو تیار ہیں اگر صرف ہم اتنا معلوم ہو سکے کہ ماوس
 کے تمام خواص اور قدرت کے کل تصرفات کیا ہیں۔ بظن غالب فقط ایک یاد و گفٹہ میں
 ہم اپنے جسم کے ضروری اور مناسب حوالے کو فراہم کر لیں گے۔ اور دل کی اصلاح
 کے لیے کافی وقت موجود ہو گا۔ بجاپ کی قوت سے ہنوز پورا فائدہ نہیں اٹھا یا جا سکا
 برقی قوت ہمارے بچپن میں بالکل نامعلوم تھی اور اب ہم نے اُسے سمجھنا شروع کیا ہے
 نہ یوں کہ دھار سے میں جو قوت سے وہ اس وقت تک بے کار جا رہی ہو۔ اگر
 ان ایٹم ٹھیکس ذرا اور جلدی دریافت ہو جاتی تو بہت سی زحماتیں
 جو انسان کو اٹھانا پڑیں اُن سے بچ گیا ہو۔ ایسی مثالیں اگر لکھی جا دیں تو ایک
 دفتر ہو جائے گا۔ کوئی شخص شبہ نہیں کر سکتا کہ ابھی ہزاروں ایسی باتیں ہیں جن
 کی تحقیقات نہیں ہوئی۔ باوجودیکہ ہزاروں تحقیقاتیں ہو چکی ہیں کیا یہ عجیب انگیز
 بات نہیں ہے کہ وہ قومیں جو سچی نام سے مشہور ہیں لاکھوں روپیہ صرف ضائع
 نہیں کر دیتیں بلکہ ضائع کرنے سے بھی بدتر کاموں میں یعنی ایک دوسرے کے
 تباہ کرنے اور ملک کے واسطے درندوں کی طرح لانے میں صرف کر دیتی ہیں جبکہ
 حق کا بحر اعظم اُن کے سامنے نامعلوم پڑا ہوا ہے۔ گذشتہ زمانے میں ہم اس بات
 پر قانع تھے کہ ہماری اولاد بغیر لکھے پڑھے جوان ہو جاوے تو کچھ مضائقہ نہیں
 اس زمانے میں بھی بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ زیادہ تعلیم بے فائدہ ہو
 لیکن اگر انصاف سے دیکھا جاوے تو بہت سی حالتوں میں یہ معلوم ہو گا کہ اس کہنے
 سے اُن کا مطلب محض اس تعلیم سے ہے جو کہ روزمرہ کے کاموں سے کوئی تعلق
 نہ رکھتی ہو۔ بہت سے ایسے لوگ پڑے ہیں جو کہتے ہیں کہ تعلیم میں روپیہ بہت صرف ہوتا
 ہے ایک چیز جس کے گانے سے حسن کی قوت جاتی رہتی ہو۔ اور انسان کو دردِ غیر محسوس نہیں ہوتا۔

لیکن وہ اس سے بالکل غافل ہیں کہ تعلیم سے زیادہ روپیہ جاہل رکھنے کی وجہ سے تباہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ اب ہماری کل اولاد کچھ کچھ تعلیم پاتی ہے۔ تاہم ابھی اس بات پر شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اب تک ہم نے مناسب طریقہ تعلیم دینے کا اختیار کیا ہے یا نہیں (مین اس جگہ اس مسئلہ پر بحث نہ کروں گا) مگر مین اس مقام میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ہم لوگوں نے اسکولوں میں اخلاقی تعلیم کیطرت سے نامناسب غفلت کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ عام قیاس تو قائم ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص حکام الہی کو توڑ ڈالے تو ضرور ہے کہ وہ شخص غلط کر رہا ہے اور غالباً دوسروں کی تکلیف کا بھی باعث ہو گا۔ لیکن وہ شخص اس جہان میں تو ضرور اپنے تئیں زیادہ سرت ہو چکے گا۔ اور آرام میں ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ خود کامی۔ لالچ بے اعتدالی و کاپالی و دیگر عیوب کرنا گو سزاوارتہ مگر کوئی شخص اپنی ذات کے واسطے دوسروں کو نقصان پہونچا کر ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور یہ بھی ایک عام خیال پیدا ہو گیا ہے کہ اگر ایک شخص دوسروں کا خیال نہ کرے اور صرف اپنا ہی خیال رکھے تو اس کی فطری خواہش یہ ہوگی کہ آرام اور خوشی کے ساتھ زندگی بسر ہو۔ نیک اور پارسا ہونا کہ نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہے مگر اس میں ایک شخص ان مشغولوں سے بھی اپنی طبیعت کو محفوظ نہیں کر سکتا جن میں نہ تو کوئی عیب ہوا اور نہ کوئی گناہ مختصرتہ کہ ان میں اس کو اپنے نفس پر جبر ضرور کرنا پڑتا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہی نہیں۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ برائی کا راستہ اختیار کرنے میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور بہت آزادی ہے۔ بلکہ جناب آپ اس کے خلاف یہ پائیے گا کہ ایک بدکار آدمی بدترین مالکون کا غلام ہے یعنی اپنی شہوتوں کا۔ بعض فوجوانوں کا یہ خیال ہے کہ بدکاری میں ایک قسم کی مردانگی ہوا کرتی ہے۔ لیکن اگر وہ غور کریں تو اس بات کو دیکھیں گے کہ ایک کمزور اور بے دل بیوقوف بھی بدکار ہو سکتا ہے۔ دراصل پارسا اور صالح ہونے کے واسطے مردانگی ضروری ہے اور اسی میں آزادی ہے۔ بدکاری حقیقتہً غلامی ہے۔ ایک خاص چال چلن کے طریقے کے نا درست ہونے کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اس میں تنزل اور بے عزتی ہے۔ بلکہ نا درست طریقہ تنزل اور ذلت کا باعث ہوتا ہے۔ اگر اخلاق میں کچھ ایسا غیر معمولی

انقلاب واقع ہو جائے کہ اب جو باتیں درست سمجھی جاتی ہیں نادرست ٹھہرائی جا دیں تب بھی وہ طریقہ جو حقیقت میں نادرست ہو دی آرام اور مسرتوں کے واسطے مضری ہوگا۔ میں اس بات کی تائید میں کسی علم آئی جاننے والے کے مقولہ کو نہیں پیش کروں گا جو کہتے ہیں کہ گناہ رنج کا باعث ہوتے ہیں۔ اور ان کا جدا ہونا غیر ممکن ہے۔ بلکہ میں اس بات کی تائید ایک دنیا دار آدمی کے کلام سے کروں گا لا رہے ہیں کہ **دوسرے قیلید** نے ایک خط اپنے لڑکے کو تحریر کیا تھا جس میں بہت سی دانشمندانہ نصیحتیں کی ہیں۔ اس خط کا آخری جملہ یہ ہے "پار سا اور صلح ہونے کے انعام ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں اور اگر تم بڑے اور نیک آدمی ہونا چاہتے ہو تو ایسے ہی لوگوں کے چال چلن کی تم کو نقل کرنی چاہیے۔ اور میں یہی ایک طریقہ خوشی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا ہے۔" **دوسری کارٹ** نے اپنے قواعد کو زندگی کے عمل کے طریقے کے واسطے چار نصیحتوں میں یوں بیان کیا **اول** اس ملک کے قانون سے اور اس مذہب سے جس میں تم بیت پائی ہو سزا بنی نہ کرنا۔ **دوم** ان موقعوں پر جن میں کام کی ضرورت ہو فوراً ادراپنی سمجھ کی حد تک کام کرنا اور جو کچھ نتیجہ ہو اس پر بغیر ناگواری ظاہر کیے راضی ہو جانا۔ **سوم** اپنی خواہشوں کے محدود کرنے میں مسرت تلاش کرنا۔ نہ کہ ان خواہشوں کے پورے ہونے کی کوشش میں **چارم** زندگی کا کام حق کی تلاش ہونا چاہیے۔

لی اپنی ایک مشہور کتاب میں یوں صلاح دیتا ہے "چراغ میں تہی بڑے ہی سو رہو اور جس وقت لارک جاگتی ہے اٹھ بیٹھو۔ خوش و خرم رہو۔ لیکن انکساری کے ساتھ پیچیدہ ہو مگر ترش نہ رہو۔ دلیر ہو مگر بالکل بے دھڑک اور ہیاک نہ ہو جاؤ۔ سادہ پوشاک پہنو۔ صحت بخش غذا کھاؤ۔ لیکن بہت نہ کھاؤ۔ دل ہلاؤ۔ مگر دل کے ہلانے میں وہ باتیں کرو جن میں کوئی ہرج اور ضرر نہ ہو۔ بے وجہ کسی کو بے اعتبار نہ سمجھو اور نہ ہر اک بات پر بلا ثبوت یقین کر لو۔ بغیر سمجھے بوجھے جلدی سے ہر ایک کی رائے کا قیغ نہ کرو۔ اور نہ اپنی ہی رائے پر بہت کرو۔ خدا کی اطاعت کرو۔ خدا سے ڈرو۔

سہ دہی کارٹ۔ فرانس کا ایک نامی گرامی فلسفی گذرا جو ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۸۵ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے لارک انگھٹان کی ایک نفیس طرح پر جو تڑکے سے اپنا رخسار بجا ہوا ہوتا کرتی ہے اور اسے ارض مغرب میں قریب مغرب ایشیائی بلبل کی وقعت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ اٹھنے کا مطلب یہ کہ تڑکے اٹھو۔

اور محبت کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی برکتیں تم پر ازل کرے گا جیسا کہ تمہارے دل اور تمہارے دوستوں کی خواہش ہے۔“

نہ صرف خود غرض شریا اور بے خبری اپنے فائدے کے واسطے اپنے تئیں اور دوسروں کو مصیبت میں ڈال دیتے ہیں بلکہ بہت سے قابل عزت لوگ اور بہت سی عمدہ کتابیں جو کہ اچھے ارادے کے ساتھ لکھی گئی ہیں ان میں بھی اسی قسم کی غلطی پائی جاتی ہے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ زمانہ جو گناہ میں گزرتا ہے زیادہ خوشی کے ساتھ گزرتا ہے اور نیکی کو جفاکشی اور مذہب کو نفس کشی تصور کیا ہے۔ اور اب بھی ہم کو درد مرہ ایسے قابل لوگ ملتے ہیں جن کا یہ خیال ہے کہ مسرت بخش پائین نادرست ہیں اور اصلی منشا مذہب کا ترسش تلخ اور پر غم ہے اور یہ قدرتی بہار اور رونق جو کہ ہم لوگوں کے گرد پائی جاتی ہے رحمت نہیں ہے بلکہ اس کو شیطان نے ہمارے بہکانے کے واسطے جمع کر رکھا ہے۔ اور یہ ہرگز اللہ تعالیٰ نے جو کہ بھلائیوں کا پیدا کر نوا لا ہے ہم لوگوں کے آرام و آسائش کے واسطے نہیں پیدا کی ہیں گو یہ کہ وہ دلچسپ مصراعوں کا یہ مضرب ہے۔ غم کا راستہ شہر ہی ایک ایسا راستہ ہے جو ایسی سر زمین کو گیا ہے جہاں کہ کوئی شخص رنج و غم کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔“

یہ سچ ہے کہ زندگی میں رنج و غم ضرور ہوتا ہے۔ اور نور بغیر سایے کے نہیں ہوتا۔ قطع نظر ان رنجوں کے جو ہیں اس تھوڑے سے زمانے زندگی میں اپنے پیارے عزیزوں یا دوستوں کے مرنے پر ہوتے ہیں خود ہماری ہستی کی حالت کچھ ایسی پیچیدہ ہے۔ اور دنیا کا ابھی اس قدر بچپن ہے۔ اور ہم کو آج تک اچھی طرح یہ بھی نہیں معلوم کہ ہماری ہستی کی ضروریات کیا ہیں۔ ادے کے خواص اور ان کی یاہیت کیا ہے۔ اور فوت کی اصلیت کس طرح پر ہے۔ پس ایسی حالت میں کوئی تعجب نہیں۔ اگر ہم کو رنج و تکلیف اٹھانا پڑے تو کچھ کہتا ہے کہ غم کا راستہ۔ اور صرف وہی راستہ ہے جو سیدھا بہشت کو پہنچا گیا ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ یہاں

لے کہ بڑا ایک مشہور و مقبول شاعر گزراہی جو ۱۳۷۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۱۳۷۷ء میں مرا۔

عیش و آرام کرنا آخرت میں مصیبت کا باعث ہو گا۔ اس غلط خیال نے بہت سے اہل تشیع لوگوں کو تردد اور فکر میں ڈال دیا ہے۔ بہت سے تیر فہم نوجوانوں نے خود ہی ملائی کی کوفت اٹھائی اور اپنے آپ کو اذیت دی اور صرف اس وجہ سے کہ اُن کو سرت کی دولت حاصل تھی۔ اُن کو چاہیے تھا کہ ایسی نعمت کا شکر کرتے اور اس بات کو سمجھتے کہ اس بے بہا موقع سے وہ اُن لوگوں کے راستے کو منحرف کر سکتے تھے جن کے دلوں میں خوشی سرت کا چشمہ جو غم یا بیماری کے خشک ہو گیا ہے۔ گو یہ حقیقت سورت میں بیان نہیں کیا گئی لیکن نصیحتوں میں اُن لوگوں کے منشاء کارنگ نہیں پایا جاتا ہے جن کی بابت حکماء نے یہ کہا ہے کہ وہ رچھ کو اذیت پہنچانے پر اس وجہ سے اعتراض نہیں کرتے کہ رچھ کو تکلیف ہوتی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ تماشائیوں کو اس سے خوشی حاصل ہوتی ہے۔“

بہت لوگ ہستی کار از دریافت کرنے کے لیے اپنے نفس کو بہت رنج اور تکلیف دیتے ہیں سوڈی کا مقولہ ہے کہ ایک نیک اور عقل آدمی کبھی دنیا پر غصہ کرتا ہے اور کبھی اُسکے واسطے رنج کرتا ہے۔ لیکن یہ یقین جانو کہ جو شخص اپنا فرض اس دنیا میں ادا کرتا ہے وہ کبھی دنیا سے ناخوش نہیں ہوتا و پیر کا قول ہے کہ دنیا کا معتمد صرف اسی کی سمجھ میں آیا ہے جو خدا کو نیک جانتا ہے۔ ”سنییکا“ کہتا ہے ”کوئی فرض ایسا نہیں جس کے ادا کرنے میں ہم کو خوشی نہ حاصل ہو۔ اور کوئی رغبت ایسی نہیں جس کا علاج موجود نہ ہو ملٹن کہتا ہے ”نیچر (قدرت) کو الزام نہ دو وہ اپنے حصہ کا کام کر چکی ہے۔ اب تم اپنے حصہ کا کام انجام دو۔ اگر خالق کا منشاء یہ نہ ہوتا کہ ہم نیچر سے لطف اٹھاؤں

۱۔ پورٹین مسائیون کا ایک فرقہ جو ان لوگوں کا مذاق نفوذ کا ہے اور نفسی کے حامی ہیں مگر انہوں سے پیشتر انگلستان میں ان لوگوں کا بڑا زور تھا۔ ۲۔ مکے نے بولارڈ مکالے کے نام سے مشہور انگلستان کا بڑا زبردست جادو نگار سورج اور آفتاب رواں تھا ۳۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی سپریم کونسل کا ممبر تھا۔ ہندوستانیوں کو تعلیم دلانے پر گورنمنٹ کو اسی نے مجبور کیا۔ اور یہ موجودہ تعلیم کی برکت جو مسئلہ ۴ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔ ۵۔ سوڈی انگلستان کا ایک نامی گرامی شاعر اور جادو نگار ادیب تھا جو ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء میں مر۔ ۶۔ ملٹن انگلستان کے ابتدائی اٹھان کے زمانے کا زبردست شاعر تھا ۷۔ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۵۷ء میں مر۔

تو یہ یقین جانو کہ وہ خیر کو کبھی ایسا نہ بنا۔ تاکہ اس کی صورت میں آنکھوں کو خوشنما اور اُس کی آواز میں کانوں کو نغمہ معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا قریب قریب غیر ممکن ہو کر اپنی ذات کو درست اور آراستہ رکھنے سے انسان اپنے واسطے کس قدر خوشی اور دوسروں کے واسطے کس قدر چین مہیا کر سکتا ہے۔

اگر یہ زمانہ واقعی نہایت تعجب انگیز و عجیب اور تربیت یافتہ ہے تو اصل میں یہ ہماری خوش قسمتی ہے نہ کہ ہمارے افعال کا نتیجہ۔ اور یہ ایسی بات ہے جس پر ہر شکر کرنا چاہیے نہ کہ ہم فخر کریں۔

جبکہ ہم شکر گزار ی کرتے ہیں اور زندگی کی برکتوں سے لطف اٹھاتے ہیں ایسی حالت میں ہم کو یہ امید نہ کرنی چاہیے کہ ہم کو رنج و افکار نہ ہوں گے **واللہ** نے زندگی کو یوں بیان کیا ہے کہ "وہ ان لوگوں کے واسطے مسرت آئین ہے جو فکر و غور کرتے ہیں۔ اور اُن لوگوں کے لیے باعث درد و غم ہے جن میں دلی جذبات بھرے ہوئے ہیں" درحقیقت زندگی اکثر دردناک ہوتی ہے اور بہت کم مسرت آئین۔ لیکن قاعدہ یہ ہے کہ ہم اسے جیسا بنانا چاہیں ویسا ہی بنا سکتے ہیں۔ سقراط کا قول ہے کہ "ایک نیک آدمی پر نہ تو جیتے جی کوئی مصیبت آسکتی ہے اور نہ بعد مرگ" حقیقتہً جن لوگوں نے کہ امیدیں دلائل میں اکر ان کا اندازہ زیادہ سچا تھا۔ نسبت اُن لوگوں کے جنھوں نے مصیبتوں کی پیشین گوئی کی۔ لیکن اصل بات یوں ہے کہ ہم لوگ خوشی کے برسوں کو بے خبری سے گزار دیتے ہیں۔ اور درد و الم کے ہر ہر لمحہ کا شمار کیا کرتے ہیں۔

ہم ہمیشہ یہ امید نہیں کر سکتے کہ ہمیں کامیابی ہی ہوگی۔ کیونکہ خیر کو کبھی بعض اوقات ناکامیابی ہو جاتی ہے۔ بادشاہ الفروٹ نے بوسنیہ میں ترحجے میں یون لکھا ہے کہ "ابن دولا اور اقبال مندی پر غور کی راہ سے سر بلند نہ کرو۔ اور نہ مصیبت کے زمانے میں بھلائی سے مایوس ہو جاؤ"

۱۵۹۱ء پاپولہ پور میں پیدا ہوا۔ زاور نامی اور انجمن مصنف تھا ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۹۹ء میں مرا۔
۱۵۹۲ء الفروٹ گلستان کا ایک حکمران تھا جس نے روم میں جا کے علم حاصل کیا۔ اور بہت سی لاطینی کتابیں ترجمہ کیں ۱۸۹۳ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۹۹ء میں مرا۔

انجیل کے ایک مشہور فقرے کا ترجمہ یوں ہے: "وہ بچا ملک کشادہ اور وہ راستہ
چوڑا ہے جو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور وہ لوگ کثرت سے ہیں جو اس بچا ملک
کی طرف جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ بچا ملک دشوار اور وہ راستہ تنگ ہے جو زندگی کی
طرف گیا ہے۔ اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس کو پاتے ہیں۔"

میں خیال کرتا ہوں کہ لوگ اس کے معنی غلط سمجھتے ہیں اس کے معنی یہ نہیں کہ
راستہ صاف نہیں ہے اور اس میں زیادہ کالیف ہیں۔ بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ
راستہ تنگ ہے۔ اور جلدی نہیں مل جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیدھا راستہ صرف
ایک ہی ہوتا ہے۔ گو کہ اس راستہ کے ساتھ ہی ساتھ ہر جانب گنگوٹیاں پھیلی ہوئی ہوں
جہاز کا راستہ سمندر میں صرف ایک ہی ہوتا ہے اور قطب نما میں جو اور بھی بہت سے نقطے
بنے ہوتے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے جہاز کبھی کنارہ مقصود کو نہ پہنچے گا۔ لیکن اس سے
یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ اس راستے میں سختیاں اور طوفان دوسرے راستوں سے زائد ہیں۔

درجہ کوئی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ وہ باتیں جو درست ہیں اکثر خوشی
اور بعض اوقات ایک لمحہ بھر کے لیے مسرت بھی دیدیتی ہیں۔ اس سے انکار کرنا فضول ہے۔
کیونکہ اس بات کے انکار سے رغبتوں کی ہستی پر اعتراض لازم آتا ہے جو بات میں ظاہر
کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان رغبتوں کی اطاعت سے ہم کو ایک لمحہ کی خوشی کے واسطے
آئندہ غم اٹھانا پڑتا ہے۔ اور قلیل نفع کے بدلے میں نقصان کثیر برداشت کرنا پڑتا ہے
واقعی یہ کہنا بے موقع نہ ہو گا اور میں صرف اس دنیا کی زندگی کی بابت کہتا
ہوں کہ اگر ہم خوشی کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو نیک ہونے کی کوشش
کرنی چاہیے خود کامی سے زیادہ خود فراموشی میں مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اقبال مندی اور فلاح کے ساتھ مسرت ہمیشہ نہیں پائی جاتی ہے اور
بہت سے لوگ جن کے پاس یہ ظاہر ہر طرح کا سامان مسرت موجود ہے مصیبت
اور تکلیف میں مبتلا ہیں۔ **لوائس** کا قول ہے کہ "قسمت بہت کچھ دے سکتی ہے۔
لیکن یہ انسان کے دل ہی کا کام ہے کہ اُس کو بہت کافی سمجھو اور اُس کے ایک

لوائس آئرلینڈ کا ایک انشاپرداز اور فلسفی تھا سنہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۷ء میں لندن میں مرا۔
لوائس ڈارون نام کے تین مشہور شخص ہوسے ہیں مگر بیان جانور کے ارتقاء سے مراد ہے جو ڈارون نام کے تین مشہور شخص
کا جس کا سنہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۸۲ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔

شہر کا مضمون ہے کہ میں اپنے دل میں ایسی عمدہ سرتین پاتا ہوں کہ وہ میرے لیے

ایک سلطنت ہے۔
 "اوتار گرتھنا" یہ بات ہر ایک کے اختیار میں نہیں ہر ایک دولت عمدہ اور
 عزت حاصل کرے۔ لیکن نیک فیاض اور عقل مند شخص ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہر قبضہ میں وہ
 اسی دولت نہیں ہیں۔ بلکہ جو کچھ میں ہم خود ہیں جس قدر فقیہ ہو تو اسی قدر ذمہ داری
 بھی بڑھتی ہے۔

سینٹ کری سوٹم کا قول ہے کہ موجودہ حالت ایک تھیسٹ ہے۔ اور انسان
 کا کاروبار ایک تماشہ ہے۔ دولت و انبخت۔ حاکمی۔ و محکومی۔ اور ایسی ہی دیگر حالتیں
 تماشہ کی نقلیں ہیں۔ جبکہ دن (یعنی زمانہ) ختم ہو جائے گا تب یہ تھیسٹ بھی بند ہو جائے
 گا۔ اور ایک ہر لوگوں کے مضمون پر جو چہرے لگے ہوئے ہیں۔ اتر جا دیں گے۔ اس وقت ہر ایک
 آدمی کی اور اس کے اعمال کی جانچ ہوگی۔ اس وقت اسکی دولت۔ عمدہ۔ عزت۔ اور حکومت
 نہ بچے گی۔ بلکہ ہر شخص کی ذات اور اسکے اعمال پوچھے جا دیں گے۔ اندازہ کریں کہ یہ
 کہ چارے اعمال پورے ترین ہیں۔

وہ جانچ کیا ہوگی؟ یہ نہ دیکھا جائے گا کہ ہم نے کس قدر کام کیا ہے۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ ہم
 اپنی کوششوں سے کامیابی کے مستحق تھے یا نہیں۔ اور اگر نہ تھے تو کیا یہی خوش قسمت وہ
 شخص پیدا ہوا ہے اور یہی اچھی اس شخص نے تربیت پائی ہے جو دوسروں کی مرضی کا غلام نہیں ہے
 جس کا ذرہ بکتر اس کا ایمان دارانہ خیال ہے۔ اور محض سچائی جس کا علم و ہنر ہے۔

حقیقۃً عقل مند اور ایمان دارانہ زندگی سرتا آگین زندگی ہے۔ اور گناہ اصل میں جھانسی
 ہے۔ حضرت سلیمان کی یہ نصیحت ہے کہ اسے میرے بیٹے تو میرے قانون کو فراموش نہ کرے۔ میرے حکم کو
 کوا بنے دل میں جگہ دے۔ کیونکہ ان سے تجھ کو درازی ایام۔ بڑی زندگی اور اطمینان خاطر حاصل ہوگا۔

۱۔ مادہ دار گناہ منوس کہ اس شہور حکیم کے حالات سے ہم مطلع نہیں ہو سکے۔ (ترجمہ)
 ۲۔ سینٹ کری سوٹم بہت قدیم زمانے کا ایک مسیحی عقیدہ ہے وہین اور جادو میان تھا جو قسطنطنیہ کا
 اسقف مقرر ہو گیا تھا ۳۔ اور ۴۔ درمیان ایتالیہ میں پیدا ہوا تھا۔ اور ۵۔ ۶۔ میں ایشیا
 کی خاک میں دفن ہوا۔

۷۔ دوٹن انگلستان کا ایک مصنف اور درجہ سلطنت کا حامل تھا۔ ۸۔ میں پید ہوا اور ۹۔ ۱۰۔ میں مل۔



قاضی ابویوسف یعقوب بن ابراہیم یہ ایک ایسا نام ہے کہ اسلام نے اس نام کے شل شاید دو ہی چار اور ناموں کی عزت کی ہوئی۔ دین پیغمبر صلوٰۃ اللہ علیہ وعلیٰ آلہ کو اس پایہ کے بہت کم لوگ ملے۔ امام ممدوح کے عہد سے آج تک نیا اسلام ان کے نام کو واجب التعظیم مان رہی ہے۔ امام عظیم ابو حنیفہ کو فی رحمہ اللہ کے شاگرد و رشید اور اپنے عہد کے مرجع انام تھے۔ امام ابو حنیفہ کو جیسے شاگرد امام ابویوسف ملے ہیں ویسا نامور اور استاد کے نام کو روشن کر دینے والا شاگرد شاید دنیا میں کسی استاد کو نہ نصیب ہوا ہو گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابو حنیفہ کے معاصر محدثین اور فقہائے اسلام نے انھیں اہل الہیہ کا لقب دیکے مقبولیت کو درجے سے گرانما چاہا تھا۔ اور بے شک گرا دیا ہوتا اگر امام عظیم ممدوح کو امام ابویوسف کا ایسا گران پایہ شاگرد نہ مل جاتا۔ امام ابویوسف ہی کی ذہانت و دکاوت قوت اجتہادی اور زمانہ شناسی کا نتیجہ تھا کہ جمہور فقہاء اسلام جو امام عظیم کے حریف مقابل تھے انھوں نے سب کی قوت توڑ کے مقبولیت عامہ کا تاج زبردستی چھینا اور اپنے مقدس استاد کے مبارک سر پر رکھ دیا۔

اس نام نے دنیاے اسلام کے بہت بڑے اور سب سے غالب فرقہ کے سربراہین میں اپنی پاک محبت پیدا کر لی ہے۔ اور کون ہے جو اس واجب التعظیم نام کو نہیں جانتا۔ مگر اس کے جاننے والے بہت کم ہیں کہ وہ مقتداے اسلام جس نے امام عظیم کے دامن تربیت

میں نشوونما پائے۔ "اناؤ لاغیری" کا جھنڈا بلند کیا۔ صل میں کون تھا۔ اور کیونکر اس مرتبہ عالی کو پہنچ گیا۔ امام ابو یوسف کے حالات ابتدائی سن کے زمانے بھر کو حیرت بخوگی۔ اور شاید بہت سے نرم طبیعت والوں کے دل بھراؤں گے۔

سلاطین میں امام ابو یوسف پیدا ہوئے۔ جن لوگوں کی تقدیر کوئی نیازنگ دکھائی دیتی ہے اکثر زمانہ ان کے ساتھ دشمنی کرتا ہے۔ چنانچہ ہنزہ بچہ ہی تھے کہ قسمت نے باپ کے دامن شفقت کو سر پہ سے اٹھالیا۔ یہ بھی ایک ایسی برکت تھی کہ قدرتی ہی طور پر حضرت خاتم النبیین صلعم کی اقتدا نصیب ہو گئی۔ غریب مان جس کو ماننے سے بیوہ بنا دیتا تھا جب بالکل بے مونس و بے غمگسار ہوئی تو اُس نے اپنی اور اپنے ہونما بچہ کی جان پالنے کے لیے ہر ضحکا تا شروع کیا۔ مگر کب تک ہار کے نے ابھی یونین سے ہوش بٹھانے ہوں تھے کہ اُس دکھیا نے مصائب و نیا دی سے تنگ آکر اپنے اُس بچہ کو جو دنیا کا بہت بڑا امام ہونے والا تھا ایک دھوبی کے پر کیا اور کہا اُس بچہ کو میں تمھارے سپرد کرتی ہوں۔ اسے کپڑے دھونا سکھا دو۔ اور اس کا خیال رکھنا کہ یہ بے باپ کا بچہ ہے۔ اُس روز سے امام مدوح دھوبی کے ساتھ گھاٹ پر جانے لگے۔ وہاں دل نہیں لگتا تھا۔ آخر ایک روز کچھ ایسی الجھن ہوئی کہ دھوبی کو چھوڑ کر امام اعظم کے درس گاہ میں آئے۔ امام اعظم کے بند و نصائح نے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہی پہلی تاریخ امام ابو یوسف کی تعلیم کی ہو گئی۔ شام کو گھر پہ آئے۔ خدا خدا کر کے صبح کی۔ اور صبح ہونے ہی پھر وہیں امام اعظم کی مجلس درس میں جا کے حاضر ہوئے۔ امام اعظم نے بھی شفقت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور ان کے شوق نے انھیں ان کی طرف یہ حیثیت ایک شفیق استاد کے متوجہ کر دیا۔ امام ابو یوسف اپنے اُس زمانے کے حالات خود ہی تحریر فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "میں گھر سے مکمل کے روز بلا ناغہ امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ دھوبی نے یہ غفلت دیکھ کے میری مان سے شکایت کی اُس نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ آخر یہ معمول ہو گیا کہ میں اور امام اعظم کے درس گاہ میں حاضر ہوا اور میری مان و مان ہو چکی اور سخت دست کہہ کے مجھے وہاں سے اٹھالائی۔ میں مجبوراً در بے بس ہو کر امام صاحب کی صحبت چھوڑ کر دھوبی کے پاس جاتا تھا۔ ایک روز عجب اتفاق ہوا۔

میں امام ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ مجھے درس دے رہے تھے کہ میری
 ماں آگئی۔ میں اُسکے خوف سے سہم کے امام صاحب کی صورت دیکھنے لگا۔ میری ماں مجھ سے
 اس قدر تنگ آگئی تھی کہ خود امام صاحب کی طرف متوجہ ہو کے کہنے لگی: آپ نے میرے
 لڑکے کو اس سے روک کے دو پیسے کمائے پڑھنے لکھنے کا شوق دلادیا۔ جہ خا کا
 کات کے میں اپنی اور اس کی جان پالتی ہوں۔ اور آپ کو اس کے فکر نہیں ہوتی کہ میں
 کس مصیبت میں مبتلا ہوں؟ امام اعظم نے یہ سن کے کہا: اے عورت جاننا کام کر تیرے
 لڑکے کے اطوار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خوش نصیب ہوگا۔ سن ظاہر میں تو یہ میرے
 سامنے بیٹھا درس لے رہا ہے۔ مگر اصل میں یہ روغنِ پستہ کے ساتھ فالودہ ملا کر
 کھا رہا ہے۔ یہ سن کے میری ماں کو اس قدر غصہ آیا کہ امام عالی شان کی خدمت میں
 گستاخی اور دریدہ دہشی کرنے لگی۔ اُس نے جھجھلا کے کہا: معلوم ہوتا ہے تم میں لغویت
 آگئی ہے اور تمہاری عقل جاتی رہی ہے؟ اتنا کہا اور بیٹھ پھیر کے چلی گئی۔ مگر میں نے کچھ خیال
 نہ کیا اس نعمت و ملامت پر بھی میں امام اعظم کے درس گاہ میں حاضر ہوتا رہا چونکہ
 اب ماں مزارِ حمت نہیں کرتی تھی لہذا میں التماس سے شریکِ درس ہونے لگا۔ اور مجھے
 امام صاحب کے افادات کا اس قدر شوق تھا کہ جو لفظ ان کی زبان سے نکلتا اسے
 شوق سے سنتا تھا اور یاد کر لیتا تھا۔

امام ابو یوسفؒ کے مثل شاید ایم طالبِ علمی میں اور کسی شخص نے تکلیف نہیں
 اٹھائی ہوں گی۔ اکثر دو دو روز فاقہ ہی میں گزر جاتے تھے اور کوئی چیز کھانے کو نہ
 نصیب ہوتی تھی۔ فرما تے ہیں جزئیہ مخارجِ خانگی کا اجرانہ پاؤں اور کتا اقداس مجھ پر
 اس قدر طاری تھا کہ دو پیسہ کا کاغذ بھی نہ جڑتا تھا جس پر استاد کے امار (لکچر) کو لکھ
 لیتا۔ بڑی محنت اور جفاکشی سے میں نے بکریوں کے شانہ کی چھٹی چھٹی ہڈی (بھین) فراہم
 کی تھیں جو کچھ کھنا ہوتا تھا انھیں ہڈیوں پر لکھ لکھ کے رکھ لیا کرتا تھا۔ اسی اقداس و فاقہ
 نے مجھے لڑکے سے جوان کر دیا۔ میری شادی بھی ہو چکی تھی۔ مگر قسمت کی جانب سے گواہ
 یہ ایک اور بہت بڑی دشمنی تھی۔ اس لیے کہ اپنی ہی زندگی خدا جانے کس طرح بسر ہوتی
 تھی اب جو روکا ایک اور بار سر پہ آ پڑا تھا۔ مگر شوقِ علم نے امامِ اعظم علیہ الرحمۃ کا دامن کسی
 طرح نہ چھوڑنے دیا۔ نتیجہ یہ تھا کہ میں بھی فاقہ کرتا تھا اور میرے ساتھ وہ پاک و امن بھی فاقہ

کرتی تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ امام صاحب کی صحبت بابرکت سے میں گھر میں آیا تو شد
گرنگی سے یہ عالم تھا کہ عقل و ہوش رخصت ہوے جاتے تھے۔ جلدی سے میں اپنے
گھر میں داخل ہوا اور دوڑ کے بیوی سے کہا "اس وقت میں بھوک کے مارے نہایت بیتا
ہوں۔ اگر کچھ کھانے کو ہو تو لے آؤ یہ وہ نیک بخت بھی خدا جانے کب سے بھوک پیچی
تھی۔ میری زبان سے یہ کلمہ سنتے ہی اُسکے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جھلاکے کوٹھری
میں دوڑی گئی اور وہ سب ہڈیاں جن پر میں نے استاد کا درس لکھا تھا دسترخوان میں
باندھ کے میرے سامنے لاکے رکھ دیں۔ اور کہا تمہارے ہاتھوں گھر میں جو کچھ گہستی
جمع ہوئی وہ تو یہی ہے۔ اور تم سے کاپل اور ٹکٹو کی یہی سزا ہے کہ یہ ہڈیاں سامنے لاکے
ڈال دی جائیں" اُس کی اس طعن آنیز تقریر نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ میں نے نہایت ہی بے بسی
اور مجبوری کے ساتھ علم سے ہاتھ اٹھایا اور درپے معاش ہوا۔ امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ
نے جب کئی روز تک مجھے نہ دیکھا تو شاگردوں سے میرا حال دریافت کیا انھوں نے یہ
داستان بیان کر دی۔ یہ سن کے انھیں مجھ پر ترس آگیا۔ اور مجھے بلا بھیجا۔ اور میرا کچھ وظیفہ
مقرر کر دیا۔ یہ پہلی تاریخ ہے جس روز سے امام ابو یوسف کو اطمینان اور فراغت کے ساتھ
علم کی طرقت متوجہ ہونے کا موقع ملا۔

دیسری شافعی نے لکھا ہے کہ ابو یوسف امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس میں معمولاً بالالترام
شریک ہوا کرتے تھے۔ مگر اتفاقاً آتے آتے ایک مرتبہ ان کا آنسو قوت ہو گیا امام ابو حنیفہ
اور زینر طلبہ نے بہت جستجو کی مگر کچھ پتا نہ لگا کہ کہاں غائب ہو گئے۔ اور کیوں چلے گئے چند
روز کے بعد وہ خود ہی آ بھی گئے۔ امام صاحب نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مونہا رشاگرد
کے دل میں کتب تواریخ مشرق غازی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔ اور اسی جستجو میں کوہ
چھوڑ کے دیگر بلاد اسلامیہ میں چلے گئے تھے۔ الغرض یہ امر ہر طرح سے ثابت ہے کہ امام ابو یوسف
کو ایام طالبہ علمی میں علم کا ایسا شوق تھا کہ اپنی راحت و آرام کا بھی خیال بھی نہ
کیا۔ آخر میں علم حدیث کا شوق ہوا۔ اور اس عہد کے مشاہیر علماء محدثین کی خدمت
میں حاضر ہو کے احادیث و آثار کے قیام میں پوری سرگرمی دکھائی۔ ابو اسحق شیبانی
سلمان تیمی۔ یحییٰ بن سعید انصاری۔ اعلمش ہشام بن عودہ۔ عطاء بن سائب۔ اور محمد بن
اسحق بن سیرین اُس زمانے کے مشہور راوی ہیں اور وہ لوگ ہیں جن کی شاگردی کا خزانہ

آبویوسف نے حاصل کیا بعض مورخین کا بیان ہے کہ امام آبویوسف ہر صحت درس میں بالکل اسی ذوق و محویت کے ساتھ جاتے تھے جس طرح کسی کا لڑکا کم ہو گیا ہو اور وہ اُسکی جستجو میں ہر جگہ ارا مارا پھرتا۔

اسی ذوق علم نے آخر اُنھیں کامیاب کر کے سند اقتدار پر بٹھا دیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے انتقال فرمایا۔ اور ایک صاحب فتویٰ عالم کی حیثیت سے امام آبویوسف کو فہ اور بغداد میں زندگی بسر کرنے لگے اس زمانے میں بھی امام آبویوسف پر ہمیشہ فلاس و تہنکدستی کا عالم رہا کرتا تھا علم کا نتیجہ اگر دنیاوی ثروت ہو تو اس سے ہنوز امام ہمدوح بالکل بہرہ یاب نہیں ہو سکے تھے۔ مگر قسمت نے ان کے لیے ناموری۔ شہرت۔ دولت۔ اور حکومت کے بہت کچھ سامان فراہم کر رکھے تھے۔ جن تک ابھی ان کا ماتم نہیں پہنچا تھا۔ اس مرجعیت اور صاحب فتویٰ ہونے کے زمانے میں بھی صرف بے زری کی وجہ سے یہ حال تھا کہ اُن کے پُرسوس میں ایک یہودی رہتا تھا اُس نے ارادہ کیا کہ اپنے دروازے پر ایک عمارت اپنی حد سے زیادہ زمین لے کے بنواسے جس کی وجہ سے راستہ تنگ ہوا جاتا تھا۔ اور خود امام ہمدوح اور نیز تمام دیگر اہل محلہ کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ امام آبویوسف اس یہودی کے پاس گئے اور کہا: آپ کی اس عمارت سے راستہ تنگ ہوا جاتا ہے اور تمام اہل محلہ حیران ہیں اُس یہودی نے ان کے علم و فضل کا دل بھی پاس نہ کیا اور جواب میں بہت کچھ لعن و طعن کے بعد کہنے لگا: ابھی آپ رہنے دین جب لوگ آپ کو نفس میں بٹھا کے بڑی شان و شوکت سے ہٹو بیچو کرتے ہوئے لائیں گے تو میں اس عمارت کو کھدوا ڈالوں گا اور آپ کے لیے راستہ کھل جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ اس نے ان کا کچھ بھی پاس نہ لیا اور عمارت بنوالی۔ خدا کی قدرت اس کے چند ہی روز بعد خدا نے اُنھیں اس مرتبہ پر پہنچایا کہ بغداد کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور تمام دنیا اسلام کی پسریم کو رٹ کے میر مجلس مقرر ہو گئے۔

امام آبویوسف جس ذریعہ سے رشید کے دربار میں پہنچے اس میں کسی قدر اختلاف ہے مگر غالباً صحیح یہ ہے کہ آرون رشید تربیدہ خاتون کی کسی پریمیاں اور باز آفرین لونڈی کو دیکھ کے یا ایک ایسا والہ و شیدا بلکہ از خود رفتہ ہو گیا کہ کھینچ کے اُسے گود میں بٹھالیا۔ اور اختلاف کرتے لگا۔ مگر عین اس و نور شوق کے عالم میں خیال آیا کہ یہ لونڈی تو تربیدہ کی ہرچہ بھر کیونکر جائز ہو سکتی ہے۔ دل میں اس بات کا اہم تھا کہ رشید نے اُس لونڈی کو چھوڑ دیا یہ فتنہ

یہ خبر خود زبیدہ کے کان تک پہنچی۔ اسکو رشید کی یہ حرکت نہایت ناگوار گزری۔ خود خلیفہ کے پاس آئی اور غصہ میں خدا جانے کیا کچھ کہڑا لایا۔ منجملہ درکلمات کے زبیدہ کی زبان سے ایک یہ کلمہ بھی نکلا تھا: "اے دوزخی میرے سانسے سے چلا جا۔" بارے غصہ کے میرے تن بدن میں آگ لگی جاتی ہے۔ اس پر ہارون نے طیش کھا لیا۔ جب میں دوزخی ہوں اور تمہارا چہرہ ہشتی ہے تو مجھ سے تم سے کیا تعلق۔ جاؤ تم پر طلاق ہے۔" کہنے کو تو جوش کے عالم میں دونوں کہہ گئے۔ بعد جب غصہ فرو ہوا تو دونوں پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ یہ طلاق کی تو بہت بڑی ہوئی۔ رشید نے تمام علماء بغداد کو جمع کر کے اس مسئلہ کو پوچھا۔ سمجھو کہ غور کیا مگر کوئی ایسی صورت نہ بتا سکا کہ باہمی تعلق قائم رہ سکے۔ آخر رشید نے اہل دربار سے پوچھا کہ "امام ابو حنیفہ کے شاگردوں میں سے کوئی شخص نہیں ہے جو لوگوں نے عرض کیا "ہاں ابو یوسف نام ایک عالم ہیں مگر ان کی زندگی نہایت فقر و فاقہ کے ساتھ بسر ہوئی ہے۔" رشید نے کہا "مجھے ان کو علم و فضل سے فرض ہوا میری و غریبی سے کیا مطلب۔ فوراً ان کو دربار میں لے آؤ۔" لوگ گئے اور امام ابو یوسف کو محل سلطانی میں حاضر کیا۔ یہ پہلا روز تھا کہ اس امام عالی نشان کی شاہی دربار میں رسائی ہوئی۔ اس وقت محل میں تمام علماء اور علماء و فضلاء بغداد جمع تھے۔ جن علماء نے صدر کی جگہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے ابو یوسف کی تعظیم و تکریم بھی نہ کی۔ اور ان کی غربت نے یہ اثر کیا کہ کسی نے ان سے اتنا بھی نہ کہا کہ "ہاں آگے بیٹھے" یا چارے خلیفہ کو باد سلام کے اُسی وقت بیٹھ گئے جہاں جوتے اتارے جاتے تھے۔ اب رشید ان کی طرف متوجہ ہوا اور صورت مسئلہ بیان کر کے پوچھنے لگا کہ "آپ کے نزدیک اس مصیبت سے نجات پانے کی کوئی صورت کلی ہے؟" امام ابو یوسف نے کہا "ہاں میرے خیال میں اس مسئلہ کا کافی اور شافی جواب ہے۔ مگر جس دولت کے مقام پر بیٹھا ہوں یہاں بیٹھ کے اسکو نہ عرض کروں گا۔ اگر چہ جاننا ہوں کہ یہاں بیٹھنے سے میری لیاقت میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔ اور علیٰ ہذا القیاس صدر مقام پر بیٹھنے سے کچھ لیاقت زیادہ نہ ہو جائے گی۔ اور اس کا بھی مجھے کچھ طال نہیں کہ جو لوگ جس جگہ کے سحق نہ تھے وہ وہاں بیٹھے ہیں۔ مگر علم خدا کی نعمت ہر کسی قدر و منزلت کے برابر فرض ہے۔ یہ سن کے ہارون رشید نے ان کو نہایت تعظیم و تکریم سے صدر مقام میں بٹھایا۔ اور جواب طلب کیا۔ تمام علماء دربار حیرت و استعجاب سے اس کا ردی

کو دیکھ رہے تھے۔ امام ابو یوسفؒ صدر مقام پر بیٹھنے کے بعد بے ادبوں کی تنبیہ و تہدید کے لیے اور بھی بہت سے جملے کہے۔ اور خلیفہ سے کہا: "ان اب آپ صورت مسئلہ بیان کیجئے" رشید نے دوبارہ بیان کیا تو امام ابو یوسفؒ نے رشید سے پوچھا: "ایرلمو منین۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے کہ جب آپ نے کسی گنہگار سے شکایت کی تو اس کا قصہ کیا اُس وقت آپ کے دل میں خوف خدا اور ندامت تھی؟" رشید نے کہا: "بیشک۔ بلکہ یہ واقعہ مختلف نیچے بھی اس امر کی شہادت دے رہا ہے۔ اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا تو میں زبیدہ کی لونڈی سے کیوں سو سست مرد ہو جاتا۔" یہ سن کے امام مدوح نے کہا: "تو مجھے یقین آ گیا کہ آپ جنتی ہیں۔ لہذا طلاق بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ طلاق آپ کے جنتی ہونے کے ساتھ مشروط ہے۔" دیگر علماء حاضرین نے مخالفت کی اور کہا: "واہ! یہ کہاں سے ثابت ہے؟ اور آپ کو کیوں کر یقین ہو گیا کہ ایرلمو منین حکماً جنتی ہیں؟" امام ابو یوسفؒ نے کہا: "خلیفہ کے جنتی ہونے کا ثبوت خود قرآن مجید میں موجود ہے: **وَأَمَّا مَوْحَاةٌ فَتَقَارِصُهَا نَفْسٌ مِّنْهُنَّ لَهَا رَافِعَةٌ** یعنی جس نے خدا کے خوف سے اپنے نفس کو خواہش شیطانی سے باز رکھا جنت اُس کا عشرت کرہ ہوگی۔ سب لوگ حیرت میں رہ گئے۔ اور ہارون رشید کو یہ فتویٰ ایسا پسند آیا کہ اُس نے امام صاحب کو دولت سے مالا مال کر دیا۔ اور قاضی القضاۃ بغداد کے عہد سے یہ امور کر کے خلعت قضاہ حجت کیا خدام دربار نے واپسی کے وقت امام ابو یوسفؒ کو لباس فاخرہ چھایا۔ اور ایک عمدہ نفس میں بٹھا کے (جو اس عہد میں علماء مستند کی سواری تھی) رخصت کیا۔ امام ابو یوسفؒ جب اُس یہودی کے مکان پر پہنچے۔ حسب وعدہ اُس یہودی سے اسکی عمارت کھدوائی تو نفس اُن کے دروازے پر آئی۔

علامہ ابن خلکان نے امام ابو یوسفؒ کے شرف حضوری دربار سے ممتاز ہونے کی دوسری وجہ بیان کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ دار الخلافۃ بغداد کے کسی سردار نے ایک بار کسی امر سے باز رہنے کی قسم کھائی۔ اور اسکے بعد اُس سے اتفاقاً کوئی ایسا فعل سرزد ہوا کہ اپنی قسم کے ٹوٹ جانے کا شک ہو گیا۔ وہ مسئلہ پوچھنے کے لیے کسی فقیہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پھر ہاتھ لوگ اُسے امام ابو یوسفؒ کے پاس لے آئے۔ اُنھوں نے تمام حالات اور نوعیت مسئلہ سے مطلع ہو کر فرمایا: اس سے تیری قسم نہیں ٹوٹی۔ اس لیے کہ شک سے احکام مخرج پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کی زبان سے اپنی تمنا کے موافق یہ فتویٰ سن کر وہ ایسا

خوش ہوا کہ بہت سارے پیہ اور اسباب دولت ان کی نذر کیا۔ اور ایک عمدہ اور شاندار مکان بھی خرید کر کے امام صاحب ممدوح کے سپرد کیا۔ اب امام ابو یوسف کی زندگی ذرا اطمینان سے بسر ہونے لگی۔ چند روز بعد اتفاقاً وہ سردار فوج ہتھوں رشید کے پاس گیا۔ رشید اس وقت مغموم تھا۔ سردار نے سبب تفکر پوچھا تو کہنے لگا کہ ایک شرعی امر کی وجہ سے میں نہایت حیران ہوں کسی فقیہ اور مفتی کو لے آؤ تاکہ اُس سے دریافت کروں کہ کیا کیا جائے۔ اُس سردار نے امام ابو یوسف کو بلوا کے دربار میں پیش کیا۔ رسم سنوئے سلام کے بعد رشید نے امام ممدوح سے نام پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ میرا نام یعقوب ہے رشید نے پوچھا، اگر امام وقت کسی شخص کو خود زنا کی حالت میں مبتلا دیکھے تو کیا صرت رویت کی وجہ سے امام پر فرض ہے کہ اس پر حد شرع جاری کرے؟ امام صاحب نے کہا، نہیں، یہ سن کر رشید نے سجدہ کیا۔ اور سجدہ سے سر اٹھا کے دریافت کیا، سبب؟ آپ نے کس اصول پر یہ فتویٰ دیا؟ امام صاحب نے کہا، خود حضرت رسالت پناہ صلعم کے قول سے۔ آپ نے فرمایا ہے۔ اَوْسَرُ وَالْعَدَابُ الشَّيْهَاتِ۔ یعنی شبہ و شک کے حدود شرعیہ کو ساقط کر دو۔ رشید نے کہا، بیان کون سا شک؟ امام نے خود دیکھا اس کو تو یقین ہے، امام نے جواب دیا، ہم نے تسلیم کیا کہ امام نے خود دیکھ لیا۔ مگر اس رویت سے اُس کو صرت ذاتی علم حاصل ہو جائے گا۔ اور حدود الہی امام کے ذاتی علم پر نہیں منحصر ہیں۔ بلکہ اُن کے لیے حسب اصول شرعی شہادت چاہیے، یہ جواب کافی سن کر رشید نے پھر سجدہ کیا۔ اور اس کے بعد بہت کچھ مال و اسباب دے کے اس نے امام ابو یوسف کو امیر اور دولتمند بنا دیا۔

امام ابو یوسف کو دنیا نے اتنے دنوں تک اپنی نعمتوں کا شتاق رکھ کے کامیاب کیا تھا کہ وہ بہت جلد دنیا کی دلچسپیوں کے فریفتہ اور گردیدہ ہو گئے۔ اور سچ پوچھیے تو اُن کی لائف پر بھی ایک دہشتہ ہے جس کو اعتقاد چاہے کسی کے خیال میں نہ آنے دے۔ مگر اصل یہ ہے کہ رشید کی دربار داری اور دولت عباسیہ کے انعام و اکرام نے دل میں دولت کی طمع پیدا کر کے اُن کے قدم کو لغزش دے دی تھی۔ اگر کوئی کتب تواریخ میں ہونڈ کر تو بہت سے ایسے واقعات ملین گے جن سے صاف ثابت ہو جائے گا کہ امام ابو یوسف جہنمیت

ایک نقیصہ ایک عالم۔ ایک مفتی اور ایک عدالت عالیہ کے جج ہونے کے تو بہت بڑے بلکہ اول درجہ کے شخص ہیں۔ مگر یہ حیثیت ایک عابد زاهد متورع اور پیر ہنر گار یا بے نفس شخص کے انکار تہ بہت پیچھے ہے۔

جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ رشید کی نظر اپنے باپ مہدی کے حرم کی لونڈیوں میں سے کسی پر پڑ گئی۔ اور وہ اس قدمہ صاحب حسن و جمال اور پرپوش و حور تماشا تھی کہ ایک ہی نظر میں رشید اس کی نگاہ ناز کا شہید ہو گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اور جوش عشق زیادہ انتظار کی کسی طرح مہلت نہیں دیتا تھا۔ رشید نے اسی وقت امام ممدوح کو بلوایا امام صاحب سوئے سے اٹھائے گئے۔ اور درباری لباس سے آراستہ ہو کر حاضر دربار ہوئے۔ رشید نے ان کی صورت دیکھتے ہی صورت مسئلہ بیان کی اور کہا ”وہ لونڈی میرے حرم میں داخل ہو ناہین منظور کرتی اور کتنی بڑی عین خلیفہ مہدی (رشید کے باپ) سے ہم بستری ہو چکی ہوں“ امام ابو یوسف نے بحر اس خیال پر کہ عورت کی شہادت مستند نہیں اور اس کے سوا اور کوئی شاہد نہیں ہے۔ اس کو رشید پر حلال کر دیا۔ رشید بہت خوش ہوا۔ اور حکم دیا کہ ابھی آپ کو نہ رو جو اہر اور مال و دولت سے مالا مال کر دو۔ لوگوں نے تھوڑی دیر کے بعد آکے عرض کیا کہ شہر کے اکثر محلوں کے پھاٹک بند ہیں اس وجہ سے اس وقت خزانہ سے روپیہ نہیں نکل سکتا۔ یہ سن کے امام ابو یوسف نے فرمایا: ”ہاں میرے بلانے کے لیے دروازے کھلے ہوئے تھے اور روپیہ دینے کے وقت بند ہو گئے۔“

وہ خود فرماتے ہیں ایک مرتبہ شب کو میں خواب کے کپڑے پہنے پٹنگ پر لیٹا ہوا تھا کہ ناگهان کسی نے اس زور سے دروازہ دھدھایا کہ کان کے پردے اڑے جاتے تھے۔ میں نے لپک کے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ہرثمہ بن عین مکرے کہہ رہے ہیں آپ کو امیر المومنین نے بلایا ہے۔ اور اس قدر عجلت کی تا کہ گردی کر آپ جس طرح بیٹھے ہیں یوں ہیں چلے چلے۔ یہ سن کے میرے دل میں خوف پیدا ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ امیر المومنین مجھ کو غضبناک ہوں۔ ہرثمہ سے ہزار پوچھا مگر انھوں نے یہی کیا۔ مجھے بالکل خبر نہیں کہ آپ اس وقت کیوں بلائے جاتے ہیں؟ میں نے کہا: ”تو اچھا آپ اس وقت جا کے کوئی جملہ حوالہ کر دیجئے۔ مگر ہرثمہ نے ایک نامانی آخر مجبور ہو کے میں نے ہرثمہ سے غسل اور عطر و خوشبو لگانے کی اجازت مانگی۔ اور ان کے اجازت دینے کے بعد خوب پاک و صاف ہو کے

اور عطر لگا کے مین دل میں خوف کھاتا ہوا نکلا۔ در دولت پر پہونچا تو سرور خلافت کے خاص چوہدر کو ایک اضطراب کے ساتھ اپنا منتظر پایا مین ڈس سر بھی پوچھا کہ سویت مین کیوں بلایا گیا ہوں مرنے میں ہی جوابیہ مجھے مطلق خبر نہیں، عاجز آ کے مین نے پوچھا، اچھا یہ تو بتاؤ کہ امیر المومنین کے پاس اور کون کون ہے، سرور نے کہا، سوا عیسیٰ بن جعفر کے اور کوئی نہیں جو، الغرض سرور مجھے لے کے اندر گیا۔ وہاں مین نے دیکھا کہ امیر المومنین کی داہنی جانب عیسیٰ بن جعفر بیٹھ ہوئے ہیں اور امیر المومنین شفق میں میری آہٹ پاتے ہی امیر المومنین نے پکار کے پوچھا، کون، مین نے اپنا نام لیا، یعقوب، امیر المومنین نے بلایا اور مین نے اندر جا کے سلام کیا اور بیٹھ گیا۔ رشید نے کہا، میرا گمان ہے کہ اس وقت میرے بلانے سے آپ کے دل میں کسی قسم کا خوف پیدا ہوا ہو گا، مین نے کہا، حضور مجھ ہی پر کیا منحصر ہے میرے تمام متعلقین اور کل اہل خانہ بدحواس ہو رہے ہیں، یہ سن کے رشید کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا، آپ سمجھتے ہیں کہ مین نے آپ کو کیوں بلایا ہے، مین نے کہا، امیر المومنین مین کیا جانوں، رشید نے عیسیٰ کی طرف اشارہ کر کے کہا، مین نے صرف ان کے لیے آپ کو بلایا ہے، انھوں نے مجھے نہایت حیرن کر رکھا، ان کے پاس ایک لونڈی جو جس کو مین ان سے طلب کرتا ہوں کہتا ہوں چاہو میرے ہاتھ بیچ ڈالو۔ چاہو۔ مجھ پر ہبہ کر دو۔ بہر حال جس طرح ممکن ہو مجھے دیدو۔ مگر یہ کسی طرح نہیں مانتے اب مین آپ کے سامنے ان سے کہتا ہوں کہ اگر انھوں نے میری تمنا پوری کی تو پھر یہ طرح ان کی خبر لون گا، یہ سن کے مین عیسیٰ کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا، کیوں آپ کو کیا ہو گیا ہے جو آپ نہیں دیتے۔ لونڈی کون ایسی چیز ہے کہ امیر المومنین چاہیں اور اس کے دینے سے انکار کیا جائے۔ جس قدر روپیہ چاہوں اس کی قیمت مین لے سکتے ہو، عیسیٰ نے کہا، پہلے تو میری سن لیجیے پھر مجھے جب تک چاہیے گا۔ سمجھاتے رہیے گا۔ مین نے لونڈی کے سامنے قسم کھائی جو کہ اگر تجھے چوں یا کسی پر ہبہ کروں تو میری تمام جو روں پر طلاق ہو، میری انعام لونڈاں آزاد ہوں۔ اور میرا تمام مال غراب و مساکین پر صدقہ ہے اب آپ ہی بتائیے کہ کیوں ان مصائب سے نجات پاؤں عیسیٰ کی تقریر سن کے مجھے اپنے سمجھانے پر ایسی ندامت ہوئی کہ مین نے شرم سے سر جھکا لیا۔ امیر المومنین نے میری طرف متوجہ ہو کے کہا، جناب قاضی صاحب اس معاملہ میں اگر آپ ہماری چارہ جوئی کریں تو مین آپ کو اتنا مال و اسباب اور اتنی

دولت دون گا کہ آپ کے کل معصر آپ پر حمد کریں گے یہ سن کے مین نے کہا۔ تو مشکل ہی کیا ہے
 جناب عیسیٰ بن جعفر صاحب نصف جاریہ آپ امیر المومنین کے ہاتھ فروخت کر ڈالیے اور نصف امیر المومنین
 پر مہر کر دیجیے۔ قسم تو پوری یح یا پوری ہبہ کے لیے عارض ہے۔ نصف نصف کی صورت میں
 کوئی عہد آپ کے ذمہ قائم نہ ہو گا یہ سنتے ہی عیسیٰ نے کہا۔ اچھا۔ تو امام ابو یوسف صاحب آپ
 ہی کو گواہ کر کے مین کہتا ہوں کہ اس لونڈی کا نصف حصہ مین نے امیر المومنین پر مہر کیا اور
 نصف حصہ امیر المومنین کے ہاتھ پر ایک لاکھ دینار کے عادیہ مین فروخت کر ڈالا۔ رشیدہ مین کے
 بہت خوش ہوا۔ اور میل شکر یہ ادا کرتے کرتے کچھ ساکت ہو کے بولا۔ جناب قاضی صاحب اب
 تو ایک اور مصیبت لاحق ہوئی۔ مجھ میں مفارقت کی طاقت نہیں ہے۔ سب کچھ ہوا۔ اب یا ستم
 کا ایک مہینہ کس کے کاٹے کاٹے گا۔ مجھ سے یہ ہو سکے گا۔ کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ اس وقت
 سے بھی نجات ملے۔ مین تو آج ہی رات کو ہم بستر ہوا چاہوں۔ قاضی ابو یوسف فرماتے
 ہیں مین نے کہا۔ ہاں یہ بھی ممکن ہے۔ اب یہ لونڈی نصف بوجہ مہر اور نصف بوجہ شہر لپوری
 آپ کی ہو چکی۔ آپ اس کو آزاد کر کے اسی وقت اس کے ساتھ کاح کر لیجیے۔ الغرض یہی ہوا۔ اور جو مین
 نے اس صحبت میں خطہ کاح لپوریا اور مین ہزار دینار اس لونڈی کا مہر قرار کیا رشیدہ نے اسی وقت مہر کو بولا کہ
 مین ہزار دینار بابتہ ہر اس لونڈی کو دیے اور حکم دیا کہ تیس ہزار دینار مین خلعت کران بھاقاضی صاحب کو مکان میں پہنچاؤ۔
 شہر مہر بن ولید کہتا ہے کہ صبح کو مین نے قاضی ابو یوسف سے کہا اس دولت مین
 سے کچھ مجھے بھی دیجیے کہ آپ کے حق میں دعا سے خیر کروں۔ اُنھوں نے اس کا دسواں
 حصہ مجھے دیا۔ مین ہنوز رُآن کو دعا ہی دے رہا تھا کہ ایک بوڑھیا آئی اور قاضی صاحب
 سے کہنے لگی۔ مجھے اُس لونڈی نے بھیجا ہے اور یہ دس ہزار دینار آپ کو دیے ہیں۔ اور تہا
 عجز دلحاح کے ساتھ عرض کیا ہے کہ مجھے امیر المومنین نے بابت مہر مین ہزار دینار دیے
 تھے اُن مین سے نصف مین آپ کی نذر کرتی ہوں اور نصف ہی حلیت بنھانے کے لیے مین نے رکھ
 لیے ہیں۔ یہ پیغام سنتے ہی قاضی ابو یوسف نے بہت بگڑ کے کہا۔ اُس سے کہہ نیا کل تک
 تو ایک ادنیٰ اور دلیل لونڈی تھی۔ مین نے مجھے کل اس مرتبہ کو پہنچا دیا کہ آج تو
 امیر المومنین ہر مین رشیدہ کی ناز آفرین حضور اور بیوی ہے اُس کا صلہ یہ ہے۔ جاؤ
 لیجاؤ مین نہ لون گا۔ بس میرا اسی قدر حق تھا۔ وہ بڑھیا ہاتھ جوڑ کے خوشامد کرنے لگی
 اور مین نے بھی بہت کچھ سمجھایا تو اُنھوں نے قبول کیا۔ اور اُس مین سبھی نصف کو مجھ کو دیا۔

اس سے بھی زیادہ لطف کی یہ بات کہ ایک مرتبہ زبیدہ خاتون نے قاضی صاحب کے پاس اپنی خواص کو بھیج کے ایک مسئلہ دریافت کیا اور کہلا بھیجا کہ میں جواب بھی اپنی مرضی کے موافق چاہتی ہوں۔ قاضی صاحب نے شرعی حیلوں سے کام لے کے ویسا ہی فتویٰ دیا۔ زبیدہ نے خوش ہو کے بطور نذرانہ کے امام صاحب کی خدمت میں ایک چاندی کا ڈبہ بھیجا جس میں تہ درتہ ڈبے ہی رکھے تھے۔ اور ہر ڈبے میں کوئی نہ کوئی روح افزا خوشبو تھی اس کے علاوہ ایک جام روانہ کیا جس میں کنارے کنارے تو خوں بھری ہوئے تھے۔ درہم چنے ہوئے تھے اور زنج میں بہت سے دنیا رہے ہوئے تھے۔ یہ تحفہ جس وقت قاضی ابویوسف کے پاس آیا اُس وقت اُن کی صحبت میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے مذاقاً کہا: "رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا ہر مَن اُھل بیت لہ ہند فجلست الیہ شکر کا لہ فیکھا یعنی جو کوئی کسی صحبت میں ہو اور اس وقت اُس کے پاس کوئی ہدیہ آئے تو جو لوگ شریک صحبت ہوں اُن کا بھی اُس میں حصہ ہو لہذا اس میں سو کچھ یاروں کو بھی دلوائیے" قاضی صاحب نے جواب دیا: "بجا ہر جناب اس حدیث کا شان نزول وہ زمانہ تھا جب تحفہ اور ہدیہ میں چھو بارے اور دودھ آیا کرتا تھا۔ آج کل جبکہ سونا چاندی تحفوں میں آیا کرتا ہے۔ اس حدیث پر عمل نہیں ہو سکتا۔"

اسی طرح یہ بھی مشہور ہے کہ ایک مرتبہ رشید اور زبیدہ میں اس امر پر جھگڑا ہوا کہ فالودہ اچھا ہوتا ہے یا لوزینہ۔ کسی طرح فیصلہ نہ ہو سکا تو انفصال کے لیے قاضی ابویوسف صاحب طلب کیے گئے۔ قاضی صاحب آئے تو رشید نے واقعہ بیان کیا اور پوچھا کہ آپ کے نزدیک کس کو ترجیح ہے۔ امام ابویوسف کے سامنے یہ نہایت نازک بات تھی اس لیے کہ ان دونوں مخاصمین میں سے ان کو کسی کی مخالفت گوارانہ تھی انھوں نے کہا: "ایرالمومنین میں دونوں فیصلہ کر سکتا۔ وہ دونوں غذائیں جو باہم ترجیح کا دعویٰ کرتی ہیں سامنے لا کے رکھی جائیں اور میں اُن کو چکھوں تو کہوں کہ کس کو ترجیح ہے" فوراً دونوں چیزیں سامنے لا کے رکھ دی گئیں۔ اور قاضی صاحب کھانے لگے اور آخر بالکل کھا گئے۔ رشید نے کہا: "جن دونوں میں جھگڑا تھا وہ نادر دہو گئے مگر فیصلہ ابھی تک نہیں ہوا" قاضی صاحب نے کہا: "بات یہ ہے کہ ان دونوں میں کچھ ایسے لطف اور ایسی لچبیلیاں ہیں کہ جس کی صورت دیکھ لیتا ہوں اُسکی مخالفت کرنے کو جی نہیں چاہتا"

آہ ایہ سب باتیں نظر میں اُن غرضوں کی جن کے خوف سے امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ علیہ نے خلیفہ ابو جعفر منصور کے عہد میں عہدہ قضا سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اور بادشاہ وقت کا عتاب گوارا کر لیا تھا۔ واقعی امام ابو حنیفہ ۲ عجیب دل و عجیب رکت و کاماں تھیں ان کی احتیاط اور اُن کے زہد و ورع کو پہونچنا بہت دشوار ہے۔

اس کے ثبوت میں خود امام ابو یوسف کا یہ واقعہ کافی ہے کہ رشید کو جب قاضی صاحب سے بہت انس ہو گیا۔ اور یہ اُس کے دربار میں اکثر رہنے لگے تو ایک بار رشید ان سے کہنے لگا۔ قاضی صاحب آج یہیں ٹھہریے۔ آپ کو ایک نئی چیز کھلائی جائے گی۔ آج ایسی چیز بخوائی گئی ہے جو میرے باورچی خانے میں بھی بوجہ زیادہ مکلفات کے اتفاقاً کبھی کبھی نہ جاتی ہے۔ قاضی صاحب نے دریافت کیا کہ "امیر المومنین۔ ایسی وہ کون جیسے ہے؟" رشید نے کہا "فالودہ جو روغن پستہ کے ساتھ ملا کر کھایا جائے گا۔ یہ سنتے ہی قاضی ابو یوسف کو ہنسی آگئی۔ رشید نے پوچھا تو انھوں نے اپنا تمام ابتدائی حال اور خاص وہ وقت جب اُن کی والدہ نے امام علیہ السلام کی خدمت میں درشت زبانی کی تھی اور انھوں نے فرمایا تھا کہ "تیرا لڑکا ظاہر میں تو میرے سامنے بیٹھا درس لے رہا ہے۔ مگر اصل میں وہ فالودہ کو روغن پستہ کے ساتھ ملا کر کھا رہا ہے" بیان کر دیا۔ یہ سن کر رشید کو حیرت ہو گئی۔ اور اس صحبت میں سب نے صدق دل سے اعتراف کر لیا کہ واقعی امام ابو حنیفہ کی دل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اسی دروازہ سے اسی صحبت میں رشید کو امام ابو یوسف کے اصلی حالات اور اُن کی ایام طفولیت کی سرگزشت سے اطلاع ہوئی اور اُس نے نہایت تعجب سے امام محمد ورح کی صورت دیکھی کہ وہ قسمت انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ اور علم اُسے کہاں سے کہاں پہونچا۔ ہے۔

باد جو دران سب باتوں کے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ امام محمد ورح انشان نے کبھی طمع دنیا و مافیہا سے اصول اسلامیہ کے خلاف کیا۔ جو واقعات بیان کیے گئے ان میں صرف ان کا اجتہاد تھا اور یقیناً مفتی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہ اس پالیسی کے لوگوں میں تھے جو دنیا کو شرع کے بڑا ہوتا شکنجہ میں نہیں کسنا چاہتے۔ کسی نہ کسی طرح شرعی حجت پیدا کر کے وہ لوگوں پر آزادی کا دروازہ کھول دیا کرتے تھے۔ اور شاید یہ وہ پالیسی تھی جس کی ضرورت اب تیرہ سو برس کے بعد لوگوں کو معلوم ہوتی جاتی ہے۔ مگر باعتبار خدا ترسی اور حق جوئی کے اُن کا

رتبہ بیشک اعلیٰ درجہ کے لوگوں میں ہے چنانچہ مشہور ہے کہ ایک مرتبہ رشید نے قاضی صاحب سے شکایت کی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے پھرتے ہیں جو کوئی آپ کے سامنے شہادت دینے آئے گا وہ جھوٹا اور بنایا ہوا گواہ ہو گا۔ امام صاحب نے فرمایا بیشک میں نے کہا۔ اور اب بھی کہتا ہوں۔ دنیا میں تین ہی طرح کے آدمی ہیں۔ یا تو وہ لوگ جو بدکاری میں مشہور ہیں۔ یا وہ لوگ جو اعلیٰ درجے کے پاکباز خدا پرست اور عابد و زاہد ہیں۔ یا وہ جو باطن میں بدکار و بد معاش اور ظاہر میں نیک اور صلاح کار ہیں۔ پہلے اپنی شہرت بدکاری کی وجہ سے میسر سے سامنے نہ آئیں گے۔ دوسری قسم کے لوگ اپنے زہد و ورع کی وجہ کے باعث ہم سے دنیا داروں سے پرہیز کریں گے۔ صرف تیسری قسم کے لوگ رہ گئے۔ پھر وہ ظاہر میں چاہے کتنے بڑے نیکو کار ہوں باطن میں ضرور جھوٹے اور دغا باز ہوں گے۔ رشید نے مسکرا کر کہا۔ بیشک آپ بخاطر امانت ہیں۔ اور آپ کا انداز نہایت ہی ٹھیک ہے۔

بلکہ اس سے بھی زیادہ ثبوت اس امام عالی مقام کی خدا ترسی کا اس روایت سے ہوتا ہے جو حسن بن سماعہ نے بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ امام ابو یوسف نے جس روز انتقال فرمایا ہر اسی روز بار بار اُن کی زبان پر یہ کلمات جاری تھے: **اللَّهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ اَنِّي لَمْ اَجْزِئُ بِحُكْمِكَ فِيهِ بَيْنٌ اَشْتَكِي مِنْ عِبَادِكَ تَعَمُّدًا اَوْ لَقْدًا اَجْهَدْتُ فِي الْحُكْمِ بِمَا وَفَّقَ كُنَا لَكَ وَسُنَّةُ نَبِيِّكَ وَكَلِمَةُ اَنْتَ عَلَى حَقٍّ اَبَا حَنِيفَةَ بَنِي وَبَنِيكَ وَكَانَ عِنْدَايَ وَاللَّهِ مَعِي يَعْرِفُ اَمْرَكَ وَلَا يَخْفَا عَنْ اَلْحَيِّ وَهُوَ يَحْكُمُ**۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بار الہا تو خوب جانتا ہے کہ تیرے دو بندوں میں میں نے دیدہ دانستہ کبھی خلاف حق اور ناجائز فیصلہ نہیں کیا۔ اور میں نے جب فیصلہ کیا تو وہی جو موافق تیری کتاب مقدس اور تیرے رسول اکرم کے فرمانے کے ہو جب ہوا۔ اور مجھ پر جب کوئی شکل آپڑی تو میں نے اپنے اور تیرے درمیان میں ابو حنیفہ کو قرار دیا۔ اور ابو حنیفہ قسم ہے خدا کی میرے نزدیک اُن لوگوں میں تھے جو تیرے حکم کو جانتے تھے اور دیدہ دانستہ جادہ حق سے قدم باہر نہیں نکالتے تھے۔

امام ابو یوسف آخر عمر تک بغداد کے قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس رہے۔ ایام قضا ہی میں قضا کے الٹی نے انھیں پیام مرگ سنایا۔ اور جمعرات کے روز

ماہ ربیع الثانی ۱۱۷۵ھ میں سفر آخرت کیا۔ خدا مغفرت کرے وہ ایسے شخص تھے جن کی برکتوں نے دنیا کو بہت اچھے اصول پر قائم کر دیا۔ اور ایسے اصول جو قیامت تک اُن کی اعلیٰ یادگار کے طور پر باقی رہیں گے۔ اُن کے صاحبزادے یوسف ان کی زندگی ہی میں جانب غربی بغداد کے قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ جنھوں نے دس برس بعد سلسلہ ہجری میں انتقال فرمایا۔

امام ابو یوسف اول شخص ہیں جن نے فقہ حنفیہ میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ قائم کیا۔ اُن کی کتاب المال والنفقہ مشہور ہے جس کی حقیقتاً بنا حرز جان سمجھ کے تعظیم کریں تو زیارہ۔ چند اور بھی باتیں ہیں جن کی ابتدا امام مرحوم ہی کے زمانے سے شروع ہوئی اسلام میں پہلے پہل قاضی القضاۃ کا لفظ بہ حیثیت خطاب انھیں کے لیے ایجاد کیا گیا تھا۔ عوام اور علما کے لباس میں ایک خاص امتیاز بھی انھیں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ان سے پہلے سب کی ایک ہی وضع تھی۔ انھوں نے علما کے لیے طیلسان ایجاد کیا۔

امام ممدوح کے بعض جملے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ فرماتے ہیں صُحْبَةُ مَنْ لَمْ يَحْشَى الْعَارَ لَكُمْ الْقِيَمَةُ جس میں شرم و حیا نہ ہو اس کی صحبت پر قیامت کے روز مرخص کو شرم آئے گی۔ اور فرماتے ہیں "رُؤْيُ النِّعَمِ ثَلَاثَةٌ أَوَّلُهَا نِعْمَةُ الْإِسْلَامِ الثَّانِيَةُ نِعْمَةُ الْإِيمَانِ الثَّالِثَةُ نِعْمَةُ الْعَالِيَةِ الَّتِي لَا تَقْبَلُ الْمَحْوَةَ إِلَّا بِهَا" وَالثَّلَاثَةُ نِعْمَةُ الْغِنَى الَّتِي لَا تَنْتَمِي إِلَّا لِلْغِنَى الْكَافِيَةِ" یعنی سب سے بڑی تین نعمتیں ہیں پہلی نعمت اسلام کہ بغیر اُس کے کوئی نعمت پوری نہیں ہو سکتی۔ دوسری نعمت صحبت کہ بغیر اسکے زندگی کا مزہ نہیں مل سکتا۔ تیسری نعمت دولت کہ بغیر اسکے کبھی پورا عیش نہیں چل سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امام ابو یوسف کا یہ جملہ اُن کی زندگی اور اُن کی پالیسی کا سچا مظہر ہے۔ گویا اسی کو انھوں نے اپنا اصول قرار دے لیا تھا۔

ابتداءً امام مرحوم کی قبر کا پتہ نہیں معلوم تھا مگر ہر الریعیہ میں لکھا ہوا کہ شاہ سلیمان صفوی کے عہد ۱۰۷۵ھ میں روضۂ مطہرہ امین کا طین علیہا السلام کے قریب کسی ضرورت سے زمین کھودی گئی تو ایک قبر نمایان ہوئی جس پر ایک پتھر لگا تھا اور اس پتھر میں فارسی ابو یوسف کا نام و نشان آتا تھا اس قبر پر ایک عمارت بنا دی گئی۔ اور وہی قبر اب امام ممدوح کی خیال جاتی ہے۔

اسلامی دنیا میں یوں تو بہت بڑے بڑے صاحب ثروت و حکومت علماء ہوں
ہیں مگر امام ابو یوسف میں یہ ایک ایسی بات ہو کہ وہ علمائے کم نظر آئے گی یعنی باعتبار
دولت وہ اپنے عصر کے تمام علماء سے زیادہ صاحب ثروت تھے اور باعتبار حکومت
خیال کیجئے تو ساری دنیا کے اسلام ان کے قبضہ میں تھی۔ ابو یوسف کے ترکہ میں صرف چار
ہزار جاے ایسے تھے جن میں سے ہر ایک کے بند پر ایک ایک اشرفی بندھی ہوئی تھی۔
خلاصہ یہ کہ وہ ایک ایسے عالم تھے جن کو خدا نے ہر طرح کا سیاب کیا۔ اور وہ فقہی
امام عظیم علیہ الرحمۃ کے ایسے امام کے لیے ایسے ہی شاگرد کی ضرورت تھی۔

ابو یوسف

تقریباً صدہا۔ اس نام کی ایک نفیس کتاب ہمارے پاس بغرض ریو یو آئی ہے جس کے مصنف ہمارے
عصر میں ^{۱۸} ^{۱۹} ^{۲۰} ^{۲۱} ^{۲۲} ^{۲۳} ^{۲۴} ^{۲۵} ^{۲۶} ^{۲۷} ^{۲۸} ^{۲۹} ^{۳۰} ^{۳۱} ^{۳۲} ^{۳۳} ^{۳۴} ^{۳۵} ^{۳۶} ^{۳۷} ^{۳۸} ^{۳۹} ^{۴۰} ^{۴۱} ^{۴۲} ^{۴۳} ^{۴۴} ^{۴۵} ^{۴۶} ^{۴۷} ^{۴۸} ^{۴۹} ^{۵۰} ^{۵۱} ^{۵۲} ^{۵۳} ^{۵۴} ^{۵۵} ^{۵۶} ^{۵۷} ^{۵۸} ^{۵۹} ^{۶۰} ^{۶۱} ^{۶۲} ^{۶۳} ^{۶۴} ^{۶۵} ^{۶۶} ^{۶۷} ^{۶۸} ^{۶۹} ^{۷۰} ^{۷۱} ^{۷۲} ^{۷۳} ^{۷۴} ^{۷۵} ^{۷۶} ^{۷۷} ^{۷۸} ^{۷۹} ^{۸۰} ^{۸۱} ^{۸۲} ^{۸۳} ^{۸۴} ^{۸۵} ^{۸۶} ^{۸۷} ^{۸۸} ^{۸۹} ^{۹۰} ^{۹۱} ^{۹۲} ^{۹۳} ^{۹۴} ^{۹۵} ^{۹۶} ^{۹۷} ^{۹۸} ^{۹۹} ^{۱۰۰} ^{۱۰۱} ^{۱۰۲} ^{۱۰۳} ^{۱۰۴} ^{۱۰۵} ^{۱۰۶} ^{۱۰۷} ^{۱۰۸} ^{۱۰۹} ^{۱۱۰} ^{۱۱۱} ^{۱۱۲} ^{۱۱۳} ^{۱۱۴} ^{۱۱۵} ^{۱۱۶} ^{۱۱۷} ^{۱۱۸} ^{۱۱۹} ^{۱۲۰} ^{۱۲۱} ^{۱۲۲} ^{۱۲۳} ^{۱۲۴} ^{۱۲۵} ^{۱۲۶} ^{۱۲۷} ^{۱۲۸} ^{۱۲۹} ^{۱۳۰} ^{۱۳۱} ^{۱۳۲} ^{۱۳۳} ^{۱۳۴} ^{۱۳۵} ^{۱۳۶} ^{۱۳۷} ^{۱۳۸} ^{۱۳۹} ^{۱۴۰} ^{۱۴۱} ^{۱۴۲} ^{۱۴۳} ^{۱۴۴} ^{۱۴۵} ^{۱۴۶} ^{۱۴۷} ^{۱۴۸} ^{۱۴۹} ^{۱۵۰} ^{۱۵۱} ^{۱۵۲} ^{۱۵۳} ^{۱۵۴} ^{۱۵۵} ^{۱۵۶} ^{۱۵۷} ^{۱۵۸} ^{۱۵۹} ^{۱۶۰} ^{۱۶۱} ^{۱۶۲} ^{۱۶۳} ^{۱۶۴} ^{۱۶۵} ^{۱۶۶} ^{۱۶۷} ^{۱۶۸} ^{۱۶۹} ^{۱۷۰} ^{۱۷۱} ^{۱۷۲} ^{۱۷۳} ^{۱۷۴} ^{۱۷۵} ^{۱۷۶} ^{۱۷۷} ^{۱۷۸} ^{۱۷۹} ^{۱۸۰} ^{۱۸۱} ^{۱۸۲} ^{۱۸۳} ^{۱۸۴} ^{۱۸۵} ^{۱۸۶} ^{۱۸۷} ^{۱۸۸} ^{۱۸۹} ^{۱۹۰} ^{۱۹۱} ^{۱۹۲} ^{۱۹۳} ^{۱۹۴} ^{۱۹۵} ^{۱۹۶} ^{۱۹۷} ^{۱۹۸} ^{۱۹۹} ^{۲۰۰} ^{۲۰۱} ^{۲۰۲} ^{۲۰۳} ^{۲۰۴} ^{۲۰۵} ^{۲۰۶} ^{۲۰۷} ^{۲۰۸} ^{۲۰۹} ^{۲۱۰} ^{۲۱۱} ^{۲۱۲} ^{۲۱۳} ^{۲۱۴} ^{۲۱۵} ^{۲۱۶} ^{۲۱۷} ^{۲۱۸} ^{۲۱۹} ^{۲۲۰} ^{۲۲۱} ^{۲۲۲} ^{۲۲۳} ^{۲۲۴} ^{۲۲۵} ^{۲۲۶} ^{۲۲۷} ^{۲۲۸} ^{۲۲۹} ^{۲۳۰} ^{۲۳۱} ^{۲۳۲} ^{۲۳۳} ^{۲۳۴} ^{۲۳۵} ^{۲۳۶} ^{۲۳۷} ^{۲۳۸} ^{۲۳۹} ^{۲۴۰} ^{۲۴۱} ^{۲۴۲} ^{۲۴۳} ^{۲۴۴} ^{۲۴۵} ^{۲۴۶} ^{۲۴۷} ^{۲۴۸} ^{۲۴۹} ^{۲۵۰} ^{۲۵۱} ^{۲۵۲} ^{۲۵۳} ^{۲۵۴} ^{۲۵۵} ^{۲۵۶} ^{۲۵۷} ^{۲۵۸} ^{۲۵۹} ^{۲۶۰} ^{۲۶۱} ^{۲۶۲} ^{۲۶۳} ^{۲۶۴} ^{۲۶۵} ^{۲۶۶} ^{۲۶۷} ^{۲۶۸} ^{۲۶۹} ^{۲۷۰} ^{۲۷۱} ^{۲۷۲} ^{۲۷۳} ^{۲۷۴} ^{۲۷۵} ^{۲۷۶} ^{۲۷۷} ^{۲۷۸} ^{۲۷۹} ^{۲۸۰} ^{۲۸۱} ^{۲۸۲} ^{۲۸۳} ^{۲۸۴} ^{۲۸۵} ^{۲۸۶} ^{۲۸۷} ^{۲۸۸} ^{۲۸۹} ^{۲۹۰} ^{۲۹۱} ^{۲۹۲} ^{۲۹۳} ^{۲۹۴} ^{۲۹۵} ^{۲۹۶} ^{۲۹۷} ^{۲۹۸} ^{۲۹۹} ^{۳۰۰} ^{۳۰۱} ^{۳۰۲} ^{۳۰۳} ^{۳۰۴} ^{۳۰۵} ^{۳۰۶} ^{۳۰۷} ^{۳۰۸} ^{۳۰۹} ^{۳۱۰} ^{۳۱۱} ^{۳۱۲} ^{۳۱۳} ^{۳۱۴} ^{۳۱۵} ^{۳۱۶} ^{۳۱۷} ^{۳۱۸} ^{۳۱۹} ^{۳۲۰} ^{۳۲۱} ^{۳۲۲} ^{۳۲۳} ^{۳۲۴} ^{۳۲۵} ^{۳۲۶} ^{۳۲۷} ^{۳۲۸} ^{۳۲۹} ^{۳۳۰} ^{۳۳۱} ^{۳۳۲} ^{۳۳۳} ^{۳۳۴} ^{۳۳۵} ^{۳۳۶} ^{۳۳۷} ^{۳۳۸} ^{۳۳۹} ^{۳۴۰} ^{۳۴۱} ^{۳۴۲} ^{۳۴۳} ^{۳۴۴} ^{۳۴۵} ^{۳۴۶} ^{۳۴۷} ^{۳۴۸} ^{۳۴۹} ^{۳۵۰} ^{۳۵۱} ^{۳۵۲} ^{۳۵۳} ^{۳۵۴} ^{۳۵۵} ^{۳۵۶} ^{۳۵۷} ^{۳۵۸} ^{۳۵۹} ^{۳۶۰} ^{۳۶۱} ^{۳۶۲} ^{۳۶۳} ^{۳۶۴} ^{۳۶۵} ^{۳۶۶} ^{۳۶۷} ^{۳۶۸} ^{۳۶۹} ^{۳۷۰} ^{۳۷۱} ^{۳۷۲} ^{۳۷۳} ^{۳۷۴} ^{۳۷۵} ^{۳۷۶} ^{۳۷۷} ^{۳۷۸} ^{۳۷۹} ^{۳۸۰} ^{۳۸۱} ^{۳۸۲} ^{۳۸۳} ^{۳۸۴} ^{۳۸۵} ^{۳۸۶} ^{۳۸۷} ^{۳۸۸} ^{۳۸۹} ^{۳۹۰} ^{۳۹۱} ^{۳۹۲} ^{۳۹۳} ^{۳۹۴} ^{۳۹۵} ^{۳۹۶} ^{۳۹۷} ^{۳۹۸} ^{۳۹۹} ^{۴۰۰} ^{۴۰۱} ^{۴۰۲} ^{۴۰۳} ^{۴۰۴} ^{۴۰۵} ^{۴۰۶} ^{۴۰۷} ^{۴۰۸} ^{۴۰۹} ^{۴۱۰} ^{۴۱۱} ^{۴۱۲} ^{۴۱۳} ^{۴۱۴} ^{۴۱۵} ^{۴۱۶} ^{۴۱۷} ^{۴۱۸} ^{۴۱۹} ^{۴۲۰} ^{۴۲۱} ^{۴۲۲} ^{۴۲۳} ^{۴۲۴} ^{۴۲۵} ^{۴۲۶} ^{۴۲۷} ^{۴۲۸} ^{۴۲۹} ^{۴۳۰} ^{۴۳۱} ^{۴۳۲} ^{۴۳۳} ^{۴۳۴} ^{۴۳۵} ^{۴۳۶} ^{۴۳۷} ^{۴۳۸} ^{۴۳۹} ^{۴۴۰} ^{۴۴۱} ^{۴۴۲} ^{۴۴۳} ^{۴۴۴} ^{۴۴۵} ^{۴۴۶} ^{۴۴۷} ^{۴۴۸} ^{۴۴۹} ^{۴۵۰} ^{۴۵۱} ^{۴۵۲} ^{۴۵۳} ^{۴۵۴} ^{۴۵۵} ^{۴۵۶} ^{۴۵۷} ^{۴۵۸} ^{۴۵۹} ^{۴۶۰} ^{۴۶۱} ^{۴۶۲} ^{۴۶۳} ^{۴۶۴} ^{۴۶۵} ^{۴۶۶} ^{۴۶۷} ^{۴۶۸} ^{۴۶۹} ^{۴۷۰} ^{۴۷۱} ^{۴۷۲} ^{۴۷۳} ^{۴۷۴} ^{۴۷۵} ^{۴۷۶} ^{۴۷۷} ^{۴۷۸} ^{۴۷۹} ^{۴۸۰} ^{۴۸۱} ^{۴۸۲} ^{۴۸۳} ^{۴۸۴} ^{۴۸۵} ^{۴۸۶} ^{۴۸۷} ^{۴۸۸} ^{۴۸۹} ^{۴۹۰} ^{۴۹۱} ^{۴۹۲} ^{۴۹۳} ^{۴۹۴} ^{۴۹۵} ^{۴۹۶} ^{۴۹۷} ^{۴۹۸} ^{۴۹۹} ^{۵۰۰} ^{۵۰۱} ^{۵۰۲} ^{۵۰۳} ^{۵۰۴} ^{۵۰۵} ^{۵۰۶} ^{۵۰۷} ^{۵۰۸} ^{۵۰۹} ^{۵۱۰} ^{۵۱۱} ^{۵۱۲} ^{۵۱۳} ^{۵۱۴} ^{۵۱۵} ^{۵۱۶} ^{۵۱۷} ^{۵۱۸} ^{۵۱۹} ^{۵۲۰} ^{۵۲۱} ^{۵۲۲} ^{۵۲۳} ^{۵۲۴} ^{۵۲۵} ^{۵۲۶} ^{۵۲۷} ^{۵۲۸} ^{۵۲۹} ^{۵۳۰} ^{۵۳۱} ^{۵۳۲} ^{۵۳۳} ^{۵۳۴} ^{۵۳۵} ^{۵۳۶} ^{۵۳۷} ^{۵۳۸} ^{۵۳۹} ^{۵۴۰} ^{۵۴۱} ^{۵۴۲} ^{۵۴۳} ^{۵۴۴} ^{۵۴۵} ^{۵۴۶} ^{۵۴۷} ^{۵۴۸} ^{۵۴۹} ^{۵۵۰} ^{۵۵۱} ^{۵۵۲} ^{۵۵۳} ^{۵۵۴} ^{۵۵۵} ^{۵۵۶} ^{۵۵۷} ^{۵۵۸} ^{۵۵۹} ^{۵۶۰} ^{۵۶۱} ^{۵۶۲} ^{۵۶۳} ^{۵۶۴} ^{۵۶۵} ^{۵۶۶} ^{۵۶۷} ^{۵۶۸} ^{۵۶۹} ^{۵۷۰} ^{۵۷۱} ^{۵۷۲} ^{۵۷۳} ^{۵۷۴} ^{۵۷۵} ^{۵۷۶} ^{۵۷۷} ^{۵۷۸} ^{۵۷۹} ^{۵۸۰} ^{۵۸۱} ^{۵۸۲} ^{۵۸۳} ^{۵۸۴} ^{۵۸۵} ^{۵۸۶} ^{۵۸۷} ^{۵۸۸} ^{۵۸۹} ^{۵۹۰} ^{۵۹۱} ^{۵۹۲} ^{۵۹۳} ^{۵۹۴} ^{۵۹۵} ^{۵۹۶} ^{۵۹۷} ^{۵۹۸} ^{۵۹۹} ^{۶۰۰} ^{۶۰۱} ^{۶۰۲} ^{۶۰۳} ^{۶۰۴} ^{۶۰۵} ^{۶۰۶} ^{۶۰۷} ^{۶۰۸} ^{۶۰۹} ^{۶۱۰} ^{۶۱۱} ^{۶۱۲} ^{۶۱۳} ^{۶۱۴} ^{۶۱۵} ^{۶۱۶} ^{۶۱۷} ^{۶۱۸} ^{۶۱۹} ^{۶۲۰} ^{۶۲۱} ^{۶۲۲} ^{۶۲۳} ^{۶۲۴} ^{۶۲۵} ^{۶۲۶} ^{۶۲۷} ^{۶۲۸} ^{۶۲۹} ^{۶۳۰} ^{۶۳۱} ^{۶۳۲} ^{۶۳۳} ^{۶۳۴} ^{۶۳۵} ^{۶۳۶} ^{۶۳۷} ^{۶۳۸} ^{۶۳۹} ^{۶۴۰} ^{۶۴۱} ^{۶۴۲} ^{۶۴۳} ^{۶۴۴} ^{۶۴۵} ^{۶۴۶} ^{۶۴۷} ^{۶۴۸} ^{۶۴۹} ^{۶۵۰} ^{۶۵۱} ^{۶۵۲} ^{۶۵۳} ^{۶۵۴} ^{۶۵۵} ^{۶۵۶} ^{۶۵۷} ^{۶۵۸} ^{۶۵۹} ^{۶۶۰} ^{۶۶۱} ^{۶۶۲} ^{۶۶۳} ^{۶۶۴} ^{۶۶۵} ^{۶۶۶} ^{۶۶۷} ^{۶۶۸} ^{۶۶۹} ^{۶۷۰} ^{۶۷۱} ^{۶۷۲} ^{۶۷۳} ^{۶۷۴} ^{۶۷۵} ^{۶۷۶} ^{۶۷۷} ^{۶۷۸} ^{۶۷۹} ^{۶۸۰} ^{۶۸۱} ^{۶۸۲} ^{۶۸۳} ^{۶۸۴} ^{۶۸۵} ^{۶۸۶} ^{۶۸۷} ^{۶۸۸} ^{۶۸۹} ^{۶۹۰} ^{۶۹۱} ^{۶۹۲} ^{۶۹۳} ^{۶۹۴} ^{۶۹۵} ^{۶۹۶} ^{۶۹۷} ^{۶۹۸} ^{۶۹۹} ^{۷۰۰} ^{۷۰۱} ^{۷۰۲} ^{۷۰۳} ^{۷۰۴} ^{۷۰۵} ^{۷۰۶} ^{۷۰۷} ^{۷۰۸} ^{۷۰۹} ^{۷۱۰} ^{۷۱۱} ^{۷۱۲} ^{۷۱۳} ^{۷۱۴} ^{۷۱۵} ^{۷۱۶} ^{۷۱۷} ^{۷۱۸} ^{۷۱۹} ^{۷۲۰} ^{۷۲۱} ^{۷۲۲} ^{۷۲۳} ^{۷۲۴} ^{۷۲۵} ^{۷۲۶} ^{۷۲۷} ^{۷۲۸} ^{۷۲۹} ^{۷۳۰} ^{۷۳۱} ^{۷۳۲} ^{۷۳۳} ^{۷۳۴} ^{۷۳۵} ^{۷۳۶} ^{۷۳۷} ^{۷۳۸} ^{۷۳۹} ^{۷۴۰} ^{۷۴۱} ^{۷۴۲} ^{۷۴۳} ^{۷۴۴} ^{۷۴۵} ^{۷۴۶} ^{۷۴۷} ^{۷۴۸} ^{۷۴۹} ^{۷۵۰} ^{۷۵۱} ^{۷۵۲} ^{۷۵۳} ^{۷۵۴} ^{۷۵۵} ^{۷۵۶} ^{۷۵۷} ^{۷۵۸} ^{۷۵۹} ^{۷۶۰} ^{۷۶۱} ^{۷۶۲} ^{۷۶۳} ^{۷۶۴} ^{۷۶۵} ^{۷۶۶} ^{۷۶۷} ^{۷۶۸} ^{۷۶۹} ^{۷۷۰} ^{۷۷۱} ^{۷۷۲} ^{۷۷۳} ^{۷۷۴} ^{۷۷۵} ^{۷۷۶} ^{۷۷۷} ^{۷۷۸} ^{۷۷۹} ^{۷۸۰} ^{۷۸۱} ^{۷۸۲} ^{۷۸۳} ^{۷۸۴} ^{۷۸۵} ^{۷۸۶} ^{۷۸۷} ^{۷۸۸} ^{۷۸۹} ^{۷۹۰} ^{۷۹۱} ^{۷۹۲} ^{۷۹۳} ^{۷۹۴} ^{۷۹۵} ^{۷۹۶} ^{۷۹۷} ^{۷۹۸} ^{۷۹۹} ^{۸۰۰} ^{۸۰۱} ^{۸۰۲} ^{۸۰۳} ^{۸۰۴} ^{۸۰۵} ^{۸۰۶} ^{۸۰۷} ^{۸۰۸} ^{۸۰۹} ^{۸۱۰} ^{۸۱۱} ^{۸۱۲} ^{۸۱۳} ^{۸۱۴} ^{۸۱۵} ^{۸۱۶} ^{۸۱۷} ^{۸۱۸} ^{۸۱۹} ^{۸۲۰} ^{۸۲۱} ^{۸۲۲} ^{۸۲۳} ^{۸۲۴} ^{۸۲۵} ^{۸۲۶} ^{۸۲۷} ^{۸۲۸} ^{۸۲۹} ^{۸۳۰} ^{۸۳۱} ^{۸۳۲} ^{۸۳۳} ^{۸۳۴} ^{۸۳۵} ^{۸۳۶} ^{۸۳۷} ^{۸۳۸} ^{۸۳۹} ^{۸۴۰} ^{۸۴۱} ^{۸۴۲} ^{۸۴۳} ^{۸۴۴} ^{۸۴۵} ^{۸۴۶} ^{۸۴۷} ^{۸۴۸} ^{۸۴۹} ^{۸۵۰} ^{۸۵۱} ^{۸۵۲} ^{۸۵۳} ^{۸۵۴} ^{۸۵۵} ^{۸۵۶} ^{۸۵۷} ^{۸۵۸} ^{۸۵۹} ^{۸۶۰} ^{۸۶۱} ^{۸۶۲} ^{۸۶۳} ^{۸۶۴} ^{۸۶۵} ^{۸۶۶} ^{۸۶۷} ^{۸۶۸} ^{۸۶۹} ^{۸۷۰} ^{۸۷۱} ^{۸۷۲} ^{۸۷۳} ^{۸۷۴} ^{۸۷۵} ^{۸۷۶} ^{۸۷۷} ^{۸۷۸} ^{۸۷۹} ^{۸۸۰} ^{۸۸۱} ^{۸۸۲} ^{۸۸۳} ^{۸۸۴} ^{۸۸۵} ^{۸۸۶} ^{۸۸۷} ^{۸۸۸} ^{۸۸۹} ^{۸۹۰} ^{۸۹۱} ^{۸۹۲} ^{۸۹۳} ^{۸۹۴} ^{۸۹۵} ^{۸۹۶} ^{۸۹۷} ^{۸۹۸} ^{۸۹۹} ^{۹۰۰} ^{۹۰۱} ^{۹۰۲} ^{۹۰۳} ^{۹۰۴} ^{۹۰۵} ^{۹۰۶} ^{۹۰۷} ^{۹۰۸} ^{۹۰۹} ^{۹۱۰} ^{۹۱۱} ^{۹۱۲} ^{۹۱۳} ^{۹۱۴} ^{۹۱۵} ^{۹۱۶} ^{۹۱۷} ^{۹۱۸} ^{۹۱۹} ^{۹۲۰} ^{۹۲۱} ^{۹۲۲} ^{۹۲۳} ^{۹۲۴} ^{۹۲۵} ^{۹۲۶} ^{۹۲۷} ^{۹۲۸} ^{۹۲۹} ^{۹۳۰} ^{۹۳۱} ^{۹۳۲} ^{۹۳۳} ^{۹۳۴} ^{۹۳۵} ^{۹۳۶} ^{۹۳۷} ^{۹۳۸} ^{۹۳۹} ^{۹۴۰} ^{۹۴۱} ^{۹۴۲} ^{۹۴۳} ^{۹۴۴} ^{۹۴۵} ^{۹۴۶} ^{۹۴۷} ^{۹۴۸} ^{۹۴۹} ^{۹۵۰} ^{۹۵۱} ^{۹۵۲} ^{۹۵۳} ^{۹۵۴} ^{۹۵۵} ^{۹۵۶} ^{۹۵۷} ^{۹۵۸} ^{۹۵۹} ^{۹۶۰} ^{۹۶۱} ^{۹۶۲} ^{۹۶۳} ^{۹۶۴} ^{۹۶۵} ^{۹۶۶} ^{۹۶۷} ^{۹۶۸} ^{۹۶۹} ^{۹۷۰} ^{۹۷۱} ^{۹۷۲} ^{۹۷۳} ^{۹۷۴} ^{۹۷۵} ^{۹۷۶} ^{۹۷۷} ^{۹۷۸} ^{۹۷۹} ^{۹۸۰} ^{۹۸۱} ^{۹۸۲} ^{۹۸۳} ^{۹۸۴} ^{۹۸۵} ^{۹۸۶} ^{۹۸۷} ^{۹۸۸} ^{۹۸۹} ^{۹۹۰} ^{۹۹۱} ^{۹۹۲} ^{۹۹۳} ^{۹۹۴} ^{۹۹۵} ^{۹۹۶} ^{۹۹۷} ^{۹۹۸} ^{۹۹۹} ^{۱۰۰۰} ^{۱۰۰۱} ^{۱۰۰۲} ^{۱۰۰۳} ^{۱۰۰۴} ^{۱۰۰۵} ^{۱۰۰۶} ^{۱۰۰۷} ^{۱۰۰۸} ^{۱۰۰۹} ^{۱۰۱۰} ^{۱۰۱۱} ^{۱۰۱۲} ^{۱۰۱۳} ^{۱۰۱۴} ^{۱۰۱۵} ^{۱۰۱۶} ^{۱۰۱۷} ^{۱۰۱۸} ^{۱۰۱۹} ^{۱۰}



زندگی میں کامیابی کے واسطے قابلیت سے زیادہ سلیقے کی ضرورت ہے۔ جن لوگوں میں یہ مادہ خلقی نہیں ہے ان کو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ ان اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ لوگ کیا چاہتے ہیں کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اگر تم کو خوش کرنے کا موقع ملے تو اسے ہاتھ سے نہ دو۔ سب کے ساتھ خلق سے پیش آؤ۔ لیدر کی مانند ہو۔ کا مقولہ ہے کہ خلق کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا ہے۔ اور ہر چیز بے دام ہاتھ آجاتی ہے۔ واقعی یہ بات بہت صحیح ہے۔ خلق سے بے دام ایسی ایسی چیزیں ہاتھ آجاتی ہیں جو دوسروں سے نصیب نہیں ہو سکتیں۔ پس تمھاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ جس آدمی سے تمھاری ملاقات ہو جائے اس کو تم اپنا بنا لو۔ بڑے لے نے ملکہ الزبتھ کو یہ نصیحت کی کہ "لوگوں کے دل کو اپنا کر لو۔ پھر ان کے دل اور ان کا مال و متاع تمھارا ہی ہو جاوے گا۔"

سلیقے کو اکثر اس مقام پر بھی کامیابی حاصل ہوئی ہے جہاں کہ قوت کو ناکامی ہوئی ہو۔ لائی نے سورج اور ہوا کی پرانی کہانی کو یون نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ سورج اور ہوا میں یہ جھگڑا ہوا کہ دیکھیے کسے فتح پائی ہوئی ہے۔ اتفاقاً ایک شخص جا رہا تھا ہوائے یہ جا ہا کہ اس شخص کی عبا اتر والے پس اس نے بڑے زور و شور کے

لے بیڈی اٹلیا بھگتان کی ایک لائق اور مشہور مصنف تھی جس کی کتاب میں مشہور ہیں۔ اس خاتون کا اصلی نام الزبتھ اٹلیو تھا۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئی۔ اور سن ۱۹۰۷ء میں جام قبا پیا۔ ۱۹۰۷ء کے بعد کہ الزبتھ کے عہد کا ایک نامور عہدہ دار تھا۔ اور جس کے مشہور دن پر وہ مشہور ملکہ اکثر عمل کیا کرتی تھی۔ ۱۹۱۵ء کے قریب پیدا ہوا۔ اور ۱۹۱۶ء میں مرا۔

ساتھ چلتا شروع کیا۔ اور خوب خوب جھونکے مسافر کو لگے۔ لیکن جتنی ہی زور کے ساتھ
 بوا چلتی تھی اتنی ہی زیادہ عبا اسکے بدن میں چپٹی جاتی تھی تب سورج کو لگا کہ اب تم
 مجھے کوکش کرنے دو ادھر سورج نے اپنی کرنیں مسافر کے جب پر ڈالیں اور اسکے جسم کو گرم کرنا شروع کیا جس
 نتیجہ ہوا کہ اسکی گرمی جو مسافر کو پسینہ آگیا۔ اور اس نے نہ صرف اپنی عبا ہی اتار ڈالی بلکہ اپنا
 کوٹ بھی اتار کے پھینک دیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر ہوانے سورج کی فتح پائی کا اقرار کر لیا۔
 ہمیشہ یاد رکھو کہ آدمیوں کو زبردستی کسی طرف لیجانے سے رہبری کر کے لیجانا آسان
 ہے۔ اور ہر حالت میں رہنمائی کرنا مجبور کرنے سے بہتر ہے۔ شکستہ لکھتا ہے کہ تم اپنی مرضی کے
 موافق کام مسکراہٹ سے لے سکتے ہو۔ مگر تلوار سے نہیں لے سکتے۔ یہ شیریں زبانی و لطف
 و خوشی + توانی کہ پہلے ہوسے کشی +

موسیٰؑ کو اسی کہے ہوئے کسی
 ہمیشہ کو شمش کر و بلکہ اپنے تین اس قابل بناؤ کہ وہ لوگ
 جن کو تم سے ملنے کا اتفاق ہو تم پر پھر وہ اور اعتبار کریں بہت لوگوں کا اثر و اثرن پران کی قابلیت کو
 سوچیں بلکہ ان کو چال چلن کی وجہ سے پڑا ہے سڈنی اسمتھ نے فرنیس ہارنر
 کی بابت جس کا بغیر کسی بڑے حمد پر ممتاز ہونے کے ایک عجیب دباؤ قومی مجلس
 حکمرانی پر تھالیوں کہا ہے کہ "اس کی شکل میں دسوں احکام الہی کندہ تھے (یعنی انکی
 صورت ہی سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ان دسوں احکام الہی کا پابند ہو جو حضرت
 موسیٰ کو ملے تھے)

جس حد تک ایمان اور عقل کے ساتھ ممکن ہو لوگوں کی خواہشیں پوری کرنے کی کوشش کرو۔ لیکن "نہیں" کہنے سے نہ ڈرو۔

ہر ایک شخص "ہان" کہہ سکتا ہے۔ مگر ہر شخص خوشی کے ساتھ "ہان" نہیں کہہ سکتا۔ لیکن

”ہنن“ کہنا نہایت ہی دشوار ہے۔ بہت لوگ صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئے کہ ”ہنن“ نہ کر سکے۔
ملوٹ مارک نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ ایشیا مائنر کے باشندے محض اس وجہ سے

۱۔ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر جس کے ڈراما اور ناولک فضا میں بلاغت اور شاعری کی انتہائی کمال پر پائے جاتے ہیں اور انگریزوں کو خیال میں اُس سے بڑا شاعر دنیا میں نہیں پیدا ہوا۔ ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۳۳ء میں مرا۔

۲۔ تھوڈی انتہائی سنگت کا ایک مشہور اور عالی مرتبت مقتدا، دین اور انشیا پر آواز تھا۔ اس نے مین پیدا ہوا۔

۳۔ ۱۷۰۹ء میں مرا۔ اسے بلواریس یونان کا ایک نامی گرامی سورن جو جس نے شاہ مر کے سوا حکمرانی اور علم خلافت پر لکھا۔

۴۔ ۱۸۰۹ء میں جعفر زید بسیم کے قفر باہ ۴۰ برس بعد پیدا ہوئے اور بہت بوڑھے چاہو کے مرا۔

۱۰ بعد از رہا ہو گئے کہ ایک چوہر فی حفظ کو اپنی زبان سے نہ ادا کر سکے۔ اور وہ "نہین" کا لفظ تھا۔ اگر ہمارے ردِ ذمہ کے کاموں میں "نہین" کی بہت ضرورت ہے تو یہ بھی اُس سے کم ضروری نہیں ہے کہ ہم اسے خندہ پیشانی سے کہیں۔ یہ ہمیشہ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہر شخص جس سے ہمارا کچھ بھی برباد ہوا اپنے دل میں سمجھے کہ ہمارے ساتھ کاروبار کرنے میں اُسے خوشی ہوتی ہے۔ اور اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو جائے کہ وہ پھر ہمارے بیان آدے۔ جس قدر لوگ خیال کرتے ہیں اُس سے بدرجہا زیادہ علاقہ کاروبار تجارت کو حالات و جذبات انسانی سے ہے۔ ہر ایک شخص چاہتا ہے کہ ہمارے ساتھ مہربانی اور خلق کا برتاؤ ہو۔ سادگی اور نشاط کار برتاؤ اکثر اوقات معاملات کو اپنے موافق فیصلہ کر لیا کرتا ہے۔ بقابلہ اسکے کہ پچاس فی صدی کمیشن کا لالچ دیا جاوے۔

ہر شخص اگر چاہے تو اپنے تین خندہ پیشانی بنا سکتا ہے۔ خوش کرنے کی خواہش آدمیوں کو قریب قریب خندہ پیشانی بنا دیتی ہے۔ جس شخص کو کسی کے خوش کرنے کی خواہش نہ ہوگی وہ کسی کو خوش نہ کرے گا۔ ایسی عمدہ نعمت کو اگر تم لڑکپن سے نہ حاصل کر دو گے تو پھر بات تمہارے واسطے بہت مشکل ہو جائے گی۔ بہت سے آدمیوں کو اپنی زندگی میں ظاہری کامیابی محض اچھے برے اور چال چلن کے ہاتھوں نصیب ہوئی۔ نہ محض قابلیت کی وجہ سے بخلاف اس کے بہت سے قابلِ عزت آدمیوں نے جن کے دل نہایت ہی اچھے تھے اور جن کے داغ میں مہربانی کرنے کے خیال بھرے ہوئے تھے بہت سے لوگوں کو کج خلقی کی بدولت اپنا دشمن بنا لیا۔ علاوہ برین خوش کرنے کی قابلیت ہونا خود ہی ایک خوشی کی بات ہے۔ اس کی کوشش کرو اور تم کبھی مایوس نہ ہو گے۔

ہوشیار رہو اور مزاج میں آہستگی رکھو۔ تمہارا داغ رکھنا دیا ہی ضروری ہے جیسا کہ پر جوش دل خیر میں استقلال اور دیمے الفاظ بہت ہی بیش قیمت ہیں۔ ان باتوں سے تم خطرے اور مشکل کے وقت میں محفوظ رہو گے۔

اگر تم سے ایسے لوگوں سے ملاقات ہو جو تمہارے برابر ہوشیار نہ ہوں تو تمہیں ان کو حقارت سے دیکھنے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔ جیسے بڑی جائداد کے وارث ہونے میں کوئی فقر کا موقع نہیں ہے اسی طرح زیادہ دیافت کے وارث ہونے میں بھی کوئی ناز کرنے کا محل نہیں۔ دونوں حالتوں میں صرف اُن کا اچھی طرح استعمال کرنا قابلِ تریف ہے۔ علاوہ برین بعض

اوقات ایک شخص جیسا کہ ہرین نظر آتا ہے اصل میں اس سے زیادہ ہونا ہے۔ چال چلن دریافت کرنے میں آنکھ ہی بڑی رہنا ہے۔ امر سن کا قول ہے کہ جب آنکھیں ایک بات بتاتی ہیں اور زبان دوسری بات کہتی ہو تو دانا آدمی آنکھ ہی کی بات پر اعتبار کرتا ہے۔

ہر شخص کے یکم مزاج ہونے کا حد سے زیادہ اعتبار محض اُسکے کہنے یا اس کی بات پر نہ کرو۔ پہلی نظر میں نہ تو مرد مردوں سے محبت کرنے لگتے ہیں اور نہ عورتیں عورتوں سے۔ اگر کوئی اجنبی تم سے حد سے زیادہ محبت کا اقرار کرے اور بہت کچھ دکھائے تو تم اُسکی باتوں کا یقین وفاق نہ کرو۔ ممکن ہو کہ اس نے جھوٹ نہ کہا ہو تاہم شاید جتنا وہ کہتا ہے اتنا اس کا مطلب نہ ہو۔ یا شاید وہ شخص تم سے کوئی غرض رکھتا ہو۔ لہذا محض اس بنا پر کہ کوئی شخص دوستی کا اظہار کرتا ہے یہ یقین نہ کرو کہ وہ تمہارا دوست ہے اور نہ اس بات کو جلدی سے باور کرو کہ ظالم شخص مراد نہیں ہے۔

ہم اس بات پر باز کرتے ہیں کہ ہم خود اور ادراک رکھتے ہیں لیکن یہ فرض کر لینا کہ انسان ہمیشہ دراک و فہم کی ہدایت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بہت بڑی غلطی ہے۔ ہم ایک عجیب متضاد اور متلون مزاج مخلوق ہیں۔ زیادہ تر ایسا ہو گا کہ ہم اپنے جوش اور بدظنی کی ہدایت پر عمل کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تم لوگوں کو ان کے جذبات کا خیال رکھنے سے اپنا ساتھی بنا لو گے مگر ان کو قائل کر کے ایسا نہیں بنا سکتے۔

مباحثہ اور استدلال کسی قدر خطرناک ضرور ہے۔ اس سے اکثر خسر دگی اور کٹیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم بحث میں جیت جاؤ اور کسی دوست کو ہاتھ سے کھو دو مگر یہ اچھا سودا نہیں ہے۔ اگر تم کو بحث کرنا لازمی ہے تو تمہیں اس بات کا اختیار حاصل ہے جو چاہو مان لو۔ لیکن ہمیشہ اس بات کے ظاہر کرنے کی کوشش کرو کہ گویا کوئی نہ کوئی لفظ تم سے سہو ہو گیا ہے۔ بہت کم آدمیوں کو اس بات کا علم ہوتا ہے ہماری دلیل میں کس مقام پر زیادہ خرابی تھی۔ اور اگر اس بات کا علم ہو بھی جاتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتے۔ علاوہ برین اگر ان کو اپنے بار جانے کا علم بھی ہو جاوے تو اس سے یہ

۱۵ امر سن ایک مشہور اور مستند ادیب و دانشور تھے جس سے امریکہ کی نثر میں کوثر حاصل ہے۔
۱۶ سنہ ۱۹۰۶ء میں شہر بوسٹن میں پیدا ہوئے۔ اور گزشتہ صدی کے آخر میں مرا۔

نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ قائل بھی ہو گئے۔ اور اُن کو اطمینان بھی ہو گیا۔ شاید یہ کہنا
اسنا سبب ہو گا کہ کسی شخص کو دلیل سے قائل و مقول کرنے کی کوشش کرنا بے فائدہ ہے۔ اگرچہ
بیان یا اپنی فرض کو جہان تک ممکن ہو صاف اور اختصار کے ساتھ ادا کر دے۔ اور اگر تم نے اتنا
بھی کر لیا کہ اس شخص کو اپنی رائے پر جس قدر اعتقاد تھا وہ ڈنگا گیا تو بس یہ کافی ہے۔ اور اس
سے زیادہ امید تم کو نہ رکھنی چاہیے۔ اور یہی تمہاری کامیابی کا پہلا قدم ہے۔

بات چیت کرنا بجا سے خود ایک فن ہے۔ اور یہ لازمی بات نہیں ہے کہ جن
لوگوں کے پاس زیادہ مضمون ہوں وہی اچھے تقریر کرنے والے بھی ہوں۔ اگرچہ
لارڈ جسٹس فیلڈ کا یہ کہنا حد سے بڑھ جاتا ہے کہ پلٹنوں کے سرداروں میں بہت ہی
کم ہیں جو ڈیٹی کارٹ یا سر آئینہ کی نیوٹن سے بہتر رفیق صحبت نہ ہو سکتے ہوں۔
میں یہ نہیں کہتا کہ اچھا سننے والا ہونا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ اچھا مقرر ہونا۔

یہ بات یعنی اچھا سننے والا ہونا کسی طرح آسان نہیں ہے۔ اور قریب قریب اُسی قدر ضروری
ہے جس قدر کہ اچھا مقرر ہونا۔ جو کچھ کہا جائے اس کو کلمہ چینی کی نظر سے نہ دیکھو۔ اور
نہ اس نگاہ سے دیکھو کہ گو یا تم اس بات کی منصف قرار دیے گئے ہو۔ بلکہ اپنی رائے کو ملتوی
رکھو اور یہ کوشش کر دو کہ جو کچھ مقرر کے خیالات و جذبات ہیں اُن میں تم کو دخل ہوگا
اگر تم مہربان اور ہمدرد ہو گئے تو ان کے تمہاری اصلاح لی جائے گی۔ اور تم کو اس بات کی
خوشی حاصل ہو گی کہ تم سے لوگوں کو تکلیف اور تردد کی حالت میں مدد ملی۔ جب تک تم
نوجوان اس وقت تک اس بات کی بہت زیادہ امید نہ رکھو کہ لوگ تمہاری طرف زیادہ
متوجہ ہوں اور تمہارا خیال کریں۔ بیٹھو۔ سنو۔ اور دیکھتے رہو۔ یہ ایک مثل حرکت ہے جو لوگ
کنارے کھڑے ہوئے ہونے میں وہ تماشے کو خوب دیکھتے ہیں، جو کچھ ہو رہا ہو تم اسکو
بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ چاہے لوگ تم کو نہ دیکھیں اور تم سے خبر نہ ہوں۔ اس کو تم
ایسا ہی سمجھو کہ گو یا تم لوہا بآئینہ لگائے ہوئے ہو۔ تم سب کو دیکھتے ہو اور تمہیں کوئی
نہیں دیکھتا۔

اپنے سوچنے کی تکلیف سے بچنے کے لیے چونکہ لوگوں کو سوچنا ناگوار ہوتا ہے
لوگ تمہارا اندازہ اتنا ہی کر لیں گے جتنا کہ تم نے خود اندازہ کیا ہے۔ لہذا وہ سیر کا مقولہ
ہے کہ اس دنیا میں کوئی شخص اپنے تئیں جتنا بٹانا چاہتا ہے اس سے زیادہ نہیں بٹا سکتا۔

تم لوگوں کو اپنا دشمن نہ بنا لو۔ کیونکہ اس سے زیادہ بڑا کوئی بات نہیں ہے۔ ایک یوقون کو اس کی حماقت کے موافق جواب نہ دو۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی کے سے ہو جاؤ۔

یہ یاد رکھو کہ نرم جواب غصے کو دور کر دیتا ہے مصرعہ نبرد قزیرم لا تیخ تیز تاہم ایک غصہ کا جواب اتنی بڑی حماقت نہیں جتنا کہ طنز یہ جواب دینا ہے۔ نوے فی صدی آدمی گالی اور حشر کا اتنا بڑا نہایت گے جتنا کہ ان کو بنایا جانا اور ان پر ہنسا جانا گوارا ہو گا۔ وہ سوائے نصیحت کے اور ہر بات کو جلدی بھول جا دیں گے۔

لوگوں کو دھوکے میں رہنا نہ بلوہ خوش آتا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ کسی دھوکے سے نکل جائیں۔ طر ایسلوس نام ایک اٹھنہ کار ہنر والا اتفاقاً مجنون ہو گیا اور اس کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جتنے جہاز سیرکیس میں ہیں وہ سب میرے ہی ہیں نہ پھر جب وہ کریٹو کے علاج سے اچھا ہو گیا تو اس نے کریٹو سے اس بات کی بڑی شکایت کی کہ میں لٹ گیا۔ لارڈ جسٹر فیلڈ کا قول ہے کہ ایک دوست کو مذاق کے واسطے کھو دینا بڑی حماقت ہے۔ لیکن ہر نزدک ایک اچھے لفظ کے نہ استعمال کرنے کی وجہ سے بھی کسی شخص کو اپنا دشمن بنالینا کسی طرح اس سے کم درجے کی یوقونی نہیں ہے۔

جلدی سے اپنے دل میں اس شک کو جگہ نہ دے دو کہ تمہاری توہین کی گئی اور نہ یہ خیال کرو کہ تم ہی ہنسے گئے۔ اس کتاب اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے: ”مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں نے میرے ہی بابت کچھ کہا کیونکہ وہ اس قدر ہنسے کہ ہنسے ہنسے بے دم ہو گئے۔“ بخلاف اس کے اگر تم ہنسے جاؤ تو تمہاری کوشش یہ ہوتی چاہیے کہ تم اس ہنسے پر غالب آ جاؤ اگر تم لوگوں کے ساتھ خود بھی اپنے اوپر ہنسو گے تو بالآخر ہنسے ہی باقی رہے گا۔ اور تم بجائے نقصان کے فائدے ہی میں رہو گے۔ ہر ایک شخص ایسے آدمی کو پسند کرتا ہے جو کہ اپنے اوپر فقرہ کہے جائے

۱۔ اس یونانی حکیم کے حالات میں نہیں معلوم ہو سکے اور نہ اس کے حالات معلوم ہو سکے جس کا نام آیا ہے۔

کا ہوا نہیں مانتا بلکہ ہنستا ہوا اور انصاف کی بات ہی ہر کہ اس سے اس کی خوش مزاجی اور خوش
فہمی معلوم ہوتی ہے۔ اگر تم اپنے اوپر خود ہنسو گے تو اور لوگ تم پر نہ ہنسیں گے۔

تم کو اپنی رائے پر قائم رہنے کی ہمت رکھنی چاہیے تم کو یہ پہلے سے سمجھ لینا چاہیے
کہ اکثر لوگ تم کو ہنسیں گے۔ جب تم ایسے ہو جاؤ گے تب تم کو کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ جسے
تم ہو لوگوں کی نظروں میں دیا یہاں معلوم ہونا کوئی نصیحت کی بات نہیں۔ ہاں یہ البتہ جنگ
کے قابل بات ہے کہ جتنے تم حقیقتاً نہیں ہو اپنے تئیں اتنا بنانے یا دکھاتے ہو بہت لوگ بعض
وقت محض خیالی شکایت کے سبب سے اپنے آپ کو آزار پہنچاتے اور دوسروں سے ناراض
اور افسردہ دل ہو جاتے ہیں۔

لوگوں سے صاف رہو۔ مگر اپنے تئیں ذرا لیے رہو۔ اپنے متعلق بہت زیادہ
باتیں نہ کرو۔ تمہاری باتیں نہ اپنی نہ اپنے لیے اور نہ اپنے خلاف ہوں۔ بلکہ معمول رکھو کہ
اور لوگوں کو جتنا وہ اپنی بات کہنا چاہیں کہہ لینے دو۔ اگر وہ اپنے متعلق باتیں کرتے ہوں
تو تم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اُس کو پسند کرتے ہیں۔ پس اگر تم اُن کی باتوں کو خوشی سے
سنو گے تو اُن لوگوں کا خیال تمہاری نسبت اور بھی زیادہ اچھا ہو جائے گا۔ کیونکہ
تم نے ان کی باتیں سن لین تھیں یہ نہ چاہیے کہ اس بات کو ظاہر کرو کہ تم اُس شخص کو بے وقوف
یا موٹی عقل کا سمجھتے ہو۔ (لیکن ہاں اگر یہ ظاہر کرنا تمہارا فرض ہو تو مجبوراً ہی ہے) اگر تم نے
ایسا کیا تو اُسکو بیشک شکایت کا موقع ہو گا۔

مکن ہر کہ تمہاری رائے غلطی پر ہو۔ اور اگر ایسا ہوا تو وہ شخص تمہاری نسبت بھی
وہی رائے قائم کرے گا جو تم نے اُس کی نسبت قائم کی تھی۔

ہر کہ تم نے ایک مرتبہ کہا کہ "میں کسی پوری قوم پر کبھی جُرم نہ لگا سکا" ایک فرقہ بھر
پر بالکل آدمیوں پر جو ایک پیشے کے ہیں حملہ کرنا دشمنی سے بہت بعد ہے۔
ایک شخص بھول جاتا ہے اور بیعت بھی کر دیتا ہے لیکن ایک جماعت کے دل سے کبھی
بات نہیں نکلتی۔ علاوہ برہمن ایک شخص واحد بھی ضرر رسائی کو یہ نسبت ہتک کے جلدی
معاف کر دے گا۔ یہودہ بنائے جانے سے زیادہ کوئی اور بات دل میں نہیں کھلتی۔

لہٰذا ہر کہ تم نے ان کا ایک نامی ادیب اور گران پایہ مدبر ملک تھا علی گڑھ میں پیدا ہوا
اور علی گڑھ میں دینا سے رخصت ہوا۔

لوگوں کو رسم کرنے یا بنانے سے تم کو اپنے مقصد میں کبھی کامیابی نہ ہوگی۔
گیتھ نے ایک زمین سے لگتا کرنے میں ہمارے ملک بعض اہل انگلستان کی بہت
 تعریف کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انگریز لوگوں کی آمد و رفت معاشرت میں بچا یا استقلال
 ہے اور وہ بھی خاموشی کے ساتھ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ گویا ہر جگہ کے
 یہی ملک ہیں اور ساری دنیا انھیں کی جڑ ایک زمین نے جواب دیا۔ مگر اس میں شک
 نہیں کہ نوجوان انگریز جرمن کے نوجوانوں سے نہ تو زیادہ ہوشیار ہیں نہ زیادہ تعلیم یافتہ
 اور نہ ان کا دل ان سے زیادہ صاف اور اچھا ہے۔ گیتھ نے جواب دیا جو میں کہتا ہوں
 وہ یہ بات نہیں جڑ بے شک ان باتوں میں وہ لوگ بڑھے ہوئے نہیں ہیں۔ اور نہ
 ان کو دولت اور نسب کا فرق ہے۔ مگر ان کی فقیہیت یہ ہے کہ ان میں دیسے ہی ہونے
 کی ہمت ہے جیسا کہ فطرت نے انھیں بنایا ہے۔ وہ دوسرے نہیں ہیں وہ پورے آدمی
 ہیں میں اتنا ہوں کہ بعض وقت وہ پورے بیوقوف بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں
 بھی ایک بات ہے اور وہ قابل قدر ہے۔

ہر ایک کام اور ہر چیز میں بُرد باری اور تحمل سے کام لو۔ بہت سے لوگ یہ زیادہ
 پسند کریں گے کہ آپ ان کی پوری داستان کو سینے بمقابلہ اس بات کے کہ آپ ان کی
 درخواست کو بغیر سننے منظر نہ کر لیں۔
 کبھی آپ سے باہر نہ ہو۔ اور اگر کبھی بہیم ہو بھی جاؤ تو اپنی زبان بند رکھو۔
 اور کوشش کرو کہ تمہاری بہیم ظاہر نہ ہو۔ غصے کو نہ قوت کرو۔ بہیمی کو چھوڑ دو۔ اور
 بُرائی کرنے کے واسطے بیقرار نہ ہو جاؤ۔ کیونکہ ایک نرم جواب غصے کو دور کرنا ہے۔
 اور آزر دہ کرنے والی باتیں غصے کو بڑھا دیتی ہیں۔

ایسی جگہ کبھی نہ گھس پڑو جہاں تمہاری ضرورت نہ ہو یا تم نہ بلائے گئے ہو۔
 دنیا بھر میں تمہارے واسطے جگہ پڑی ہے۔ کنگ جمیس نے کچی سے کہا کہ کیا
 میرے پاس تین سلطنتیں نہیں ہیں؟ اور مجھے میری ہی آنکھ میں گھنا فرض ہے؟
 بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ تو غلط بات کہیں گے یا ایسی بات کہیں گے
 جس سے پرال و اوقات تازہ ہو جائیں۔ اور اختلان راسے پیدا ہو۔

اے گیتھ سب سے بڑا جرم منی کا ادب تھا۔ اے منی پیدا ہوا۔ اور اے منی میں مل۔

جو علم آدمیوں کے حق میں مفید ہو اُس سے زیادہ مفید کوئی سائنس نہیں ہے۔
یہ سب سے زیادہ ضروری ہے کہ تم عقلندی سے نہ صرف اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہو کہ
ہو کہ کس آدمی پر بھروسہ کرنا چاہیے اور کس پر نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ اس بات کا بھی کہ کہا
ایک اور کس معاملے میں تم کو اُن پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ یہ چیز آسان نہیں ہے۔ یہ بہت ضروری
ہے کہ تم اُن لوگوں کو جو تمھارے ساتھ یا تمھاری ماتحتی میں کام کر رہے ہیں اچھی طرح پسند کر لو اور
جو جس وضع اور جس کام کا ہو اُسے اُسی وضع اور اسی کام میں لگاؤ۔
کن فیوٹیشس کا قول ہے جس آدمی کی طرف سے تم مشکوک ہو اُسے کبھی نہ لکھو۔
اور اگر تو کر لکھو تو پھر اُس پر شک نہ کرو۔
شکی آدمیوں کی بہ نسبت وہ لوگ جو لوگوں کا اعتبار کر لیتے ہیں اکثر زیادہ
درستی پر ہوتے ہیں۔

اعتماد رکھنا چاہیے لیکن اندھانہ ہو جانا چاہیے۔ مرلن باوجودیکہ
حاصل تھا۔ لیکن چونکہ اس نے کوتاہ فہمی سے والی وین کی اس التجا کو منظور کر لیا
کہ "یا تو میرا پر پورا بھروسہ کرو یا بالکل نہ کرو" اور آخر اسی کے نتیجے میں اپنی جان
گنوا دی۔

ہمیشہ عقل سے کام لو۔ اور آپ خود ہی اپنے مشیر رہو۔ کیونکہ اگر خود ایسا
نہیں کرتے ہو تو یہ امید کرنا فضول ہے کہ دوسرا تمھارے واسطے کرے گا۔ ایک عقلی آدمی
کا منہ اُس کے دل میں ہوتا ہے۔ اور ہر وقت آدمی کا دل اُس کے منہ میں ہوتا ہے۔ کیونکہ
جو کچھ وہ جانتا ہے یا خیال کرتا ہے اُسے فوراً ایک ڈالتا ہے۔
اپنے دماغ سے کام لو اپنی عقل سے صلاح لو۔ یہ بات نہیں ہے کہ عقل سے

۱۷ کن فیوٹیشس چین کا بہت بڑا فلسفی مقنن اور مقتدا ہے دین گوراجی جو آج تک چین میں
ادھر کو رہا میں آنا جاتا ہے۔ اُس نے اخلاقی اصلاح ہی نہیں کی بلکہ چین کی سلطنت بھی مضبوط
کر دی یہ حکیم حضرت مسیح سے چھ سو برس پیشتر تھا۔

۱۸ مرلن ایک بہت پڑا ناگہریز انشا پر داز ہے جو سنہ ۱۶۰۰ء میں تھا۔ وہ اپنے زمانے میں
ایک جادوگر اور کاہن خیال کیا جاتا تھا۔ خلاف عقل اور جادو کی سب کمانیاں اس کی
طرف منسوب ہیں اس کا اور والی دین کا قصہ بھی اسی قسم کا ہے۔

غلطی ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر تم ایسا کرو گے تو بظن غالب تم سے کم غلطی ہوگی۔
گفتگو اگر جاندی ہو تو خاموشی سونا ہے۔

ہست سے لوگوں کی غرض بات کرنے سے یہ نہیں ہوتی کہ ان کو کچھ کہنا
ہوتا ہو بلکہ ان کو محض باتیں کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ گفتگو دماغ کی مشق کے
واسطے ہوتی چاہیے نہ زبان کی مشق کے لیے۔ محض باتیں کرنے کے شوق میں بہک
بک کر نا کامیابی کی واسطے مضر جو ڈاکٹر بلر لکھتا ہے کہ "اوی باتیں کرنے کے لیے کچھ
ایسے حوش میں آجاتے ہیں کہ اپنی دھن میں وہ باتیں کہنے لگتے ہیں جو ان باتوں
سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جن کے کہنے کا انھوں نے شروع میں ارادہ کیا تھا
اور جنھیں کہ کے تھوڑی دیر کے بعد وہ بچھٹاتے ہیں تاکہ ہم نے نہ کہا ہو تا تو اچھا
ہوتا۔ بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایسی غیر مناسب باتیں ان کے منہ سے نکل جاتی ہیں
جن کے کہنے میں ان کا مقصد سوائے زبان کو کام میں لانے کے اور کچھ نہ تھا
زبان کی بے لگامی اور بے سوچے سمجھے کچھ کہ بیٹھنا بے شمار برائیوں اور تکلیفوں
کا باعث ہوتا ہے۔ اس سے ان لوگوں کے دلوں میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے جن کی
بات بات چیت ہوتی ہو۔ لوگوں میں جھگڑے اور فساد کا بیج بوجا ہوتا ہے اور
اسکی وجہ سے وہ ذرا ذرا سے قصور اور ناگواریاں مشتعل ہو جاتی ہیں جو اگر
ان باتوں کے ذریعے سے یاد نہ دلائی جاتیں تو خود بخود جاتی رہتیں لاپرواہ
کا قول ہے کہ "عمدہ تقریر کے لیے جس قدر مادے کی ضرورت ہے اس سے محروم
رہنا اور نہ اس قدر دماغ ہونا جس کی مدد سے کہ وہ بنایا جاسکے ایک
بہت بڑی ہستی کی بات ہے۔" پلوٹارک نے ڈی میرٹیس کی بابت یوں
لکھا ہے کہ "ایک مرتبہ وہ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنی زبان بند کیے
ہوئے تھا۔ اس سے پوچھا گیا کہ کیا تو بوقت ہے یا ترے پاس بولنے کے لیے
افاظ نہیں ہیں جو تھوڑا خوش بیٹھا ہے؟ اس نے جواب دیا "حق اپنی زبان کہیں نہیں
روک سکتا۔" حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا ہے "اگر تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو

لہذا کو بلر لکھتا ہے کہ ایک مشہور مستند مورخ ہے۔ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا ہے "اگر تم کسی ایسے آدمی کو دیکھو جو
ایک بڑا مشہور یونانی حکیم اور مدبر جو حضرت مسیح سے ۳۱۷ برس پیشتر تھا۔

باتیں کرنے میں بہت جلد باز ہر تو یہ جان لو کہ ایک بیوقوف شخص اس سے زیادہ اپنا کام چلا سکتا ہے۔“

اپنی فوقیت یا بڑائی کے ظاہر کرنے کی کبھی کو شش نہ کرو۔ کیونکہ انسان کو کمتر سمجھے جانے کا خیال سب باتوں سے زیادہ ناگوار معلوم ہوتا ہے۔

اپنے بیان پر حد سے زیادہ یقین نہ رکھو۔ باوجودیکہ تم کو اس پر یقین کامل ہو مگر ممکن ہو کہ تم غلطی پر ہو۔ حافظہ میں عجیب عجیب جکے دیتا ہو۔ اور بعض اوقات آنکھ اور کان دونوں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ ہمارے تعصبات اور ہماری بدگمانیاں باوجود عرصے کی ہو گئی ہوں مگر ممکن ہے کہ اُن کی کوئی قوی بناء نہ ہو۔ علاوہ برین اگر تم راستی پر ہو تو حسد سے زیادہ یقین نہ ظاہر کرنے سے تمھارا کچھ نقصان نہ ہو جائے گا۔ اپنے کام پر بھی حد سے زیادہ یقین نہ رکھو۔ اور جب کبھی کسی کام کا موقع مل جائے تو اسے ہاتھ سے بہ جانے دو۔ نہ معلوم آئندہ کیا ہو۔ اور اونٹ کس کروٹ بیٹھے۔

شعر بیک لحظہ بیک ساعت بیک دم دگر گون می شود احوال عالم
تہا گیا جو کہ جن لوگوں کو انتظار کرنا آتا ہو۔ اور موقع کو پانے کے بعد ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں انھیں ہر چیز مل جاتی ہے۔ جس شخص کو کام کرنے کا موقع حاصل ہو اور نہ کرے تو یہ یاد رکھو کہ جب وہ کرنا چاہے گا تو اس وقت اسکو موقع نہ ملے گا۔
اگر ایک مرتبہ تم موقع کو ہاتھ سے مل جائے دو گے تو پھر دوبارہ تم کو کبھی موقع نہ ملے گا۔ ع

احتیاط رکھو مگر اس بات میں حد سے نہ گزر جاؤ۔ اس بات سے بہت زیادہ نہ ڈرو کہ ہم سے غلطی ہو جاوے گی۔ کیونکہ جو شخص کبھی غلطی نہیں کرتا وہ کچھ بھی نہ کرے گا۔ ہمیشہ سترے لباس میں رہو۔ چونکہ بہت نا ضروری ہو لہذا ہم کو اچھے کپڑے پہنا چاہیے۔ مگر حد سے زیادہ اچھے نہیں۔ اور نہ ایسے فضول کپڑے جن میں وقت اور روپیہ ضائع ہو۔ مگر ان اس کا لحاظ ہو کہ چیز اچھی ہو۔ یہ بڑی تعجب انگیز بات ہے کہ لوگ کس قدر زیادہ دوسرے لوگوں کی نسبت اپنی رائے محض اُن کی پوشاک پر قائم کر لیتے ہیں۔ جن لوگوں سے تم ملتے ہو اُن میں سے بہت ایسے ہوتے ہیں جو اپنی رائے ہر حالت میں محض ظاہری وضع و قطع پر قائم کیا کرتے ہیں۔

اور بہت زیادہ ایسے ہیں جو تمہارے اوصاف کی بابت کچھ نہیں جانتے۔ اور مجبوراً ان کو تمہاری شکل اور صورت ہی پر اسے قائم کرنی پڑتی ہے۔ آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دل میں جگہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تانوسے فی صدی تم کو محض دیکھیں گے۔ اور فی صدی ایک شخص کو تمہارے اوصاف کا علم ہو گا۔ علاوہ برہنہ اگر تم اپنی بابت بے خبر ہو اور صاف ستھرے نہیں رہتے تو یہ نتیجہ نکالنا غیر مناسب نہ ہو گا (باوجودیکہ لازمی نتیجہ نہیں) کہ تم دوسرے امور میں بھی بے خبر ہو گے۔ جب تم سوسائٹی میں شریک ہو تو ہمیشہ ان لوگوں کے طرز کو دیکھو جن کا طور و طریقہ اچھا اور دل فریب ہو۔ ایک پرانی مثل ہے کہ "طرز انسان بنادیتا ہے" اور دل فریب شکل ایسی سفارشی چمپی ہے جو ہمیشہ اور ہر وقت کام آتی ہے" باوجود اس مثل میں کسی حد تک مبالغہ ضرور ہے لیکن اس میں بہت کچھ سچ بھی ہے۔ بٹشپ ملٹن کا قول ہے کہ "طرز کو ہر ایک شخص کچھ نہ کچھ ضرور آتا ہے۔ لیکن بعض آدمیوں کے نزدیک طرز ہی سب کچھ ہے۔ لیاقت اور علم و لون کو نہیں جھین سکتے۔ ہاں اگر دل ان کے قبضے میں آجاوین تو بیشک پھر یہ کل اسکیں گے۔ آنکھوں کو اپنی وضع صورت اور حرکات و سکنات سے اپنا فریفتہ کر لو۔ اور کانوں کو اپنی گفتگو کی لطافت و نازکی سے خوش کر دو۔ تب غالباً (بلکہ میں یہ کہوں گا اغلب ہے کہ) دل خود ہی تمہارا ہو جائے گا" آنکھیں اور کان ہر شخص کے پاس ہوتے ہیں۔ مگر بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی اسے بھی سلیم ہو۔ دینا ایک ایسی چیز اور ہم سب لوگ ایک دوسرے ہیں۔ اور ہر شخص اس بات کو جانتا ہے کہ تماشے کی کامیابی اس کے اچھا کھیل جانے ہی پر منحصر ہے۔

لارڈ چیسٹر فیلڈ نے اپنے لڑکے کے بابت یوں کہا ہے "لوگ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ جہاں کہیں اسکو لوگ جانتے ہیں اس سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے۔ مگر میری خواہش یہ ہے کہ لوگ اسکو جانتے سے پہلے پسند کریں اور بعد ازاں محبت کریں" اگر تم وضع و طرح وغیرہ کو ضروری نہیں سمجھتے تو یہ جان لو کہ تم لوگوں کے طبائع سے بہت ہی کم واقف ہو۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ ان کی طرف تم لے بٹشپ ملٹن انگلستان کا ایک نئی تختہ اور محقق مصنف تھا ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۷۰ء میں مر گیا۔

جتنی زیادہ توجہ کر دوں کہ میری ایسی چیزیں ہیں جو دل کو بہت مرغوب معلوم ہوتی ہیں اور دل کو گرویدہ بنالیتی ہیں۔ جن کا سمجھنا عقل کے واسطے حیات کا حکم رکھتا ہے۔
 کہ سب سے زندگی میں قریب قریب اسی قدر مدد دیتی ہے جس قدر کہ میٹروں نے ہم سب جانتے ہیں کہ ایک شخص گھوڑا چرا لیا تاہو اور مضائقہ نہیں کیا جاتا اور دوسرے شخص کو جھاڑی کی طرف دیکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ایک شخص اپنا کلیم خوشگوار ہی کے ساتھ کرنا ہو اور دوسرا بھونڈے پن سے ہارس کتا ہو کہ یہ لو کھ اور مر کر ہی جو خوش بیانی اور ہنر کے دیوتا تھے بغیر کہ لیسٹر (اسی زینت کی دیوی) کی مدد کے بے دست و پا تھے۔

(ترجمہ)

کفایت شعاری

کفایت شعاری کی انگلستان میں جتنی قدر ہونی چاہیے نہیں ہوتی۔ ہمارے ہموطن سخت محنت کرتے ہیں۔ اور معقول آمدنی بھی رکھتے ہیں۔ لیکن کفایت شعاری میں دوسری تو میں ہم سے بڑھی ہوئی ہیں۔ ایک بڑے عقلمند کو یہ کہنے لگے کہ اس بات کا فیصلہ کہ تو امیر ہو گا یا نہیں۔ اس پر مبنی نہیں ہے کہ تو کس قدر پیدا کرے گا بلکہ اس بات پر جو کہ تو کیا خرچ کرے گا؟

قطع نظر اس خیال کے کہ کفایت شعاری سے تم امیر ہو جاؤ گے۔ آئندہ کی ضرورتوں کے واسطے بھی بچا رکھنا سنا سب اور ٹھیک ہے۔ ایک بھونڈی مثل ہے کہ جب مغلیں دروازے سے داخل ہوتی ہے تو محبت کھڑکی کی راہ نکل بھاگتی ہے۔ لیکن یہ دیکھنا کہ ہمارے جو روپ چون کو کھانا کھانا میسر نہیں ہے۔ یا ہمارے پاس

۱۵ میوزیو زینٹون کے عقیدے میں لیاقت و دانائی کا دیوتا تھا۔ اور گریسیو زینٹون کی ایک دیوی تھی جس کی جانب زینت و آرائش کے اوصاف منسوب کیے جاتے تھے۔
 ۱۶ ہارس جس کا نام یونانی میں ہوراشیوس تھا ایک شیریں زبان یونانی شاعر تھا جو حضرت مسیح سے ۶۵ سال پیش پیدا ہوا تھا اور ۸ سال قبل مر گیا۔
 ۱۷ جیائیون کا ایک فرقہ جس کے پیروا ائی و غیرہ سے بہت متنازع کرتے ہیں۔

انتاروپہ نہیں ہر کہ جاری کے وقت ہم اُن کا علاج کر سکیں۔ یا اُن کو آرام قاسائش دے سکیں۔ یا جب کہ ہم کو اس بات کا خیال آوے کہ اگر ہم نے مناسب مشقت کی ہوتی یا ہم نے اپنے ساتھ بے ضرورت فیاضیان نہ کی ہو میں تو آج اُن کو اکیلے اور فکر سے بچا لیتے۔ کس قدر پر اندوہ اور پر حسرت حالت ہر اس میں شک نہیں کہ کفایت شعاری محض روپیہ جمع کرنے کی غرض سے ذلت ہر لیکن اس خیال سے کہ ہم کو دوسروں کی محتاجی نہ رہے۔ نہایت درست اور مردانگی ہے۔

ہمیشہ حساب و کتاب رکھو۔ اور بہت ہوشیاری کے ساتھ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذرا ذرا سے خرچ کی بھی نشریح کرنا ضروری ہے بلکہ میسر منشاء صرف اس قدر ہر کہ تم کو یہ بات معلوم ہر کہ روپیہ کس طرح خرچ ہوتا ہو۔ اور تمہیں اشیاء کی بابت کس قدر قیمت دینی پڑی ہو جس کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سیری آمدنی کو کتنے ہر اور میں کتنا خرچ کرتا ہوں وہ ہرگز فضول خرچ نہیں ہو سکتا۔ فضول خرچ لوگ اپنی آنکھیں بالکل بند کر لیتے ہیں۔ تاکہ اس امر کو نہ دیکھیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اس امر کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا کہ وہ بتا ہی کے نشیب میں پھسلتا ہوا چلا جا رہا ہے۔

تم جو بات کرو اپنی آمدنی کے موافق کرو۔ ہر سال کچھ بچا د جا ہے وہ بالکل قلیل ہی ہو۔ لیکن سب باتوں سے زیادہ یہ بات ضروری ہے کہ تم قرض نہ لوؤ کیونکہ کہتا ہو اگر ایک آدمی کی سالانہ آمدنی میں روپیہ ہو اور اس کا سالانہ خرچ انیس روپے پونے سولہ آنے ہو تو اس کا نتیجہ خوشی ہو گا۔ اور اگر اسکی آمدنی میں روپیہ ہر اور نہی میں روپیہ اور ایک پیسہ ہر تو یہ سمجھ لو کہ نتیجہ مصیبت ہو گا۔ باوجودیکہ دونوں میں صرف دو ہی پیسے کا فرق ہے۔ یہ کہنا زیادہ سخت نہ ہو گا کہ قرضہ غلامی ہے۔ جو شخص قرض لیتا ہو وہ غم

۱۷ ڈیکسن اچھلتان کا سب سے زیادہ باوقفت مہذب باذوق اور مقبول و ہر دل پرینا دل نویس تھا جسے انگریز جہیت ناول نویسی کے سب سے اول جگہ دیتے ہیں۔ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۷ء میں مرا ۱۹ ڈیکسن اچھلتان کا سب سے زیادہ باوقفت مہذب باذوق اور مقبول و ہر دل پرینا دل نویس تھا جسے انگریز جہیت ناول نویسی کے سب سے اول جگہ دیتے ہیں۔ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۷ء میں مرا

۱۹ ڈیکسن اچھلتان کا سب سے زیادہ باوقفت مہذب باذوق اور مقبول و ہر دل پرینا دل نویس تھا جسے انگریز جہیت ناول نویسی کے سب سے اول جگہ دیتے ہیں۔ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۷۷ء میں مرا

مول لیتا ہے۔ بہت چیزیں زندگی میں ناگوار دنا پسند ہوتی ہیں ہویش گر ملی نے جو ایک بہت بڑا تجربہ کا آدمی تھا نہایت خوب اور صبح کما کر کدہ بھوک۔ سردی۔ چھینٹے سخت مشقت امانت۔ اور جیلا مت سب باتیں ناگوار ہوتی ہیں لیکن قرض ان سب سے کمین زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ کبھی قرض نہ لو۔ اگر تمہارے پاس صرف چار آنے ہوں اور ہفتہ بھر محکم کو کچھ اور ملنے کی امید نہ ہو تو بچے خرید لو اور انھیں بھنا کے رکھ چھوڑو۔ ان پر سہ کرنا اس سے اچھا ہے کہ کسی سے ایک روپیہ قرض لو یہ **کابٹ ڈون** کتابتار جو دنیا میں صرف دو قسم کے آدمی ہیں (۱) جو بچانے ہیں (۲) جو خرچ کرتے ہیں یعنی کفایت شعار اور فضول خرچ۔ یہ کفایت شعار ہی لوگ ہیں جن کی بدولت سکالون۔ کپڑے بننے کی بکون۔ بکون۔ اور جہازوں کی تعمیر ہوئی۔ اور انھیں لوگوں کے نقد قرض میں وہ بڑے بڑے کام انجام پائے جن کی وجہ سے انسان کو شائستگی اور خوشی حاصل ہوئی اور جن لوگوں نے اپنے مال و دولت کو لٹا دیا وہ ان لوگوں کے ہمیشہ غلام رہے۔ یہ قانون قدرت ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔ اور اگر میں کسی گروہ سے یہ کہوں کہ آپ لوگوں کی ترقی اسی وقت ہوگی جب آپ نا عاقبت اندیشی بے خبری اور کالی پر کمر باندھ لیں تو جان۔ لیجئے کہ میں دعا باندھ آدمی ہوں ۵

پلو مارک کتابتار آرمینسٹن کے مندر واقع شہر افسوس میں جو قرض دار جا کے پناہ لیتا ہے وہ قرض خواہ سے مطمئن اور محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن دانا آدمی کیسے کفایت شعار کی داریاں ہر جگہ موجود ہے جس میں اسے عزت اور خوشی ملتی ہے۔ اور آرام و آسائش کے واسطے دانی جگہ موجود ہے سوائے کام و بار کے نہ قرض لے نہ دو کیونکہ نہ تم کو روپیہ ہی واپس ملے گا۔ اور نہ قرضدار تمہارا شکریہ ادا کریں گے۔ قرض دار بھی ہمیشہ یہ خیال کرتے

لے ہو دیں گر ملی کے حالات سے ہم افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ واقف نہیں ہو سکے۔
کابٹ ڈون انگلستان کے ایک ضلع کے ایک کان کا بیٹا تھا جو تجارت کے ذریعے سے ترقی کر کے اس درجے کو پہنچا کہ بار لینٹ کا ممبر ہو گیا۔ اور ایسلافی اور جادو بیان اسپیکر ثابت ہوا کہ بہت کم لوگ اس مقابلہ کر سکتے تھے۔ **کابٹ ڈون** میں پیدا ہوا۔ اور **کابٹ ڈون** میں رہا تک عدم ہوا۔
کابٹ ڈون میں قرض داروں کا ایک دیوتا تھا جس کا بڑا مندر ایشیا سے کوچک کے شہر افسوس میں قائم تھا۔ اور اس کو یہ حق حاصل تھا کہ جو قرض دار اس میں جا کے پناہ لے اس سے قرض خواہ کسی قسم کی باز پرس نہ کر سکتا تھا۔



اندلسیہ عظمیٰ میں جسے فی الحال اسپین کہتے ہیں ایک صوبہ ہے جس کو انگریزی
 نقشوں میں تم "سرگوسہ" یا "ذراگوذا" پڑھو گے۔ اس کا صدر مقام بھی شہر سرگوسہ
 ہے جو دریائے ہبرو کے شرقی ساحل سے ذرا ہٹ کے واقع ہے۔ اور آج کل اس
 ریلوے لائن کا پہلا اسٹیشن ہے جو سرگوسہ سے شروع ہوتی ہے اور "لریہ" ہوتی
 ہوئی بندرگاہ "برقی لونہ" تک چلی گئی ہے۔ لفظ سرگوسہ یورپین زبانوں کی خداد
 پر چڑھ کے اس وضع پر آگیا ہے ورنہ اصل میں یہ سر قسطہ تھا۔ ایک مشہور نام جو عربی
 تاریخوں میں بکثرت نظر آئے گا۔ شہر یا صوبہ سر قسطہ اسپین کے مشرقی صوبجات میں ہے
 اور یہ نیز یا ان پہاڑوں کے گویا دامن ہی میں واقع ہے جو اسپین کو فرانس سے
 جدا کرتے ہیں۔ اور جن کو فرانس والے کبھی مسلمانوں کی دہر سے نہایت ہی خوف
 اور دہشت کی نگاہوں اور مرعوب دل سے دیکھا کرتے تھے۔ ان پہاڑوں کو اہل
 عرب کی اصطلاح میں "الباب" کہتے ہیں۔

یہ صوبہ اب تو نہایت ہی ویران اور تباہ پڑا ہے۔ مگر کسی زمانے
 میں عجیب مردم خیز زمین رکھتا تھا۔ اس کے سوا دسے خدا جانے کیسے کیسے
 لائق نکلے اور دنیا بھر میں مشہور ہو گئے۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر زمانے میں
 یہاں ایک شخص پیدا ہوا ابتداءً تو فلاکت زدگی نے اُسے عام نامورئی کے اسٹیج
 پر نہ آنے دیا۔ لیکن آخر میں جب اُس نے اپنی علمی وقعت کا حکم مردوں پر ٹھاندا
 تو ایسی یکنوائی حاصل ہوئی کہ آج تمام تاریخین اور سب تذکرے اُس کے ذکر سے

بھرے پڑے ہیں۔ یہ وہی شخص ہے ابو بکر محمد بن صالح جس کی وقعت نے اُس کے وطن
سرفہرہ ہوئی، مین بلکہ پورے ملک اسپین کو اس پر خرد و ناز کرنے کا موقع دیا۔ اور اُس کے
ام کے ساتھ اندلس کا لفظ اٹھا گیا۔

ابن صالح کسی غریب گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ اور ایسے گناہی کے گھر میں خدا
نے اُسکی ولادت کی کہ مورخین اگر اُسکے سند ولادت اور خاندان کا نام بھی نہیں معلوم۔
ہاں اسکے ابتدائی حمد کا بہتہ اسی قدر چلتا ہے کہ پہلے تو نہایت پریشان حال تھا۔ اور افلاس
و فلاکت میں زندگی گذرتی تھی۔ امیر سر قسط ابو بکر صہراوی کی تعریف میں چند قصائد کہے۔ اور
اس نے انعام و اکرام سے خبر لی۔ اور اس طریق سے اُس عالم بتم کو تھوڑی بہت فایز
الہامی نصیب ہوئی۔ قطع نظر اس انعام و اکرام کے امیر ابو بکر خود بھی لائق تھا۔ ابن صالح
کے اشعار دیکھ کے سمجھ گیا کہ یہ کوئی ہونہار شخص ہے۔ چند روز کے بعد ایک ایسا زانہ آیا
کہ امیر ابو بکر ابن صالح کی ذانت اور لیاقت کا معرفت تھا اور بے اُس کے مشورہ لیے کوئی
کار نہیں کر۔ اٹھا۔

امیر ابو بکر ایک بڑے الو العزم و زانہ و اکا نام ہے اُس کو فتنہ دی اور
حملہ آوری کا نہایت شوق تھا۔ مشرقی ممالک جو فرانس والوں کے قبضہ میں تھے وہ اُس
کے دلچسپ شکار گاہ تھے۔ آخر اس نے تمام مشرقی اندلس کو فتح کر لیا۔ اور ایک صاحب
ثروت بادشاہ کی حیثیت پیدا کر لی۔ اُسکی نظر میں ابن صالح سے عمدہ میٹر کون ہو سکتا
تھا۔ لہذا اُس نے ابن صالح کو وزارت کے جلیل القدر عہدے پر مامور کیا۔ یہ زانہ
ابن صالح کی انتہائی کامیابی اور دولت مندی کا تھا۔ اور اسی عہد میں اُسے موقع
ملاکہ اُس نے اپنے شوق کے مطابق محقق علوم کی عمدہ عمدہ تصنیفات فراہم کیں
اور ایک اعلیٰ درجہ کا فلاسفر بن گیا۔ زمانے کو ایک عالم و فاضل کی یہ تاریخ الہامی
پسند آئی۔ چند روز بعد امیر ابو بکر صہراوی نے انتقال کیا۔ اور ع

آن قدر شکست دلائی ساقی نہ ماند

کا مقولہ ہے صادق آیا۔ ابن صالح کو ایسے علم و دست اور قد و ان بادشاہ کے سر جانے
کا نہایت ملال ہوا۔ چنانچہ امیر مغفور کے غم میں اُس نے ایک نہایت دردناک مہر
لکھا جس میں ایک یہ بے مثل شعر بھی تھا۔

وَسَلَّمْنَا مَعَهُ الْفَقَامَ فَصَلَّى أَلْ

یعنی آہ اُس کے جانے کے وقت میں نے دریافت کیا کہ پھر کیا ملاقات ہوگی لوگوں نے کہا حشر کے روز بس اتنا سنتے ہی میں نے خدا کا شکر کیا اور صبر کر کے خارج ہو رہا اس ایک شعر ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صائغ کو اپنے ولی نعمت کے مرنے کا کتنا بڑا صدمہ ہوا تھا۔ مگر خیر جس طرح بنا ابن صائغ نے وطن سے قدیم باہر نکالا وہیں رہا اور اپنے علمی شغل میں دل بہلا رہا۔

۱۱۰۰ھ میں اُس سرزمین پر سب سے بڑی اور بہت بڑی مصیبت ازل ہوئی وہ یہ کہ امیر آؤ کر کے جانشین سلطنت کا انتظام نہ سنبھال سکے اور اضلاع شرقی اندلس پر پھر اہل فرانس کا قبضہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ آج کل کا زمانہ نہ تھا جب سلمان اور عیساٰ بن باہم لے جلتے رہتے ہیں۔ اور سلمان نو خیز اکثر بلاد نصاریٰ کے حکمران بھی تھے۔ مگر عیساٰ بن امین اپنی صلاحیت کماں تھی کہ اُن کی حکومت میں کوئی مسلمان امن و امان سے رہ سکے تمام مسلمان متوطنین شرقی اندلس پر آفت آگئی۔ اور وطن چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ الغرض اسی مسلمان گردی کے عہد میں پچاسے ابن صائغ نے بھی اپنا وہ پیارا وطن چھوڑا جس کو کسی طرح چھوڑنا نہیں پسند کرتا تھا۔ ابن صائغ کا یہ پہلا سفر ہے جب اُس نے شرقی اسپین کو چھوڑ کر غری اسپین کی راہ لی۔ اور عیساٰ بنون کی حکومت سے نکل کے سلمان بادشاہوں کے ظل حمایت میں پناہ پائی۔

وہاں بھی اُن دنوں یحییٰ بن سعید بن تاشقین ایک فیاض اور علم دوست فرمان روا تھا۔ ایسے بے مثل و بے نظیر عالم اور کار آزمودہ وزیر کا آجانا اپنی خوش قسمتی سمجھا۔ اس نے ابن صائغ کو بلا کے خلعت و وزارت عطا کیا۔ ابن صائغ نے بیس سال تک یحییٰ بن سعید کی وزارت کی۔ اور ایام وزارت میں ایسا عام پند اور ہر شخص کا مزع و ماویٰ رہا کہ لوگوں نے اس کی وزارت کے ایام تمام گزشتہ ایام سے غنیمت جانے۔ امیر کن الدین کا بیان ہے کہ صرف ابن صائغ کے حسن سیرت اور اعلیٰ خلفاء کے اثر سے تمام لوگوں میں صلاحیت آگئی۔ اور نیز اُن کی انصاف پسندی نے ملک کے تمام جھگڑے اور فساد فرو کر دیے۔

تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ ابن صائغ زمین اسپین کو بہت بڑے عالم بہت بڑے حکیم و فلسفی

اور بہت بڑے طبیب اور اول درجے کے شاعر تھے۔ سارے ملک اسپین میں اُن کی ذرا
دقیقہ رسی۔ باریک بینی۔ عاقبت اندیشی۔ اور قوت حافظہ کی شہرت تھی جس خوبی کا نقون
نے فلسفہ اور حکمت طبعی کے بہت بڑے بڑے نازک و مشکل مسائل کو حل کر دیا ہے اُس سے
صاف ظاہر ہے کہ اُن کو دنیا کے تمام فلسفیوں پر ترجیح تھی ابن صانع کے کمالات صرف
گذشتہ فنون ہی تک محدود نہ تھے۔ بلکہ علم جغرافیہ نجوم اور ادب میں بھی اہل کمال علما
انھیں اپنا پیشوا اور امام مانا ہے۔ اور لطف یہ کہ باوجود ان علمی کمالات کے وہ تراہم
خشک نہ تھے موسیقی میں بھی اعلیٰ کمال حاصل تھا جو شاید موجودہ علماء اسلام
کے لیے موجب حیرت ہوگا۔

امام علی بن عبدالعزیز جو مشاہیر اندلس میں ہیں اور جو امام غرناطہ کے
لقب سے مشہور تھے۔ اس فاضل نگار کی زبان میں فرماتے ہیں ”کَادَ فِي تَقَابُةِ اللَّهِ
وَلُطْفِ الْعَوْنِ عَلَى تِلْكَ الْمَعَانِي الْجَلِيلَةِ الشَّرِيفَةِ الدَّقِيقَةِ الْعَمُودَةِ دَهْرًا وَ
نَادِرًا الْفُلَّاحِي فِي زَمَانِهِ وَتَبَّتْ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ بَعْدَ أَبِي نَصْرِ الْفَكَارِي مِثْلَهُ
فِي الْفَنُونِ الَّتِي تَكَلَّمَ عَلَيْهَا“ یعنی ابن صانع معانی جلیل و مسائل دقیق میں
جس خوبی سے فکر کرتے تھے اور جیسے عمدہ مسائل پیدا کرتے تھے۔
اس کی حیثیت سے اپنے زمانے کے حیرت انگیز نمونہ تھے اور ایسے تھے کہ
آسمان نے ایسے لوگ کم دکھائے ہوں گے۔ یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ جن علوم میں کہ ابن
صانع نے بحث کی ہے اُن میں بعد ابونصر فارابی کے اس وقت تک ان کا ایسا کوئی
شخص نہیں پیدا ہوا۔ جن لوگوں نے اسلام کی کتب فلسفہ کو دیکھا ہے وہ جانتے ہوں
گے کہ ابونصر کس پائے کا شخص تھا اور حکمت میں ابن صانع کا اس کے بعد قرار دینا
جاننا اُن کے لیے کتنی بڑی عرت کا مسند خالی کرتا ہے۔

حسان الدین خلیب نے اپنی کتاب احاطہ میں ابن صانع پر ان مختصر الفاظ
سے ریلو کیا ہے ”إِنَّهُ آخِرُ فَلَا أَيْسَفَةَ إِلَّا مِثْلًا مِجْرِيَّةً الْأَخْدَاسِ“ یعنی
ابن صانع جزیرہ نامے اسپین میں اسلام کے پچھلے فلسفی تھے۔ بہ نسبت اس کے
علامہ قطب الدین لاہجی نے ان مرحوم پر زیادہ وضاحت کے ساتھ ریلو کیا ہے۔
وہ فرماتے ہیں ”كَانَ عِلْمًا مَدُونَةً فِي الْعُلُومِ الْعَلَمِيَّةِ مُتِمِّمًا لِزَادِ الْعَرَبِيَّةِ وَالْإِسْلَامِ“

حَافِظُ الْقُرْآنِ مُتَقِنًا فِي صِنَاعَةِ الطَّبِّ وَالْمُعْتَبَرُ بِسُيُفِي“ یعنی امام ابن صانع علوم
حکیم و فلسفیت میں اپنے عہد کے علامہ زبان عرب کے ادب و انشا پر داندی میں ممتاز
عصر۔ حافظ قرآن مجید۔ اور فن طب کے بہت بڑے ماہر اور موسیقی کے اول درجہ کے استاد
تھے۔ خاص فن طب میں ابن صانع کی اعلیٰ منزلت کو اور لوگ بھی زیادہ زور دے کے
بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ احمد بن ابی اصیبعہ کہتے ہیں کہ فن طب کے دو نون حصول یعنی علم
و عمل میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ ابن ابی اصیبعہ اس امر کو زیادہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں
اور کہتے ہیں کہ بلاد اسپین میں ابتدائے فن طب کی بڑی ترقی تھی اور بہت بڑے بڑے
اکمال اس فن شریف کے وہاں کی خاک سے پیدا ہوئے تھے لیکن ادھر دین صلیہ
سے یہ فن وہاں بالکل مٹ گیا تھا۔ اور کوئی نہ تھا۔ جس کی نسبت سیحہ ہاریرہ طیبہ کا
لفظ استعمال کیا جائے۔ اس پانچویں صدی کی ابتدا میں ابن صانع نے ظہور کیا اور
اس خوبی سے مردہ فن طب کو زندہ کیا کہ گویا قدرت کی طرف سے ملک کو گزشتہ
کئی کا پورا عوض مل گیا۔ اصول طب کے متعلق فلسفہ الہیہ سے ایسے ایسے نازک اور لطیف
مسائل استنباط کیے کہ دنیا اُن کی دقت نظر اور تبحر پر عجب عجب عجب لگی۔ علی ہذا القیاس
طبیعیات اور فن طب کے علمی برتاؤ میں بہت اچھی ہمارت تھی۔ اور اس بارہ میں
اُن کی بعض تصانیف اُن کی اعلیٰ ایات ظاہر کر رہی ہیں ہیات اور ہندسہ میں بھی اُن کے چند رسائل
ہیں جن میں سے ہر ایک باور بلند تیار ہے کہ اُن کی واقفیت اور معلومات کا درجہ
کس قدر اعلیٰ تھا جس کسی نے اُن کی کتاب ”اتصال الانسان بالعقل الفعال“ دیکھی ہوگی
وہ صاف سمجھ جائے گا کہ ابن صانع علوم فلسفہ الہیہ وغیرہ میں کس کمال کے بزرگ تھے۔
یہ امر مشہور ہے کہ ارسطو طالیس کے نظام فلسفی اور نیز اس کے نکات و رموز کو سمجھنا
اسلام میں صرف ابن صانع ہی کا کام تھا۔ رئیس المتأملین شیخ الریس بن سینا اور
امام غزالی جنھوں نے ابو نصر فارابی کے بعد فلسفہ کے میدان میں تو اس طرح کی جہاد کیا
دکھائی ہیں اُن کے خیالات کو ابن صانع کے نتائج ذہنی کے برابر کہہ سکا جائے
تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ابن صانع کا پایہ فلسفہ میں کس قدر بلند ہے قاضی محمد
بن رشید اور امام غزالی ابو الحسن علی بن عبد العزیز کو اس اسلامی بے مثل و بے
نذیر فلسفی کی شاگردی کا فخر حاصل ہے۔

ابن صالح کے معاصر ایک اور مشہور بزرگ تھے جن کا نام ہے ابو نصر فتح بن خاقان علامہ مقرئ اپنی تاریخ اسپین فتح الطیب فی عرض الاندلس الرطب میں لکھتے ہیں کہ ان بزرگ نے اپنی ایک تصنیف میں ابن صالح کی بڑی تعریف کی اور اُس تعریف میں ایسی نصائح و بلاغت صرف کی کہ ابن صالح کی تعریف کے ساتھ اُنھوں نے اپنے زور قلم کو بھی پورے طور سے دکھا دیا تھا۔ اُس عبارت کا خلاصہ مطلب یہ تھا کہ "ابن صالح جو ہر علم کے زور و روشن ہیں۔ اور تمام زمانے چاہتے ہیں کہ ابن صالح کے زمانے کو اپنا سرتاج بنائیں تمام دنیا میں ان کی نکت پھیلی ہوئی ہے اور اگر ایک چمکاری اُن کے آتش علم کی اُڑے تو سارا خرمن جل خاک میں مل جائے۔ غرض اسی طرح اور بھی بہت کچھ مدح سرائی کی ہے اس کے چند روز بعد اُنھیں بزرگ ابن خاقان نے ایک اور کتاب تصنیف کی جس کا نام رکھا "قلائد العقیان" اُس میں ابن صالح کی ایسی سخت توہین اور ایسی بیہودہ ہجو کی ہے کہ دیکھتے شرم آتی ہے۔ فرماتے ہیں "ابن صالح دین کی آنکھ کا زہر اور ہدایت یافتہ لوگوں کے حق میں ایک مرض ہے" اس ہجو میں بھی ابن خاقان نے اپنی انشا پر دازی کے بڑے بڑے جوہر دکھائے ہیں لوگ حیرت میں ہیں کہ ابن خاقان نے اپنی رائے کو اس قدر کیوں بدل دیا۔ سو کسی ذاتی فساد اور غرض کے اور کوئی سبب ایسے تفرک انہیں ہو سکتا۔ مگر علامہ مقرئ نے اس کی تصریح کر دی ہے اور ایک عجیب مذاق واقعہ لکھا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابن خاقان کا قاعدہ تھا کہ ہر مجلس اور ہر مجلس میں اپنی ہی تعریف کے پل باندھ دیا کرتے تھے۔ اتفاقاً ایک دن ابن صالح کے گھر میں آئے اور یہاں بھی وہی بلند پروازیوں اور خود ستائیاں رنگ جمانے لگیں۔ بیان کرنے لگے کہ فلاں امیر نے مجھے وجد میں آ کے ایسا گراں ہبات موتی مرحمت کیا۔ اور فلاں نے اتنا بڑا صلہ گراں بہا میری نذر کیا۔ اور اس وزیر کے وہاں سے مجھے ایسا مصلحہ نہ دیا کہ کام کا عارضہ تھا یہ کہتے کہتے خود فراموشی جو طاری ہوئی تو خیال نہ رہا اور ناک سے سبز سبز دھنچھونچھ پھٹک آیا۔ یہ دیکھتے ہی ابن صالح بے تحاشا بول اُٹھے "ہاں ہاں اُنھیں میں کا یہ ایک زمرہ بھی ہے جو آپ کے ہونٹ پر ہے۔ اس جملہ نے ابن خاقان کو ایسا شرمندہ کیا کہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسی روز سے ابن صالح کی دشمنی پر کمر باندھ گئی۔ مگر صاحب تاریخ الحکما نے اسکی

دوسری وجہ بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ ابن خاقان نے ابن صانع سے اُن کا کچھ کلام مانگا کہ اپنی تصنیف کو ان کے اشعار آبدار سے رونق دین ابن صانع کو کسی وجہ سے یہ ناپسند ہوا۔ اور انھوں نے نہایت بے مروتی سے اُن کے آدمی کو پھیر دیا اور جواب خشک دیا۔ ابن خاقان بس اسی امر پر ناراض ہو گئے۔ اور گویا باہمی عداوت کی اسی سے بنا چڑی بہر حال نہانے نے اس امر میں ابن خاقان ہی کو طرز مٹھرایا۔ جنھوں نے ایک بار تو بہت تعریف کی اور دوبارہ مخالفت میں حد سے گزر گئے۔

ابن صانع کے مذکورہ کمالات اگرچہ اُن کو علماء و فضلاء اور حکماء و اطباء کی محفل میں اعلیٰ مرتبہ پر جگہ دے رہے ہیں مگر یہ زیادہ حیرت کی بات ہے کہ اگر آپ محفل شاعرہ میں دیکھیں گا تو میر مجلس کی کرسی وہاں بھی انھیں کے قبضہ میں نظر آئے گی۔ ان کی شاعری فارسی انشا پر داندی میں جان ڈال دی تھی اور وہ اس قسم کے شاعرہ تھے جیسے کہ اکثر موزون طبع علماء ہوتے آئے ہیں جن کے خشک ذوق کو طبیعت کبھی پسند نہیں کر سکتی ابن صانع کی شاعری اُس افلا درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی جو کسی دریائے عشق میں ڈوبے ہوئے شاعر کے لیے ہونا چاہیے۔ دیکھئے یہ کس قیامت کے شر میں جو اس علامہ عصر شاعر کے ذہن سے نکلتے تھے۔

اَسْكَاكَ نِعْمَانُ اَلَا ذَاكَ يَتَقَقَّلُوْا بِالْاَلَمِ فِي رُبْعِ قَلْبِي سَكَاكَ
اے وادی نعمان کے رہنے والو جان اراک کا جنگل ہے۔ یقین جانو کہ تم میرے دل کے مکان میں رہتے ہو۔

وَدُوْ مَوَاعِلِ حِفْظِ اَلْوَادِ نَطَا لَمَّا بُلَيْنَا بِاَقْوَامٍ اِذَا اَلْسِنَتُهُمْ نَظَوْا اَحْاَلَا
اور دوستی کو ہمیشہ محفوظ رکھو اس لیے کہ بہت دن ہوئے ہیں ایسے لوگوں کی محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں جنھوں نے دوستی کی امانت داری میں خیانت کی۔
سَلُوْا اَللّٰلِ عَنِّيْ اِذَا مَتَّيْتُمْ دِيَارَكُمْ حَلَّ اَلْحَلَّتْ لِيْ فِيْهِ بِاَتَقْوَامٍ اَبْعَادَا
میری حالت رات سے بوجھو کہ جب سے تمہارے شہر میں آیا ہوں کبھی میری

آنکھوں میں نیند کا بھی سُرمہ لگا ہے۔
دَحَلْ جَمْرًا دَعَا اَسْيَافَ تَوَقَّى سَمَاءَكُمْ كَمَا فَرَّ لَوْ اَلَا جَسُوْا فِيْ اَبْعَادَا
یا تمہارے آسمان کی بجلی کی کشیدہ تلواریں کہ لیے میری ٹیکوں کے سوا اور بھی کوئی میان تمہارا؟

ابن صائغ کے زندگی کے واقعات بتا رہے ہیں کہ شاعری صرف اکتساباً اُن کے مذاق بن نہیں پیدا ہوئی تھی بلکہ خوش عشق کے بہت کچھ جذبات بھی اُن کے دل میں موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ ابن صائغ کو کسی غلام کے ساتھ عشق تھا اور اس کی محبت نے علامہ مدوح کے دل میں ایک بے بسی کا جوش پیدا کر دیا تھا۔ اتفاقاً وہ غلام بعض ظالموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا اور اُن لوگوں نے اسے کسی ایسے شہر میں بیچا کے رکھا کہ ابن صائغ کو اُس کے حالات کی بالکل اطلاع نہ تھی۔ اُس غم میں اُنھوں نے جو اشعار کہے ہیں وہ اُن کے جذباتِ دل کے ساتھ اُن کے کمالِ شاعری کو نہایت خوش آہنگی سے ظاہر کر رہے ہیں۔ چند روز کے بعد خبر آئی کہ وہ غلام مر گیا۔ اس کا ابن صائغ کو اور صدمہ ہوا۔ اور مرثیہ کے طور پر اُنھوں نے جو اشعار فرمائے ہیں وہ اور بھی زیادہ دوقِ عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

ایک اور حیرت انگیز واقعہ ہے جس کو مورخین نہایت تعجب کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اور واقعی وہ تعجب کی بات ہے۔ ابن صائغ ایک پرجہال معشوقہ کے عارضِ زیبا اور زلفِ چلیبا کا دیوانہ تھا۔ تقدیر نے وہی بیلا سا معاملہ بھر ظاہر کیا۔ یعنی اِس معشوقہ نے بھی دنیا سے کوچ کیا۔ ابن صائغ نے اس کی تعزیت اور عزاداری کا اپنی طبیعتِ داری اور ملی قوت سے یہ پہلو اِیجا د کیا کہ اصولِ ہندسہ سے چاند گن کا وقت ٹھیک ٹھیک دریافت کر لیا۔ اور ایک نہایت ہی دل خیز دھن میں وہ شعر کہے جن میں چاند کی طرہ سے خطاب کیا تھا یہ شعر کہہ کے رکھ چھوڑے وقت سے اب وہ پر غم غم کے بہت سے امراءِ عیان گولے کے اُسکی قبر پر گیا۔ چاندنی رات تھی۔ جو اسے خاکِ چل رہی تھی۔ اور چاند اپنی نورانی چادر اُس نازنین مہ جبین کی ہر پرچہ پر بٹھا رہا تھا۔ تمام حاضرین پر اس دلیغِ مہ جبین ہی نے ایک بخود کی کیفیت کی رے کی کہ وہی تھا کہ ناگمان ابن صائغ نے اس وقت کو مناسب دُمن میں (جہاں سے مذاق میں شاید سو بھی ہی ہوگی) یہ اشعار لہر دار تانوں اور میزڈون کے ساتھ مہتاب کی طرف خطاب کر کے درد کے ساتھ الاپنا شروع کیے۔

وَشَرُّوْا بِكَ دُرْمِنْ بَعْدَا

شَقِيقَةُ غَيْبٍ فِي الْبَعْدَا

فَعَلَّا كَسَفَتْ فَكَانَ الْكُسُوفُ حَدَادُ الْبَسْتِ عَلَى فَعْدِ ۱۴

یعنی اسے چاند تیرا نصف نور جس کے پاس تھا وہ تو قبر میں چھپ گیا۔ اور اس کے بعد اسے چاند تو چمکتا ہے؛ لیکن میں گمن نہ لگ گیا؛ اس لیے کہ گمن اُس کے غم میں مجھے سیاہ لباس پہنا تا۔ اور مجھے غمگین ثابت کر تا۔ ان شعروں کو عمدہ سخن میں گاتے دو ہی گھڑیاں گزری ہوں گی کہ چاند میں گمن لگ گیا۔ اور عالم تیرہ و تار ہو گیا۔ یہ واقعہ ابن صانع کے عجیب و غریب واقعات میں لکھا گیا ہے۔ اُس وقت جو جواہر غرناطہ موجود تھے سب کو حیرت ہو گئی۔ اور سب کی آنکھوں سے ہمدردی نے آنسو جاری کر دیے۔

ابن صانع اندلسی کی شاعری کا کمال اُنھیں لوگوں کو معلوم ہو سکتا ہے جو عربی ادب میں ذوق سلیم رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ شاعر عربی کے لطف اور عربی زبان کی خوبیوں کو ہم ہزارہ بتائیں مگر ممکن نہیں کہ جن لوگوں کو خود ذاتی بصیرت نہیں اُنھیں کچھ بھی مزہ آئے۔ لہذا ہم اُس فخراند لو سیہ عظمیٰ فاضل کی شاعری کو چھوڑ کے اس کے دیگر حالات سے بحث کرتے ہیں۔

ابن صانع کے بعض کلمات نے کچھ ایسی مقبولیت کا رتبہ پایا کہ ضرب المثل کے طور پر تمام اسلامی دنیا میں رواج پائے۔ ان کا قول ہے کہ "الاشياء الَّتِي يَنْتَفِعُ بِهَا بَعْدَ زَمَانٍ طَوِيلٍ لَا يُضْعَفُ بِذَلِكَ حَقُّهَا" جن چیزوں کے جاننے سے ایک مدت دراز کے بعد نفع کی امید ہو اُنھیں ذکر کر کے ضائع نہ کرنا چاہیے۔ اور فرماتے ہیں "حَسْبُ عَمَلِكُ يَحْيَى مِنْ اَنْتَ" تیرا حسن عمل مجھے پروردگار عالم کے غضب سے بچا دینا رکھتا ہے۔

ابن صانع کی زندگی مغربی ہسپانیہ کی وزارت ہی میں گزری۔ اس کا بہت بڑا کمال تھا کہ وزارت کے اعظم اور انتظام مملکت کی ذمہ داریوں کے ساتھ اپنی ذاتی کوششوں سے انھوں نے اپنا نام اسلام کے بہت بڑے فلسفیوں اور اعلیٰ درجے کے علما و فضلا کی فہرست میں لکھوایا۔ ان کا شمار امروزر کے اسلام میں نہیں خیال کیا جاتا۔ وہ دنیا سے علم کے بہت بڑے منتظم ملکہ حکمران بنائے جاتے ہیں۔

عبداللہ دکن نہ ہونے ایک بار کسی ذاتی عداوت کی وجہ سے ابن صانع

کے قتل کا ارادہ کیا۔ ابن صالح نے اس موقع پر دو شعر موزون کیے جن کے ذریعہ
سے ناامیدی کے ساتھ اپنے استقلال کی تصویر دکھادی تھی۔ صرف اُن شعر دن ہی
کا اثر تھا کہ اُن مرحوم کو اس مصیبت سے نجات مل گئی۔

انسان چاہے کتنے ہی کمالات سے آراستہ ہو اور چاہے کیسا ہی فیاض
اور خوش وضع ہو مگر امارت و دولت اس کے لیے صد مہمکتب کی مصیبتیں پیدا
کر دیا کرتی ہے۔ دیکھو اسی کا نتیجہ تھا کہ عواد ولد بن نہ ہونے اُن کے قتل کا ارادہ
کیا۔ اسی وزارت کا یہ بھی نتیجہ ہوا کہ دربار پہنچنے کے تمام اطباء اور کل خوش نویس
اس فاضل گرانمایہ کے علم و دولت پر رشک کرنے لگے۔ ابن صالح کی اعلیٰ ناموری
اور اُن سب کی تناسف نے اُن کے دل میں اور آتش حسد بھڑکائی۔ آہ! اس حسد
کا انجام اچھا نہ ہوا۔ ۱۱۸۷ھ ماہ مبارک رمضان میں لوگوں نے بیگن کے سالن میں
زہر ملائے ابن صالح کو کسی فریب سے کھلا دیا۔ ابن صالح اس وقت اسپین کے
شہر فاس میں تھے۔ زہر نے فوراً اثر کیا۔ آخر اسی مہینہ میں ابن صالح اندلسی کے
ایسے فاضل بگناہ اور بے مثل فلسفی سے دنیا خالی ہو گئی۔ خدا غریقِ رحمت کرے
انھوں نے اپنے نام کو ناموری کے اس انتہائی درجہ پر پہنچا دیا تھا کہ بیشک
دنیا تو اُن سے خالی ہو گئی۔ مگر نام کسی کے ٹٹائے نہ مٹ سکا۔ ہاں اگر ضرر ہوا
تو ملک کا جو اُن کے عہدہ نظم و نسق کو یاد کر کے سالہا سال زبانِ حال سے رویا
ہو گا۔ یا اُس مغربی اند لوہیہ کے بادشاہ کو جسے پھر ایسا گرانمایہ وزیر نہ نصیب ہوا
بعض شواہد اُن کے مرثیہ میں طبع آزمائی کے جوہر دکھائے۔ اور اُن کے
دوستوں کے بھرے دلوں میں رقت کا شہید کیا۔ صاحب تاریخ الحما لکھتے ہیں کہ قاضی
ابومردان کہتے تھے میں نے اُن مرحوم کی قبر کی زیارت کی اور بن علی کے مقبرہ کا میں میں
ابن صالح کے تصانیف تقریباً چوبیس ہین جن میں سحر ایک نین کسی کسی مسئلہ فلسفہ کی
یا طبیعیہ یا علم طب و تفصیلاً بحث کی ہے۔ اکثر کتب ارسطو و جالینوس پر بطور شرح و حاشیہ ہیں
افسوس یہ وہ کن بین ہیں جو اسلامی کمالات علوم کی مراثیہ ناز تھیں مگر زمانے نے خدا جانہ انھیں کس
خفی مقام میں چھپائے رکھا ہوگا اب اُن کی زیارت کو مشتاقوں کی آنکھیں ترس گئیں شاید پرپس کے
مشہور کتب خانوں میں ہوں تو ہوں مگر اسلامی دنیا میں کیمن تپہ نہیں۔

ابو علی فارسی

”حسن بن احمد بن عبدالغفار بن محمد سلیمان مشہور ابو علی فارسی“ قدما سے اسلام میں سے ہیں۔ علم نحو کو ان کی ذات سے بہت کچھ ترقی ہوئی۔ اور مبارک فن حدیث کو اُنھوں نے خود اپنا سرمایہ افتخار بنایا۔ شیخ ابو علی طبرسی مجمع البیان میں ایک مقام پر بہت سے نحوی نازک مسائل بیان کر کے فرماتے ہیں: ”یہ سب باتیں ابو علی فارسی کے کلام سے مستنبط کر کے لکھی گئی ہیں۔ اور ابو علی تمدوح نحو کے میدان میں ایک بے مثل شہسوار تھے۔ اور ایسے بے مثل فاضل تھے کہ علم نحو کے نازک مسائل اور پوشیدہ نکات کے چہرے پر سے اُنھوں نے اپنی فکر کے ماتھوں سے پوشیدگی اور وقت کا پردہ اٹھا دیا۔“

خاک پاک شیراز کو تقدیر نے یہ عزت دی کہ اسے اس گرانمایہ عالم پر بھی غرور ناز کرنے کا موقع ملا۔ قاضی ابن خلکان فرماتے ہیں: ”ابو علی فارسی شہید ص ۲۱۷ میں شیراز کے متعلق ایک گداؤں قسانا میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ ابتدائی زمانے میں علم کا شغلہ تھوڑا بہت ضرور چلا گیا۔ مگر وہ تعلیم ایسی نہ تھی کہ اس کی بدولت اُنھیں ایک گرانمایہ عالم کا رتبہ حاصل ہوتا۔ انیس برس کی عمر تک وطن ہی میں رہے۔ اور قصبہ قسا کی فضا نے اُنھیں اپنے دامن سے نہ بچھنے دیا۔ آخر علم کا شوق پر جوش و توت سے اُن کے دل میں پیدا ہوا۔ اور اس بیتی و اضطراب کے ساتھ کہ وطن کی تمام کشیشیں مغلوب ہو گئیں اور علامہ ابو علی نے قسا کیسا سواد شیراز کو بھی چھوڑا۔ اور اُس مشہور مرجع عالم کی راہ لی جدھر اس عہد میں ہر ذوق علم رکھنے والے کا رخ قدیم طور پر پھر جایا کرتا تھا۔ وہ جب بغداد کہتے ہیں۔ ابو علی نے بغداد میں پونچ کے اکثر اہل کمال کے آگے زانو سے شاگردی نہ کیا۔ اور وہاں کے اکثر مشاہیر کے تلمذ کی عزت حاصل کی۔ ابن سراج اور زر جاج اُس عصر کے مشہور نحویین میں تھے۔ جنھوں نے لغات عرب اور اُن کی خوبی ترتیب نحوی میں اعلیٰ کمال حاصل کیا تھا۔ ابو علی نے اُن کی شاگردی کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اس رتبہ کا زبان دان ملکہ زبان عرب کا حاکم بنایا کہ پُرانے مشہور ائمہ نحو و صرف کی شہرت بھی اُن کے آگے مٹ گئی۔“

چنانچہ خود ان کے اکثر شاگردوں اور دیگر فاضل معاصرین نے خوب آزادی کے ساتھ آزما یا تو علم خود لغت میں ان کے رتبہ کو مشہور امام نحو ابو العباس مبرد کے مقابل میں بہت زیادہ پایا۔ خود ان کو بھی اس فن سے کچھ ذوق تھا اور اپنے دل میں جو وقت اس فن کی سمجھتے تھے وہ اور کسی علم کی نہیں سمجھتے تھے۔ ابن جنی ان کا شاگرد رشید کہتا ہے کہ میں نے ابو علی کو یہ کہتے سنا کہ علوم قیاسیہ میں سے کسی مسئلہ میں مجھ سے غلطی نہیں ہوئی حالانکہ علم لغت کے صد ہا مسئلہ میں غلطی کر جاؤں۔ ابن جنی اور علی ابن عیسیٰ یہ دونوں ابو علی فارسی کے ایسے نامور شاگردوں میں ہیں جنہوں نے خود بہت بڑی کامیابی حاصل کی اور علی دینا میں استاد دی کا جھنڈا بلند کیا۔ ابن جوزی جو مشہور محدث ہیں اور جن کی شاگردی پر ہمارے زندہ دل ناصح سعدی شیرازی نے بھی فخر کیا ہے وہ بحیثیت ایک محدث کے لکھتے ہیں کہ قدیم ایئم جوہری اور توحفی نے بھی ابو علی فارسی سے حدیثیں سنی ہیں اور روایت کی ہے۔ جلال الدین سوطی نے اپنی کتاب طبقات النحاة میں ابو علی کی نہایت تعریف کی ہے اور ان کے ذہن رسا کو بہت اعلیٰ درجہ کا تسلیم کیا ہے۔

آخر زمانہ میں علم عروض کی طرف توجہ کی اور اپنے تئیں اس فن میں بھی اعلیٰ درجہ کے کمال پر نہایت کیا۔ ابوالقاسم ابن احمد اندلسی کہتے ہیں ایک مرتبین ابو علی کی صحبت میں تھا۔ شعر و سخن کا ذکر ہونے لگا۔ ابو علی بولے یہ عجبات ہے کہ میں باوجودیکہ تمام اصول شعراور کلی مسائل عروض سے بخوبی واقف ہوں مگر نظم سے طبیعت کچھ ایسی نامناسب واقع ہوئی ہے کہ اگر چاہوں تو چند شعر بھی نہیں موزون کر سکتا۔ اور اصل یہ ہے کہ اس بارہ خاص میں مجھے تم سب لوگوں پر شک آتا ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا بھلا آپ نے کبھی کوئی شعر بھی کہا ہے۔ ابو علی نے جواب دیا مجھے تو نہیں یاد کہ کبھی کوئی شعر کہ سکا ہوں۔ ہاں بڑھاپے اور سفید بالوں کی تعریف میں یہ تین شعر البتہ کسی زمانہ میں کہے تھے۔

خَضِبْتُ الشَّيْبَ لَمَّا كَانَتْ عَيْنَا وَخَضِبْتُ الشَّيْبَ أَوَّلَىٰ أَنْ يَكْبَا
وَلَمْ أَخْضِبْ خُفَاةً هَجَرَ رَحْلِي وَلَا عَلِيًّا خَضِيتُ وَلَا عِثَا
وَلَكِنَّ الْكُتَيْبَ بَدَأَ دُحْمًا فَضَيَّرَتِ الْخَضَابُ لَهُ عِقَابَا

یعنی بالون کی سفیدی میں چونکہ عیب نمایاں تھا لہذا میں نے خطاب لگا لیا حالانکہ خطاب لگانا عیب کی بات ہے۔ میں نے مفارقت یا ریا کسی کے عیب لگانے یا کسی کے لغت ملامت کرنے کے خوف سے خطاب نہیں لگایا۔ بات یہ تھی کہ بالون کی سفیدی کچھ ایسے بُرے طریقے سے نمایاں ہوئی کہ صرف سفیدی کو مزادینے کے لیے میں نے اُس کے چہرے پر کالک لگا دی۔

ابو علی نے جب بغداد میں ایک بہت بڑے نامور عالم کا رتبہ حاصل کر لیا تو دیگر بلاد اسلام میں جانے کا شوق ہوا چنانچہ بغداد چھوڑ کے ارض شام کی راہ لی۔ ایک مدت تک شام کے مختلف شہروں میں پھرتے رہے پانچویں ۳۰ میں پھرتے پھرتے شہر حلب میں پہنچے۔ شہر حلب ان دنوں نہایت ترقی پر تھا۔ خصوصاً وہاں کے بادشاہ سیف الدولہ بن حمدان کی خوبیوں نے حلب کو نہایت رونق دے رکھی تھی۔ سیف الدولہ وہی نامور رئیس ہے جس کی تعریف میں متنبی نے بہت سے قصائد کہے ہیں۔ اور متنبی کا دیوان جس کی خوبیوں کی ایک دایمی یادگار رہے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیف الدولہ جیسا بہادر تھا ویسا ہی علم دوست بھی تھا۔ جس طرح اس نے متنبی کو اپنے دامنِ کرم میں لے لیا تھا اسی طرح اس نے ابو علی فارسی کی بھی قدر دانی کی۔ اور گوارا نہ کیا کہ ایک ایسا فاضل گانہ اُس کی قلمرو میں آئے اور بے نیل مرام چلا جائے۔ متنبی بھی ایک ایسا شاعر ہے جس کے کلام کو اس کے عہد میں مقبولیت عامہ کا خلعت مل چکا تھا۔ اور جس کا دیوان شاید دنیا کے آخری دور تک اہل مذاق و اہل علم کا نہایت دلچسپ مشغلہ رہے گا۔ ابو علی کو بھی فن لغت اور زبان عرب کی تحقیق ہی میں دعویٰ تھا۔ ایسے دو ہجسون کے ایک جگہ رہنے سے جو باہمیہ اور بامزہ لوگ جھوک اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے وہی متنبی اور ابو علی میں بھی پیدا ہوئی ان دونوں بے مثل مدعیانِ ادب کے باہمی مناظرے تفصیلاً بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان کو کلمہ کے پیش کرین تو لوگوں کی بالکل دلچسپی نہ ہوگی۔ جسے شوق ہو وہ خود دیکھ لے۔

ابو علی فارسی چند روز بیان رہے تھے کہ دل کچھ ایسا جاٹ ہوا کہ حلب کو بھی خیر باد کہی۔ اور اس مرتبہ حلب سے کیا قدم نکالا ارض شام ہی کو چھوڑ دیا۔

شاید اتنے دنوں کے بعد انھیں وطن مالون یاد آ گیا کہ حلب سے روانہ
 ہوتے ہی ایران کو روانہ ہوئے۔ اور ارض فارس کی راہ لی۔ ایران
 کا مغربی صوبہ دیلم پہلے ملا۔ وہیں ٹھہر گئے۔ اور عضدالدولہ دیلمی کی صحبت
 سے بہرہ یاب ہوئے۔ مگر عضدالدولہ کو ان کے ساتھ کچھ ایسا حق عقیدت
 ہو گیا کہ علامہ ممدوح کی تعظیم و تکریم میں اکثر وہ اپنے مرتبے کو بھول جاتا تھا
 چنانچہ ایک مرتبہ بے تکلفی کے جو جس میں اس کی زبان سے نکل گیا۔ "مین ابو علی
 کے غلاموں میں سے ایک ادنی غلام ہوں" لیکن باوجود اس قدر دانی
 اور خود فراموشی کے ایک بار عجب اتفاق ہوا۔ ابو علی فارسی نے ایک کتاب
 علم نحو میں عضدالدولہ کے نام پر تصنیف کی۔ اس کتاب کا نام ایضاح رکھا تھا
 عضدالدولہ نے وہ کتاب دیکھی تو اس کی نظر میں نہایت حقیر ثابت ہوئی۔ اور ابو علی کی طر
 متوجہ ہو کے کہنے لگا۔ "جناب! اس کتاب سے تو مجھے کوئی نئی بات نہیں معلوم
 ہوئی۔ اس میں وہی معمولی باتیں ہیں۔ یہ تو اس قابل ہے کہ کتبے بچوں کو دیجاے۔"
 یہ جملہ سن کے ابو علی کو نہایت ندامت ہوئی۔ بادشاہ کے سامنے اور کوئی جملہ
 نہ کہہ سکا۔ دل کے خیالات دل ہی میں فرو کیے اور دیم چھوڑ کے آگے کی راہ لی۔ دیلم
 سے جانے کے بعد شیخ ابو علی نے علم صرف میں ایک اور کتاب لکھی جس کا نام تکملہ
 ہے۔ یہ کتاب نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی تھی۔ صرف چوٹ کرنے کی غرض سے
 وہ کتاب بعد تکمیل عضدالدولہ کے پاس بھیجی کہ وہ اپنی گزشتہ گستاخی پر نادم ہو عضدالدولہ
 نے اس کے دو تین جملہ ہی دیکھ کے اہل دربار کی طرف متوجہ ہو کے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے
 شیخ کو میرے اس جملہ پر غصہ آ گیا۔ اسی وجہ سے یہ ایسی کتاب لکھی ہے جس کے نکات
 تک میرا ذہن کسی طرح پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اور نہ امید ہے کہ اور کوئی سمجھا سکے۔"
 ایک بار شیخ ابو علی عضدالدولہ کے ساتھ شیراز کے صحابہ میں سیر کر رہے تھے۔
 راستہ میں عضدالدولہ نے پوچھا۔ "قَامَ الْقَوْمُ الْاَذْيَدَا"۔ "میں کتنی کو نصب کس
 عامل کی وجہ سے ہے؟" شیخ نے کہا اس موقع پر اسٹن فعل محذوف کیا جائیگا۔
 اور سمجھا جائے گا کہ زید اس کا مفعول ہے۔ اس تقریر پر عضدالدولہ نے اعتراض
 کیا کہ کیا ضرور ہے ہم فعل اسٹن ہی محذوف کریں۔ میں کہتا ہوں کہ امتنع فعل محذوف ہے۔

لہذا زید کو اس کا فاعل ہونا چاہیے۔ ابو علی نے بہت غور کیا مگر اس وقت کچھ جواب بن نہ پڑا۔ عضد اللہ ولہ سے کہا: "میں گھر میں جا کے اس پر غور کروں گا۔" اور آپ کو جواب صاحب دون گایہ علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ابو علی نے گھر میں جا کے غور کیا اور عضد اللہ ولہ کو ایک ایسی عمدہ بحث اس مسئلہ کے متعلق لکھی کہ اُس نے نہایت پسند کی۔ مگر شیخ ابو علی نے اپنی کتاب ایضاح میں اس مسئلہ کی کچھ اور ہی صورت بیان کی ہے جس کی تصریح اس وقت ہو سکتی ہے جب استشار کی پوری بحث ذہن نشین کر لی جائے۔ لہذا ہم اس سے درگزر کرتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں کہ عضد اللہ ولہ کو اپنے عم زاد بھائی عز اللہ ولہ بختیار بن معز اللہ ولہ سے جو بغداد میں تھا نہایت عداوت تھی۔ اُس کے مقابلہ کی غرض سے عضد اللہ ولہ نے بغداد کا ارادہ کیا۔ ابو علی سے ملاقات ہوئی تو عضد اللہ ولہ نے اُن سے ہمراہ چلنے کی درخواست کی۔ ابو علی نے جواب دیا کہ: "ہم لوگ تو دعا مانگتے والوں میں ہیں۔ ارٹنے والوں میں ہمارا شمار نہیں۔ آپ ہی تشریف لے جائیے خدا آپ کو کامیاب کرے۔" اور بانیل مرام واپس لائے "یہ کہہ کے علامہ ابو علی نے دو شعر پڑھے جن میں رخصت کا مضمون نہایت درد و جوش کے بھر میں ظاہر کیا تھا۔ عضد اللہ ولہ نے اجازت دی کہ اچھا آپ ہمیں تشریف رکھیے مجھے آپ کی ہمراہی کے بہ نسبت آپ کی دعا پر زیادہ اعتماد ہے۔"

ابو علی فارسی نے علم نجوم میں خاص اجتہاد کیے ہیں۔ اور اکثر مسائل میں قدما علم نجوم سے مخالفت کی ہے۔ جو شخص ان مباحث کو دیکھے کچھ دہی خوب سمجھ سکتا ہے کہ علم نجوم عربیت میں ابو علی نے کیا کمال حاصل کیا تھا۔ اور زمانہ نے اُنہیں کتنا بڑا مجتہد ٹھہرانے کے جمہور علماء کے سامنے پیش کیا تھا۔ آخر میں اُن کے خیالات نہ ہی میں بھی کچھ تغیر پیدا ہو گیا اور اسی وجہ سے اکثر لوگ کا خیال ہے کہ علامہ ابو علی اپنے عقائد کو اس فقہ سے بچانے سکے جو عباسیہ کے ابتدائی دور میں پیدا ہوا تھا۔ اُن دنوں اعتزال کا دور دورہ تھا۔ اور اس اثر نے شیخ ابو علی کو بھی عام نگاہوں میں معتزلی ثابت کر دیا۔ اور شاید اس اعتزال ہی نے اُن کو آخر میں پھر بغداد کی ہوا کھلائی۔ لیکن اس مرتبہ کا آنا ایسا تھا کہ پھر وطن جانا نہ نصیب ہوا اور یہیں زندگی تمام ہو گئی۔ نوے برس سے کچھ زیادہ عمر کو پہنچے تھے کہ قضاۃ الہی نے پیام مرگ سنا۔ اسی سال ۳۷۷ھ میں دارالسلام بغداد میں انتقال کیا اور مدفونہ شریفہ میں دفن کیے گئے۔

علامہ بن خلکان کہتے ہیں ^{۳۴} ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں قصبہ قلیوب کی طرف جو قاہرہ کے نزدیک ہی واقع ہے چلا جاتا ہوں۔ اتفاقاً ایک ایسے عالیشان باغ اور محل پر گزر رہا ہوں کہ اس کی رفعت شان نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں اندر گیا تو میں شخص نے۔ اُن کی طرف متوجہ ہو کے میں نے پوچھا یہ کس کا مکان ہے؟ اُنھوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن میں سے ایک شخص کہنے لگا کئی برس تک اس محل میں ابو علی فارسی رہے ہیں اور ہم سے اُن سے بہت صحبت رہی ہے ہم لوگوں کو اُن کی صحبت کی اور سب باتوں کے علاوہ چند اشعار میں ایسا لطف آیا کہ وہ کبھی نہ بھولیں گے۔ میں نے کہا ابو علی کے ایسے اشعار جو ایسی تصنیف کے مستحق ہوں میں نے کبھی نہیں سنے۔ میرے خیال میں تو اُنھیں شعر کہنے کا زیادہ ملکہ ہی نہ تھا۔ اُس شخص نے یہ سن کے تین شعر پڑھے

واقعی ان اشعار میں کچھ ایسی لذت تھی کہ مجھے وہ اشعار تو نہیں یاد رہے مگر لذت آج تک باقی ہے۔ بلکہ اُن میں سے ایک شعر ابن خلکان کو یاد رہا تھا۔ جس کو اُنھوں نے اپنی تاریخ میں نقل بھی کیا ہے۔

ابو علی فارسی کی تصانیف میں مورخین نے سترہ کتابیں گنوائی ہیں جو دقتی نہایت قیمتی ہیں۔ سب کو تعلق فن لغت اور عربیت سے ہے۔ اور نحو میں کے مختلف گروہوں کے اصول سے اُن تصانیف میں عہدگی کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔ اور نہایت شائستگی سے زبان عرب کے اصول دکھائے گئے ہیں۔

پہلو

خلاصۃ التوقیم۔ ۱۸۰ + ۲۲ سائز کے بہت عمدہ چمکے کاغذ پر چھپی ہوئی ۱۳۱۵ء کی اسلامی تقویم ہے۔ جس کی پیشانی روضۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگین نقشہ سے مزین ہے جس میں سید محمد علی کی تاریخوں کے ساتھ نین عیسوی و ہندی و فصلی الٰہی کی تاریخوں کے علاوہ طلوع و غروب کے اوقات اور ابتداء صبح صادق و زوال آفتاب کے اوقات بھی دکھلائے گئے ہیں کیفیت کے خاتمے میں شہور مشہور بابین بھی لکھی گئی ہیں۔ رمضان شریف کا انتہائی وقت سحر اور افطار کا صحیح وقت اور سورج گہن کا نقشہ بھی موجود ہے غرض کہ وہ بات کو کہہ کر میں عرض دیا جو ساری تقویم مختلف رنگوں سے چھپنے کی وجہ سے جی بہت خوشنما معلوم ہوئی ہے قیمت کا حال معلوم نہیں کیا لیکن حاجی محمد بن شرفین علی بخاری و شرف علی صاحبہا ابراہان کتب دکان بمشہر بغدادی بازار بمبئی سے طلب فرما ہیں۔



کفایت شعاری

سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو دگلڈز

اپریل ۱۹۲۷ء

درحقیقت کسی شخص کو اپنی زندگی کی ضروریات کی زیادہ فکر نہ کرنی چاہیے۔
 نیچر تم سے انگٹا کم ہے اور دیتا بہت ہے۔ بخلاف اس کے بیش و عشرت کے سالوں میں
 بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے جیسا کہ سنگھن نے کہا ہے کہ جتنا کہ وہ ایک بُرے
 کام میں صرف ہوتا ہے اتنے میں دو بچوں کی اچھی طرح پرورش ہو سکتی ہے۔
 یاد رکھو کہ قول ڈلوک آف ولینگٹن کے جہاں روپے پر سود
 زیادہ ملتا ہے وہاں اصل روپیہ محفوظ نہیں ہے۔
 ایک ٹوکرے میں حد سے زیادہ انڈے نہ رکھو۔ تمھاری سمجھ چاہے کسی
 ہی اچھی ہو۔ اور تم نے چاہے کسی ہی اچھی طرح ایک معاملے میں غور کر لیا ہو مگر
 پھر بھی ممکن ہے کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے کہ تمھارا حساب درہم بحرم ہو جائے
 دانائین سوداگر اور مہاجن بھی غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک سمجھ دار کاروباری آدمی
 بس اتنی ہی امید کر سکتا ہے کہ میں نے جو سوچا ہے وہ عام طور سے ٹھیک اُڑے
 گا۔ ہم اپنے بچپن میں یہ سمجھتے ہیں کہ دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ لیکن دو اور دو
 بائیس بھی ہو جاتے ہیں۔

لہ انگلستان کے شاہزادہ ان انڈیا راون میں رکن اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ اسکی تحریر
 حیرت انگیز سمجھی جاتی تھی بلکہ اس میں پیدا ہوا تھا۔ اور ابھی چند روز ہوئے مرا ہے
 ڈلوک آف ولینگٹن انگلستان کا ایک نامی اور زبردست سیال اور لائق وفاق برسلطنت تھا
 جسے بخر حاصل کر کے نیپولین بونا پارٹ اسی کے ماتم میں گرفتار ہوا۔ بلکہ اس میں پیدا ہوا اور ۱۸۰۷ء میں مرا۔

محلات کو غموشی کے ساتھ چلاؤ اور دوسروں کی بابت یہ نقل شہور ہے کہ وہ اتنی دیر بھی ساکت نہیں رہ سکتا تھا کہ اس کی تصویر کھینچی جاسکے۔ لہذا اسکی تصویر میں ہمیشہ عیب ہو جاتا تھا۔

نتیجہ نکالت کہا کرتا تھا کہ ”بہت لوگ کاروبار میں صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئے کہ وہ ایک کمرے یا دوکان میں خاموش نہ بیٹھ سکے۔“

ایک معنی کو ہر شخص کاروباری آدمی جو چاہے کاروباری ہو نا چاہے یا نہ چاہے۔ ہم سب کو فراغتی ادا کرتے ہیں۔ مکان کا انتظام دیکھنا ہے۔ اور اپنے اخراجات کو ترتیب دینا ہے۔ چھوٹے چھوٹے محلات بھی بعض اوقات بڑے بڑے محلات کی طرح مشکل اور تکلیف دہ ہوتے ہیں۔

خوش قسمتی سے کاروبار میں کامیابی لیاقت سے کین زیادہ زود فہمی ہوتا ہے اور دعبان پر منحصر ہے۔ ایک پرانے طرز کی مثل جو کہ ”تم دوکان بھری رکھو! دوکان یقین بھرا کر رکھو گی“ نہ تو فہم نہ ہی اسی قسم کی ایک روایت لکھی ہے کہ ایک فارس کا بادشاہ اپنے ایک عمدہ گھوڑے کو بہت جلد تیار کرانا چاہتا تھا۔ لہذا اس نے اُن لوگوں سے جن کو کہ اس علم میں دخل تھا پوچھا گھوڑے کو سب سے جلد کیا چیز تیار کر دے گی۔ جس کا جواب یہ ملا کہ ”مالک کی نظر“

اس بات کی بہت ضرورت ہے کہ انسان اپنے تئیں اُن عادتوں کا عادی کرے جو کاروباری لوگوں میں ہونی چاہئیں۔ بہت عرصہ نہیں گزرا کہ میرے ایک دوست نے جو بہت شہور و معروف آدمی تھا مجھے یقین دلایا کہ جب میں نے اس بات پر غور کیا کہ اُن لوگوں کی اِکائی کی کیا وجہ ہوئی جو بہت بڑے قابل اور نہایت عمدہ حال چلن کے آدمی تھے تو مجھ کو اکثر حالتوں میں یہ معلوم ہوا کہ وہ دست اور کابل تھے۔

۱۷۰۰ء اور ۱۷۰۱ء میں انشا بردار اور مسدود صاحب اثر و برسلطن تھا۔ ۱۷۰۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۷۰۳ء میں مر گیا۔ ۱۷۰۴ء میں نکاح غالباً وہی شخص جو جس کا نام بارہا تھا اِنگھستان کا ایک ناول نویس تھا۔ اور ۱۷۰۵ء میں مل۔ ۱۷۰۶ء میں ان کے شہسوار تھے۔ کا ایک مشہور جنرل فلسفی اور مورخ جسے سفرا کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ حضرت مسیح سے ۱۷۰۷ء سال پیشتر پیدا ہوا۔ اور ۱۷۰۸ء سال قبل مر گیا۔

اُن میں وقت کی پابندی نہ تھی۔ دوسروں کے ساتھ دل لگا کے کام نہ کر سکتے تھے اور ذرا ذرا سی بات میں صدمہ کرتے رہتے تھے۔ یعنی درحقیقت اُن میں کاروباری آدمیوں کی سچی عادتیں نہ تھیں۔

چھوٹے چھوٹے امور میں بھی بڑے بڑے امور کی طرح ترتیب اور صفائے کی سخت ضرورت ہے۔ ہر ایک چیز کو اس جگہ رکھنا جہاں وہ لازماً نہایت ہی عمدہ قاعدہ ہے اور اگر تم ذرا سی تکلیف اٹھا کے اُن چیزوں کو جن کا اب تم کو کام نہیں رہا ہے اُن کے معینہ مقام پر رکھ دو گے تو پھر جب کبھی تم کو اُن کی ضرورت ہوگی تو بہت آسانی سے مل جاویں گے۔

نوفوں کتنا عرصہ میرے نزدیک بے ترتیبی ایسی ہی اچھی ہے کہ کوئی کسان بجائے اسکے کہ ہر قسم کے اناج کو علیحدہ علیحدہ رکھے اپنی کوٹھری میں گیہوں جو درستر سب کو ایک ہی شکل میں بھر دے۔ اور جب اُسے گیہوں تو یا ستر کی روٹی پکانے کی ضرورت ہو تو اُس اناج کو ایک ایک دانہ جن کے الگ کرے۔ اسی بارے میں اُس نے ایک جہاز کی مثال بھی پیش کی ہے۔ وہ کتنا ہے۔

جب سمندر میں طوفان آجاتا ہے تو اتنا وقت نہیں ملتا کہ جس چیز کی ضرورت ہو اُس کو ڈھونڈھنے بیٹھیں۔ یا ایسی چیز کو استعمال کریں جو شکل سے کام میں لائی جاسکتی ہو۔ کیونکہ دیوتا غافل آدمیوں کو دھمکانے اور سزا دیتے ہیں۔ اگر دیوتا صرف اُن لوگوں کو غارت کرنے سے چھوڑ دیں جنہوں نے کوئی بُرائی نہیں کی ہے تو ہم کو اس پر قناعت کرنی چاہیے۔ اور اگر وہ ان لوگوں کی جان بھی بچا دیں جو ہر ایک چیز کی ٹھیک طور سے خبر رکھتے ہیں تو ہم کو اُن کا شکریہ ادا کرنا چاہیے لہذا ہر ایک چیز کو اس کی مناسب جگہ میں رکھو۔

ارسطو طالیس سے لے کر کارلائل تک جتنے فلاسفہ گذرے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے اہل حرفت و تجارت کی بہت زور سے مذمت

لے ارسطو طالیس نامی گریونانی حکیم فلسفہ مشائی کا موجد اور منطق کا پہلا استاد جسے مسلم اولیٰ کا خطاب دیا گیا ہے۔ حضرت مسیح صلی اللہ علیہ وسلم ۱۱۰۰ء اور ۱۱۲۳ء میں پچھلے مرا۔ ۱۱۰۰ء کا کارلائل اسکاٹ لینڈ کا ایک زبردست اور عجیب و غریب قوت کا انشا پر داند تھا۔ ۱۱۹۵ء میں پیدا ہوا۔ تیسریں جلیس برس ہوئے مرا۔

کی ہر بات کو کنا چاہیے کہ انھوں نے حرفت و تجارت کو بہت حقارت و ذلیل سمجھا ہے
فلاطون نے اپنے اصول جمہوری میں سے سوداگروں کو شہری ہونے کے
 حقوق سے بالکل خارج کر دیا ہے۔ اور یہ ذلیل کام صرف غیر ملک والوں کے
 واسطے چھوڑ دیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو کریں۔ چونکہ بہت لوگ ایسے ہیں جن کو حرفت
 و تجارت جمہوری کی حالت میں کرنی پڑتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ حرفت اور
 تجارت کا اثر چال چلن پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا چال چلن بگڑ جاتا ہے اور
 نیز وہ ماعنی تربیت کے واسطے ناموافق ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات تھی۔ لیکن
 خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہے۔ بیشک کاروباری لوگ اپنا بچا ہوا وقت دوسرے کاموں
 میں بھی صرف کر سکتے ہیں۔ اس بارے میں صرف سائنس اور لٹریچر سے مثالیں فراہم
 کروں گا۔ **انیس** مائیکھ مصور بھی تھا اور علم نجوم بھی جانتا تھا۔ **گروٹ** مورخ
 بھی تھا اور مہاجن بھی سر جے **الوالش** کا قد بنانے والا بھی تھا۔ آثار قدیمہ کی
 جستجو کرنے والی **سوسائٹی** کا پریسیڈنٹ بھی تھا۔ اور خواجه بھی تھا۔ **برسٹ** پہلے سوداگر
 بعد ازاں آکس فورڈ یونیورسٹی میں علم معنیات کا پروفیسر مقرر ہوا۔ **روجرس**
 مہاجن اور شاعر تھا۔ **سٹرٹ** مہاجن اور شاعر اور میرا باب خود بیشک اور علم ریاضی کا جانتے
 والا تھا اور بہت زمانے تک **رائل سوسائٹی** کا خزانچی اور **والش** پریسیڈنٹ تھا اور
 بھی بہت سے لوگ ایسے ہی گذرے ہیں۔

کارلائل نے بازار کے بہت ہی گرجانے کے وقت خریدنے اور بازار کے

۱۵ء **فلاطون** یونان کا سب سے نامی گرامی فلسفی الہیات کا ماہر اور سقراط کا شاگرد و شاگرد
 تھا۔ حضرت مسیح سے ۴۰۰ سال پیشتر پیدا ہوا۔ اور ۳۰۰ سال پیشتر مر گیا۔

۱۵ء **انیس** مائیکھ ایک زبردست انجینئر اور بہت سی مکون کا موجد تھا۔ جو سنہ ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا تھا
 اور اسی صدی کے آخر میں مرا۔

۱۵ء **گروٹ** نے اپنی یونان کی تاریخ سے نہایت ہی مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ ۱۵۷۰ء میں
 پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۶۰۰ء میں مرا۔ ۱۵۷۰ء میں **الکسان** کا ایک نامی گرامی شاعر گرا۔ جو سنہ ۱۶۰۰ء
 میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۶۰۰ء میں مرا۔ ۱۵۷۰ء میں **برسٹ** ایک انجمن مقبول شاعر تھا۔
 جو سنہ ۱۶۰۰ء میں پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۶۰۰ء میں مرا۔

بہت زیادہ چڑھے ہونے کے وقت بیچنے کے اصول پر بہت زور دشواری سے اعتراض کیا
 ہے۔ وہ یہ رائے دیتا ہے کہ ہم کو روٹی کی کم سے کم قیمت مقرر کر دینی چاہیے یعنی کم سے کم جو
 مقرر کر سکتے ہوں مقرر کر دین پھر نہ گھٹائیں نہ بڑھائیں۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ اور چیزوں
 کی بھی قیمت معین ہونی چاہیے۔ اور ہم کو یہ کہنا چاہیے کہ فی الحال ہم روٹی کے اور زیادہ
 ارزان کرنے کی کچھ پروا نہیں کرتے، اور ہم کو دوسری قوموں سے سستانہ بیچنا چاہیے۔
 ”بھائیو تم دوسری قوموں سے سستانہ بیچیں گے ہم اس نرخ پر بیچیں گے جو
 بھاؤ کہ اور دونوں نے لگا دیا ہے۔“ اس بات میں صرف اتنا ہی نہیں کہ اس پر عمل درآمد
 نہیں ہو سکتا بلکہ بالکل غلط بھی ہے۔ اگر ہم سو فی چیزیں کم بیچیں گے تو یہ بھی ضروری ہے
 کہ اُن کے مقابلے میں ہم کھانے کی چیزیں کم خریدیں گے۔ کار لائل خود اس بات کا
 معترف ہے کہ کم دام پر بیچنے سے مال زیادہ کمنا ہے پھر اگر اس کے قاعدے پر عمل کیا
 جاوے تو انسان کو کپڑے کی ضرورت ہوگی۔ گروہ مقرر قیمت نہ دے سکیں گے۔ ہم کار لائل
 کی بتلائی ہوئی قیمت سے کم پر بیچنے کو بیچ لیتے۔ گروہ ہمیں کم پر بیچنے سے روکتا ہے۔
 لہذا یہ بات لازمی ہوگی کہ دوسروں کو کپڑا نہ ملے گا۔ اور ہم کھانے سے غورم رہیں گے
 تجارت کا اصل اصول یہ ہے کہ جو چیز یقین بہت سستی مل سکتی ہو اسے اُس چیز کے بدلے
 میں دو جو نہ مل سکتی ہو۔ جب نرخ گھٹا ہوا ہو اس وقت خریدنا اور جب چاؤ چڑھا ہوا ہو
 اس وقت بیچنا صرف اسی قدر نہیں کہ تجارت کا ایک مزدوری اور مسئلہ قادر ہو جگہ پر کہ
 اس سے بہتر کوئی اور اصول مل ہی نہیں سکتا۔ اس طریقے سے تم اُن شخصوں سے خریدتے
 ہو جن کو کہ اپنی پیداوار بیچنے کی بہت ضرورت ہے اور اُن لوگوں کے ہاتھ بیچو گے جن
 کو تمہارے اشیاء کے خریدنے کی بہت ضرورت ہوگی۔ اس نے سوا اور کوئی طریقہ
 تجارت ایسا ہو گا کہ جیسے کوئی شخص نیو کیل میں کو لا بیچنے لے جاوے جان اس کی
 کاہ جی مصرع بشوخی جو فلفل ہندوستان۔ جتنے لوگ بہت بڑے خوش و خرم اور
 نیک گذر سے ہیں اُن میں زیادہ حصہ نہیں لوگوں کا ہے جو غریب آدمی تھے۔ اور دوس
 ور تھو اور اس کی بہن کی صرف تیس شلنگ ہفتہ وار آمدنی تھی اور میں یقین کرتا ہوں
 کہ یہ زمانہ اُن کی بہت خوش و خرمی کا زمانہ تھا اگر امیر ہونا تمہاری قیمت میں نہیں ہے
 تو کوئی مضائقہ نہیں میل جول اور انس و محبت سے یقین کوئی سادہ سی جگہ

کوئی ٹوٹا بھوٹا جھوٹا اور کوئی پیاری شکل ضرور مل جائے گی جس کے لئے سے ایسے خوش ہو گئے کہ گویا تم کو تمام دنیا مل گئی۔

یہ واقعی بہت تعجب کی بات ہے کہ بڑے بڑے لوگ اکثر مغفلس ہی ہوتے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول زیادہ مبالعہ نہیں ہے کہ خدا نے جتنے پیغمبر مبعوث کیے سب چر دا ہون لہی میں سے منتخب کیے گئے تھے۔

ایک شاعر کہتا ہے۔ اے زر تو خدا نے ولیکن بخدا ستار عیوب قاضی الحما جاتی۔ مگر روپیہ کی قوت کو مبالعہ کے ساتھ بیان کرنا ایک عام غلطی ہے۔ ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ روپیہ ہمارے واسطے کیا کر سکتا ہے۔ اول کھانے کے معاملے میں دیکھو **سر آرمیٹیل** کا قول ہے۔ اگر امیر آدمی تندرست رہنا چاہتا ہے تو اس کو لازم ہے کہ غریب آدمی کی طرح رہے۔ صبح کے ناشتہ کی واسطے چارہ کافی۔ روٹی۔ کھن۔ یا ایک انڈے۔ بجھلی اور شہد سے بڑھ کے کون چیز ہو سکتی ہے؟ دوپہر کے کھانے کے لیے روٹی۔ پیتر اور تیر کے ایک گلاس سے بڑھ کر اور کون سی نعمت ہے۔ بھوک کے وقت سادی غذا جو اچھی لگی ہوئی ہے ویسی ہی مزے دار معلوم ہوتی ہے جیسا کہ **لالہ ڈمر کی** دعوت کا کھانا صحت بخش اور عمدہ غذا میں اگر گڑ نہ لگی ہو تو کچھ بہت زیادہ نہیں صحت ہوتا۔ لیکن ہاں اگر وہ بگڑ جاتی ہے تو مزہ نہیں باقی رہتا ہے۔ ایک انڈے میں عموماً وہی مزہ ملتا ہے جو کہ دعوت کے کھانوں میں ملتا ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں اس سے بھی زیادہ لذیذ معلوم ہوتا ہے۔

اور کتابوں کے معاملے میں؟ واقعی دراصل غریب وہی شخص ہے جس کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہے کہ جن کتابوں کو پڑھنا چاہتا ہے انہیں خرید نہ سکے۔ عمدہ کتابیں مثل انجیل۔ اور شکسپیر اور ملٹن وغیرہ کے تصانیف کے اب اس قدر ارزان ہیں بیان سے باہر ہے۔

۱۵ لندن میں وسطا شہر کے پولیس پرایک مزدور عمدہ دار حکمران رہا کرتا ہے جس کی حیثیت کو تو بال سے بڑھ کر بہت بڑے مزدور دار کی ہوتی ہے۔ ہر سال نیلا رڈ پر منتخب ہوا کرتا ہے۔ وہ منتخب ہوتے ہی عام شرف و سزین کی ایک بڑی بھاری دعوت کیا کرتا ہے اور اس دن شہر میں ہر جگہ جشن ہوتے ہیں۔ اس دعوت کا کھانا الحفلات میں مشہور ہے۔

کیا روپیے سے خدرستی عقل۔ دوست۔ خوبصورتی۔ یا خاندانی فارغ البالی ہو سکتی ہے۔^{۹۹} کنفیو شیس کتا ہے۔ "ڈلوک آن ٹیک بہت ہی امیر آدمی تھا مگر اس سے کسی شخص کو محبت نہ تھی اور پیکی کی بھوکوں مر گیا مگر اب تک لوگ اُس کے واسطے رنج و الم ظاہر کرتے ہیں۔

علاوہ برین ٹیک کتا ہے کیا دولت خوشی دے سکتی ہے؟ اپنے چاروں طرف دیکھو کہ کیسے کیسے امیر تباہی اور تکلیف میں مبتلا ہیں اور کیسے کیسے دولت مند مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں ان لوگوں کی چمک دمک پر حسد نہیں کرتا۔ اور نہ میں اُن کے اُن طمع کیے ہوئے آلام پر ششک کرتا ہوں۔

لیکن کتا ہے لوگ جب بہت زیادہ مالدار ہو جاتے ہیں تو بالکل آپے سے باہر ہو جایا کرتے ہیں۔ اور جب وہ کاروبار کے جھنجھٹ میں پھنس جاتے ہیں تو انہیں اتنا وقت بھی نہیں ملتا کہ اپنی جسمانی یا دماغی صحت قائم کرنے کی طرف توجہ کریں۔

یٹریان سب خراب ہی ہوتی ہیں۔ چاہے وہ سونے ہی کی کون نہ ہوں۔ روبہ ہزار دن فکر و ن کا گھر ہے۔ جس طرح مفلسی میں افکار ہوتے ہیں ویسے ہی امیری بھی فکر و ن سے خالی نہیں ہے۔ اور بہت سے لوگ ایسے مالدار ہیں جو اسی میں دیکھو تو روپیے کے مالک نہیں بلکہ اُس کے بندے ہیں۔ **بیش ولسن** کا قول ہے کہ "بہت سی حالتوں میں دولت جن لوگوں کے پاس ہوتی اُن سے ان کو ضرر نکرتی ہے نہیں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ باعث اذیت ہوتی ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ بہت لوگ روپیے ہی کی وجہ سے تباہ ہو گئے اور عموماً امیر لوگ جتنے روپیے کے معاملے میں متروک ہوتے ہیں اتنے غریب لوگ نہیں ہوتے۔ دولت عقلمندوں کے سوا کسی کو خوشی نہیں دیتی۔

میں جس آدمی کو امیر ہونے کا حد سے زیادہ شوق ہے وہ ہمیشہ غریب ہی رہے گا۔ **رسکن** کتا ہے۔ چھوٹے مکان میں رہنا اور وارے گ کے قصر کو تعجب کی

لے ٹیک انگلش قوم کا ایک مشہور اور نامی شاعر اور نفا پر داز گرد رہے علامہ میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۷۶ء میں مر گیا۔

نگاہ سے دیکھنا بہ نسبت اس کے کہ دارگ کے قصر میں رہیں۔ اور کوئی ایسی چیز نہ ہو جسے دیکھ کر حیرت معلوم ہو شاید زیادہ سرت بخش ہو گا۔
اگر دولت سے لطف اٹھانا چاہتے ہو تو یقیناً چاہیے کہ اُس سے اپنا دل نہ لگاؤ
شیخ سعدی کا قول ہے کہ "کافی چیز تم کو لے جائے گی۔ لیکن اگر وہ زیادہ ہو جائے گی
تو یقیناً اُس کو لے جانا پڑے گا" نہ بہر اُشتر سوارم نہ چواشتر نہ یہ بارم نہ خداوند
رعیت نہ غلام شہر یارم نہ غم موجود پریشانی معدوم نہ دارم نہ نفسے میسر نہ آسودہ
و عمرے بسر آرم۔

لیکن کا قول ہے "واقعی دل کے واسطے بہت ہی تکلیف دہ حالت ہے
کہ خواہش بہت کم چیزوں کی ہو اور ڈر بہت باتوں کا ہو" شکسب لکھتا ہے۔ اگر تو
امیر ہے تو بیشک تو غریب ہے۔ کیونکہ مثل ایک گدھے کے جس کی پیٹھ دھاتوں
کے بوجھ سے ٹوٹی جاتی ہو تو اپنی دولت کا بوجھ لادے ہو سفر کرتا رہتا ہے
بیان ہمساکہ موت اس بار کو تیری پیٹھ پر سے اتار لیتی ہے" اور لکھتا ہے کہ
ہم آئندہ کے واسطے روپیہ جمع کرنے کی فکر میں اپنی جان کیوں گنوائیں؟ کیا یہ
مال و دولت جب ہمیں بیماری کی اذیت ہوگی تو اُس سے بچالے گی؟ کیا یہ بیمار
دل کو یہ خوش کر دے گی؟ یا بیماری دل جمع کر دے گی؟ کیا یہ دولت ہماری زندگی کو ایک
نفس کی مقدار بھی زیادہ کر دے گی؟ یا موت کی تکلیف دہ وقت میں ہم کو تسکین دے گی؟

دولت سے لالچ بہت بڑھ جاتا ہے اور وہ بڑے لذت مند بن جاتا ہے کہ کتنا ہے کہ مجھ کو زمین
زمین کی چندان پر وائیں ہیں۔ میرے پاس ایک آدھ جاگڑا زمین ہے کہ وہ کچھ تنک
میں جمع کیا ہوا روپیہ ہنڈی یا ایک چھوٹا سا ریلوے کا حصہ مجھ کو دید و بین
صرف یہ چاہتا ہوں کہ قسمت مجھ کو جتنا کہ میں خرچ کر سکوں اُس سے ذرا زیادہ
دیدے؟

سینیکا لکھتا ہے "غریب آدمی کو بہت چیزوں کی حاجت ہے لیکن لالچی آدمی

لے لے جوہ جان لے۔" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کا بہت اعلیٰ اور مستند شاعر اور مصنف تھا
جو ۱۷۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۴۳ء میں مر گیا۔ ۵۵ء و نڈل امریکا کا ایک نامی گرامی شاعر اور
حبیب تھا۔ وہ ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوا۔ اور آخر صدی میں مر گیا۔

ہر ایک چیز کا محتاج ہے۔

یہ طنز یہ کہا گیا ہے کہ اگر دو بیس اور نیل کا معاملہ نہ ہوتا تو بہت سے اچھے شومرونی پیدا ہو جاتے۔

لیکن کا قول ہر دولت کی مسلسل جستجو ہمارا بہت وقت لے لیتی ہے باوجود کہ ہم کو اس سے زیادہ عمدہ چیزوں کو مشاہدہ کرنا چاہیے کہ دولت صرف اس لیے اچھی ہے کہ اس سے زندگی کو فائدہ پہنچے نہ کہ زندگی سے دولت کو فائدہ حاصل ہو۔ مال از بہر آسائش عمر است نہ عمر از بہر گرد کردن مال۔ یہ ایک کہاوت ہے کہ مفلسی طالب علم کی دھن ہے اور ایمرسن کہتا ہے کہ وہ شخص جس کے پاس اٹرن کھٹولا ہے وہ اچھی طرح اپنے بچہ اور چھابے کو بچا سکتا ہے۔

ہم ہمیشہ یہ سنتے ہیں کہ فلان شخص روپیہ پیدا کر رہا ہے یا بڑا مالدار ہے یا اُس کے بیان روپیہ پٹا پڑا ہے لیکن یہ کبھی نہیں سنتے کہ فلان شخص روپیہ سے لطف اٹھا رہا ہے اور اصل حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ روپیہ پیدا کرتے ہیں وہ اپنے واسطے نہیں پیدا کرتے صرف دولت کا ذخیرہ جمع کرتے ہیں اور یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُسے کون صرف کرے گا۔

ز نوفن کے بیان دعوت میں ارشید ص نے دعوت کیا کہ غفلت سے بہتر ہو کہ اس نے کہا یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ اپنے تئیں محفوظ سمجھنا خوف میں رہنے سے بہتر ہے۔ آزاد ہونا غلام ہونے سے اچھا ہے اس بات سے کہ آپ کو ملک والے آپ پر بھروسہ نہ کریں یہ بہتر ہے کہ آپ کے ملک والے آپ پر اعتماد رکھیں۔

۱۔ یہ ارض مقدس کے ایک تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہے جو عیسائیوں میں بہت مشہور ہے۔ اسی واقعے سے ہو کر ایک یہودی عیسائی المقدس سے شہر جریشو جارا تھا اتفاقاً راستے میں قزاق لگے اور اس کا مال و اسباب چھین لیا۔ اور اُسے زخمی کر کے چلے گئے ایک بادی جو کہ اس مذہب کا تھا اُس نے اُسے دیکھا اور راستہ کاٹ کر چلا گیا اسی طرح ایک درافتر دھر سے گزرا اور اُسکی کچھ مدد کی لیکن ایک شومرون کا بیٹا ان کو اسکا ہم مذہب تھا اتفاقاً دھرا نکلا اور اسے اس حالت میں دیکھ کر اپنے پاس وٹرن کال کر لے گیا اور اُس کے زخموں پر تیل کھرا بازہ صاف کیا اور اپنے بچہ پر سوار کر کے سڑک پر لے گیا بھٹیاری کو دو بیس اپنے پاس سے نکال کر دیے کہ اُسکے علاج میں صرف کرے۔ اور کہا میں وہاں کے وقت اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہو گا دست دینا چاہیے۔

لیکن جب کہ میں اس شہر میں ایک امیر آدمی تھا تو اولاً مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ ایسا نہ ہو کوئی آدمی میرے یہاں نقب لگائے میرے روپیے پر قبضہ کر لے۔ یا مجھ کو جہانی مصرت ہو جائے مگر اب مفلسی میں آرام سے سو سکتا ہوں۔ اب میرے پاس اتنا مال ہی نہیں کہ گورنمنٹ مجھ پر شبہ کر سکے۔ اب میں آزاد ہوں۔ جب چاہوں شہر کو چھوڑ دوں اور جب تک چاہوں رہوں۔ جب میں امیر تھا مجھے لوگ اس بات پر دلا مت کرتے تھے کہ میں سقراط اور دوسرے غریب فلسفیوں سے میل جول رکھتا ہوں۔ اب مجھے اختیار ہے کہ اپنے لیے جیسے دوست چاہوں منتخب کر لوں۔ اور وہ یہ کہ جب سے میں غریب ہو گیا ہوں اس وقت سے کوئی شخص میری طرف زیادہ توجہ ہی نہیں کرتا۔ جب میرے پاس بہت کچھ تھا اس وقت میں بدبخت تھا۔ کیونکہ میں ہمیشہ کچھ اپنا ہی گنوا یا کرتا تھا۔ مگر اب جب سے میں غریب ہو گیا ہوں میں کچھ نہیں کھوتا کیونکہ اب میرے پاس رکھا ہی کیا ہے جسے کھو دوں گا۔ اور باوجود اس کے یہ بات مجھے برا بر تسلی دیتی رہتی ہے اور خوش رکھتی ہے کہ مجھے کچھ نہ کچھ ہی جاوے گا۔ اور شمس نے جو کچھ کہا اس میں بہت کچھ سچ تھا۔ لیکن سب کا سب صحیح نہ تھا۔ علاوہ برین جس وقت اس نے یہ کہا تھا اسی وقت اس نے لذیذ غذائیں کھا مین تھیں۔ اور راگ شکر بہت ہی مسرور ہوا تھا۔

روپیہ اگر عقلندی کے ساتھ استعمال کیا جاوے تو اس سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ سونا قوت ہے۔ ایک پر مذاق فرانسیسی نے کہا ہے کہ روپیہ ساؤرن کا ساؤرن ہے یعنی بادشاہوں کا بادشاہ ہے روپیہ ہماری خواہشوں کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر تازی ہوا۔ عمدہ مکان۔ کتابیں۔ اور گانا وغیرہ قابل اسکے ہیں کہ ان سے لطف اٹھایا جاوے۔ تو روپیہ سے یہ سب مل سکتے ہیں۔ اگر فرصت فائدہ مند ہے تو روپیہ ہی سے ہم کو حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا کی سیر مسرت بخش ہے تو روپیہ ہی کی بدولت ہم سفر کر سکتے ہیں۔ اگر دوستوں کو مدد دینا اور مصیبت زدوں کو تکلیف سے بچانا کوئی عمدہ بات ہے تو روپیہ ہی ہم کو یہ بڑی برکت مرحمت کرتا ہے۔

سٹوٹ کا قول ہے کہ روپیہ کو دماغ میں رکھو اور دل میں جگہ نہ دو۔

۱۔ ساؤرن ایک سونے کے سکے کو بھی کہتے ہیں اور ساؤرن یعنی شہنشاہ۔ ۲۔ سٹوٹ اگر بری قوم کا ایک زبردست مصنف اور مفکر ہے۔ ۳۔ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۲۸ء میں مر گیا۔

نبیل وہ شخص جو جس کو روپیہ کی محبت محض روپیہ ہی کے واسطے ہوتی ہے۔ جو کفایت شعاری میں حد سے زیادہ گزر جاتا ہے۔ اور جو صرف ایک لالچی کل ہے۔ ایک سبن جو ہم کو اس زندگی میں لینا چاہو یہ ہم کو اپنے تئیں ذلیل اور حقیر ٹکرون سے آزاد رکھنا چاہیے اور روپیہ کی محبت سب سے زیادہ ذلیل ہے۔

دولت کا عقلمندی سے استعمال کرنا بہت بڑی بات ہے۔ حضرت سلیمانؑ

نے فرمایا ہے: جو شخص دیتا ہے اسکی دولت بڑھتی ہے۔ اور جو شخص درجہ مناسبت سے زیادہ روپیہ کو روک رکھتا ہے وہ منجر بافلاس ہو جاتا ہے۔

اڈورڈ کوئے جو ارل آف ڈیون شائر تھا اسکی قبر کے پتھر پر

لکھا ہوا ہے کہ: جو ہم نے دیا وہ ہمارے پاس ہے۔ جو ہم نے صرف کیا وہ ہمارا تھا۔ اور جو ہم نے پھوڑ دیا وہ گویا ہم نے کھو دیا! اور اسی خیال کو دوسرے الفاظ میں یون آدا کیا ہے کہ: جو ہم نے جمع کیا وہ ہم نے کھو دیا۔ جو ہم نے خرچ کیا وہ ہمارا تھا۔ اور جو ہم نے لوگوں کو دیا وہ ہمارے پاس موجود ہے۔

فیاضی کرو لیکن ٹھاؤ نہیں۔ دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہے اور اس پر بھی امیر ہیں۔ اور ایسے بھی لوگ پڑے ہوئے ہیں جن کے پاس سب کچھ موجود ہے اور مفلس ہیں وہ شخص جو غریبوں پر رحم کرنا چاہو وہ گویا خدا کو قرض دیتا ہے۔ اور جس شخص نے ایسا کیا اسکو اس کا اجر ملے گا۔

وہ نصیحت جو حضرت عیسیٰؑ نے نوجوان امیرون کو کی وہ ہر شخص کی بابت موزون ہو سکتی ہے کہ: ہمیں اپنے بچوں اور غریبوں کو یاد رکھنا چاہیے۔ تمہاری آمدنی تمہاری ہی ہے۔ لیکن جو کچھ تم نے اپنے مورث اعلیٰ سے پایا وہ صرف تمہارا نہیں ہے۔ جن کے پاس دولت ہے وہ اپنے مالک (یعنی خدا) کے نوکر ہیں۔

ہم کو حساب دینا پڑے گا۔ دولت ایک امانت ہے جو ہمارے پاس رکھوائی گئی ہے۔ روپیہ ہر کسی کو فخر و ناز کرنے کا موقع نہیں ہے۔

نی مو تھی لکھتا ہے: جو لوگ اس دنیا میں امیر ہیں ان سے کہہ دو کہ بہت فخر نہ کریں اور ناپائیدار دولت پر بھروسہ نہ کریں۔ صرف خدا پر بھروسہ رکھیں جو ہر جگہ موجود ہے۔ اور جو اپنی رحمت سے لطف اٹھائے کے لیے ہمیں طرح طرح کی نعمتیں

عطا کرنا چاہیے۔ انھیں بچی کرنی چاہیے۔ اور صرف اس بات کو امارت خیال کرنا چاہیے کہ روپیہ اچھے کاموں میں صرف کریں۔ خیرات کرنے کے واسطے ہمیشہ طیارہ بنیں اور خوش مزاجی سے بات چیت کریں۔

”جو وقت آیا والا ہے اس کے واسطے روپیہ سے قوی بنا ڈالنا اچھا ہے۔ تاکہ ہم کو زندگی جاوید حاصل ہو“

یہ روپیہ نہیں بلکہ روپے کی محبت ہے جس کی بابت ہم کو انجیل بتاتی ہے کہ برائیوں کی جوڑ ہے اگر دولت بڑھے تو تم اپنا دل اس سے نہ لگاؤ۔

اپنے واسطے زمین پر خزانہ نہ جمع کرو جہاں کپڑے اور سویرے اسے خراب کر دیتے جہاں جو رقبہ لگائے اور جو رالے جاتے ہیں۔ بلکہ اپنے واسطے آسمان پر خزانہ جمع کرو جہاں نہ تو کپڑے اور سویرے ہی خراب کرتے ہیں اور نہ جہاں جو رقبہ لگا کر اسے جڑا سکتے ہیں اس لیے کہ جس جگہ تمھارا خزانہ ہو گا وہیں تمھارا دل بھی ہو گا۔

تفسیر

مثلاً مشہور ہے کہ سب وقت کام کاج ہی میں لگے رہنے سے اور کھیلنے نہ پانے سے لڑکا کندہ فرمیں اور شست ہو جاتا ہی جس کام کو لڑکا کرے اگر وہ ایسا ہو کہ اس میں باہر کی آمد و رفت کی ضرورت نہیں تو لڑکا نازک ہو جاوے گا اور جوانی پر بھی کمزور رہے گا۔ کھیل سے کسی طرح وقت کا نقصان نہیں کھیل جسم کی طیاری کے واسطے بہت مفید ہے۔ خاصہ جسم کے اوپر والے حصے کے لیے مثلاً بازو اور سینہ جن کو ہمارے معمولی کاروبار بجائے پھیلانے کے سمیٹ دیتے ہیں۔

کھیل صرف اتنا ہی نہیں کہ انسان کی تندرستی قائم رکھتے ہیں بلکہ اس میں کام کرنے کی جرات پیدا کرتے ہیں۔ کھیل آدمی کو دو ستون کے ساتھ بسر کرتا۔ حقیرانوں سے درمخبر کرنا۔ ایمان داری کا بہت اہم کاروبار کامیابی سے فائدہ

اٹھانے میں حد سے زبرد جانا سکھاتے ہیں۔ اُن سے ہم کو صحت جسمانی کی طرح اخلاقی صحت بھی حاصل ہوتی ہے۔

ہمت۔ ضبط۔ اپنے اوپر اختیار اور خوش مزاجی جو ایسے اوصاف ہیں کہ نہ کتابوں سے حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ تعلیم سے ہمیں کھیل ہی کی بدولت نصیب ہوتے ہیں۔ ڈلوک آف ولینگٹن نے بتایا ہے کہ "وائس لوک" کا مکمل اصل میں اُس کھیل کے میدان میں جیتا گیا تھا جو امین کالج میں ہے۔ بیک اسکوٹون کے بہت عمدہ اور فائدہ مند سبق عموماً دہی ہوتے ہیں جنھیں لڑکے بے گزشتہ (کھیل کے میدان) میں حاصل کرتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے کھیل صرف تفریح کے واسطے ہونا چاہیے اسکو کار زندگی نہ سمجھ لینا چاہیے۔

اس امر کے ثبوت میں کہ کھیل تندرستی کے لیے کس قدر ضروری ہے۔
 میں دو بڑے علم موجودات کے جاننے والوں کی رائیں پیش کر رہا ہوں۔ سر جیمز پیچمپ کتناہر "تفریح" کے تمام اجزاء میں کھیل قابلِ تعریف ہے۔ لیکن علاوہ اس کے کھیل کا بیش قیمت اخلاقی اثر کاروبار یا دزمرہ کے معاملات پر پڑتا ہے۔ کونکہ کھیل میں جب لڑکے اور جوان لوگ باہم مجتمع ہوتے ہیں تو اس جمع ہونے سے اُن کی غرض نہ تو کوئی مالی فائدہ ہوتی ہے اور نہ اور کوئی ذلیل غرض ہوا کرتی ہے۔ کھیل سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ نیک باتوں میں ہم اُن لوگوں کا ساتھ دین اور اُن شخصوں کے دوست ہو جاؤ جن جو ہمارے ساتھ راستی اور نیکی سے کام کرتے ہیں۔ کھیل سے ہم بین دوسرے لوگوں کے ساتھ کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے جو ایک ایسی قوت ہے کہ زندگی کی ہر حالت میں کامیابی کی واسطے نہایت ہی مفید ہے۔ لیکن یہ کہ کھیل میں ایمان داری سکھانے کا مادہ فطرۃً نہ ہو مگر بحیثیت ایک دستور کے وہ ہمیں ضرور ایمان داری سکھاتا ہے۔ ہر سب کھیلنے والوں میں مسلم ہے کہ کھیل میں بے ایمانی کرنا عام طور پر ذلیل ہے چاہے وہ کھیل کتنا ہی سخت مقابلے کے واسطے کیوں نہ ہو۔ تفریح میں ایمان داری کا خیال رکھنا ہم کو اس بات میں مدد دیتا ہے کہ ہم اُن چیزوں کو بھی حقارت کی نگاہ سے دیکھیں جو کہ مشکل قانون کی حد سے اندر آتے ہیں۔ اب میں خیال کرتا ہوں کہ اگر ہم غور سے دیکھیں کہ عمدہ تفریح کے کیا خواص ہیں

اور کن خاصیتوں پر ان کا فائدہ منحصر ہے تو ہم کو یہ بات معلوم ہوگی کہ سب تغذیوں
 میں ذیل کی تین چیزوں میں سے ایک ضرور پائی جاسے گی۔ (۱) تذبذب
 (۲) تعجب۔ (۳) ہنر کے استعمال کرنے کا موقع۔ ایسے کاموں میں جو روزمرہ
 کے بندھے ہوئے کاموں میں سے جداگانہ ہیں یہیں ان تین چیزوں
 کی مناسبت کی یہ وجہ معلوم ہوتی کہ یہ ہمارے واسطے خاص کر
 ایسی مسرت دہ تبیلیاں مہیا کر دیتے ہیں جو ان کاموں سے بالکل جدا
 ہوتی ہیں جن میں بہت سے آدمی عموماً مشغول رہتے ہیں۔ اور ان چیزوں کی
 وجہ سے ہم کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ اپنی قوتوں اور خوش مزاجی کو کام میں لاؤ
 چونکہ یہ چیزیں روزمرہ کی کاروباری زندگی میں بہت ہی کم استعمال کی جاتی
 ہیں لہذا یہ اندیشہ رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو وہ قوتیں کمزور یا زائل ہو جائیں۔

پروفیسر میکسل فاسٹر جو فی الحال رائل سوسائٹی کے سکرٹری ہیں اپنے
 حال کے اکل لکچر میں یوں کہتے ہیں کہ "ایسے کام میں بھی جن میں محض رنگوں اور پٹھوں
 سے کام لیا جاتا ہے خاص کر دماغ ہی تھکا کرتا ہے۔ اور ہم سب لوگ اس بات
 سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ اکثر ایسے کام ہیں جن میں دماغ تھک جاتا ہے۔ باوجود
 ان سے رنگوں اور پٹھوں کو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ چارویں مجموعی واقفیت اس بات
 کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کاموں کی طرح جن میں رنگوں اور پٹھوں سے کام لیا
 جاتا ہے دماغی کام سے بھی کیمیاوی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں یہ
 کیمیاوی تبدیلیاں جو دماغ میں ہوا کرتی ہیں ان میں درجی ترتیب
 ہوتی ہے جو رنگوں اور پٹھوں کی کیمیاوی تبدیلیوں میں ہوا کرتی ہے۔ ان
 جزئی طور پر کچھ فرق ضرور ہو جاتا ہے۔ دیگر یہ کہ دماغ میں ذرا سی تبدیلی
 بھی اگر واقع ہوتی ہے تو اس کا بہت بڑا اثر ہمارے اُس مادے پر پڑتا ہے جس
 کی بدولت ہمیں حس کرنے کی قوت حاصل ہے۔ لیکن رنگوں اور پٹھوں کے اندر
 تبدیلیوں سے اتنا بڑا اثر نہیں پیدا ہو سکتا۔

اگر رنگوں اور پٹھوں کی زندگی کے واسطے ایک خاص مقدار تک ایسے
 خون کی ضرورت ہے جو اپنے درجے کے اعضاء کے باہم کام کرنے سے صاف ہوا ہے

- تاکہ وہ سرمایہ جس سے جسم کے اندرونی کارخانے کا کام چلتا ہے جلدی جلدی
 از سر نو تازہ اور نیا ہو تا رہے۔ اور حضرت رسان مادے جو اندر پیدا ہو گئے ہوں
 اُن کو بہالے جائے تو ایسا خون دماغ کی زندگی کے واسطے اس سے بھی زیادہ ضروری
 ہے۔ علاوہ برین اسٹرل گل فار اگزٹنس (زندہ رہنے کے واسطے مفید و مضر
 مادوں سے جو مقابلہ ہوتا رہتا ہے) نے دماغ کو ایسا بنادیا ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مددگار
 اعضاء سے جو اس سے کم درجے کے ہیں سبقت لے جانے کی کوشش کرتا رہتا ہے
 اور سب سے بہتر اور باقا رہہ انتظام جسمانی میں کافی کام کرنے کا زمانہ جب کہ پیچیدہ
 اندرونی کلین کام کرنا شروع کرتی ہیں اور وہ زمانہ جب سے تحکات شروع ہو جاتی
 ہے بہت ہی تنگ حدود کے اندر گھرا ہوا ہے۔ جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے اگر اس میں
 کچھ تسخیر ہے تو عمدہ طریقہ ان حدود کے بڑھانے کا یہ ہے کہ دماغ کو یوں چست و
 چالاک نہ بناؤ کہ اس پر زیادہ کام کا بار ڈال دو۔ بلکہ جو اعضا اس کے مددگار ہیں
 ان کو مدد و تاکہ اُن کا باہمی کام کرنا ممکن کے حلقے سے دماغ کو بچائے رکھے۔
 عام زبان میں لفظ اسپورٹ شکار کھیلنے نشانہ بازی کر لے اور پھیلان
 پکڑنے کے واسطے مخصوص ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو چارے طرح شکاری
 کتوں۔ بندوق۔ اور ڈوگن کے ذریعہ سے ورزش اور تفریح نہیں کرتے ان کا
 میلان بھی ان چیزوں کی طرف ہوا کرتا ہے۔ ان چیزوں کو اپنے آبا و اجداد
 کے ورثے میں پایا ہے جو اس دنیا میں صرف شکار وغیرہ پر بس رہی نہیں کرتے
 تھے بلکہ خیال کرتے تھے کہ آخرت میں بھی ان چیزوں سے مسرت حاصل ہو گی۔
 اسی بن گستاخ زندگان کی قبروں پر دوڑتا ہو لیکن اُن کے آرام میں خلل نہیں
 ڈالتا۔ وہ یعنی اُن کی روحیں اب بھی اپنے جوانی کے اسپورٹ (یعنی شکار
 وغیرہ) کو چاہتی ہیں اور ہوا پر خوشی خوشی اڑتی پھرتی ہیں۔
 باوجودیکہ اس بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے کہ ہم صاف پانی کے بہت
 زیادہ احسان مند ہیں۔ مگر پھر بھی اس میں شک نہیں کہ ہم کو تازہ ہوا سے بھی
 اسی میں اسکاٹ لینڈ کا ایک بہت ہی قدیم شخص تھا جسکی نسبت خیال کیا جاتا ہے
 کہ تیسری صدی مسیحی میں تھا۔

اسی قدر فائدہ تھا ہے۔ یہ کس قدر قوی انگیز بات ہے! ہوا ہمارے سارے جسم کے اندر
گھس جاتی ہے۔ وہ ہماری کھال کو اس آہستگی سے غسل دیتی ہے کہ ہمیں اُس کی موجودگی
کا علم نہیں ہوتا۔ باوجودیکہ وہ خود اس قدر طاقت دار ہے کہ بھول کی خوشبو کو اور
پھولوں کو اڑا کر ہمارے کمرے میں لے آتی ہے۔ جازون کو سمندر میں چلاتی ہے
اور سمندر اور بہارون کے لطیف انجرات کو اٹھا کے ہمارے شہرون کے اندر برساتی
ہے۔ یہی آواز سنائی دینے کا ذریعہ ہے۔ یہی ہمارے پاس اُن لوگوں کی آواز کو
بوجھتی ہے جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ اور پھر کاشیرین راگ اسی کی بدولت
ہمارے کانوں میں گونجتا ہے۔ یہی سینہ کا ایک بہت بڑا خزانہ آب ہے جس سے
ہماری زمین کی آب پاشی ہوتی ہے۔ یہی دن کی گرمی اور رات کی خلی میں کمی
پیدا کرتی ہے۔ یہی ہمارے سر کو ایک جلیل الشان نیلگون محراب سے ڈھانچے ہوئے
ہے۔ اور یہی ہے کہ جس کی وجہ سے صبح اور شام آسمان پر شفق نمایاں ہوتی ہے۔

جغیر نے کہا ہے: "دنیا میں کوئی اور چیز ایسی شیرین نہیں ہے جیسی
شیرین کہو ہے۔ ہوا ایک بڑا بھول ہے جو حسن کی خوبصورت دیوی دیس کی ایسی
نازک بانہیں ہمارے گلے میں ڈھالے ہوئے ہے۔ اور یہ گہند نیلی گویا ایک سوسن کا
بھول ہے جو ہمارے اوپر جھکا ہوا ہے۔ اور جس کی جادو بھری خوشبو نے تمام دنیا
کو مسح کر رکھا ہے۔ ہوا کا جنگلی بھول سب چیزوں سے زیادہ شیرین ہے۔ ستاروں
کے سے روشن بھول جو اپنے حسن پر اتارے ہیں دریا کے کنارے کنارے ہری
گھاس کو ہٹا ہٹا کر اپنا سر بلند کرتے ہیں۔ سارے راستے کا حسن اُن کی وجہ سے دوبالا
ہو رہا ہے۔ اور اُن کے دیکھنے سے مختلف قسم کے خیال دل میں آتے ہیں۔ میں
میں صبح کو دریا کے کنارے جایا کرتا تھا اور لب جو پر جو ان بھولوں کی چمک سے
منور تھا ٹھہرا کر مانتا تھا۔

مجھے یہ بات بہت زمانے کے بعد معلوم ہوئی کہ اسی راستے سے میں کیوں جاتا
تھا۔ اور تبدیلی کیوں نہ پسند کرتا تھا۔ میں نے الحقیقت کوئی تغیر نہیں چاہتا۔ میں پھر وہی
لے جغیر نے اگلستان کا ایک بڑا لالہ نکلتا تھا۔ جس نے بڑی عزت حاصل کی پھر قید ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں
پیدا ہوا۔ اور ۱۹۲۸ء میں قید میں مرا۔

یہ ساری چیزیں جانتا ہوں جن سے مجھے ایک زمانہ میں اُن سے عادی ہو جی جھول دی درخت۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو درختوں کی شاخوں پر چھوڑ
یا سیریلی اور دیکھ کر آواز میں سرسرا کر رہتی ہیں اور شام کے وقت اپنے دلچسپ راگ کو بند کر دیتی ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو درختوں کی شاخوں پر چھوڑ
یا سیریلی اور دیکھ کر آواز میں سرسرا کر رہتی ہیں اور شام کے وقت اپنے دلچسپ راگ کو بند کر دیتی ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو درختوں کی شاخوں پر چھوڑ



”ابو حیان محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان“

یہ آٹھویں صدی ہجری کے اُن بگائے عصر یادگار دن میں جن پر زمانہ ہمیشہ
خز کرے گا۔ یہ بھی اُن لوگوں میں جن جنہیں خاک یورپا نے مقدس و مبادک دین الہی
اسلام کی خدمت کے لیے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ وہی ملک اسپین جو سات
آٹھ صدیوں تک اسلامی شوکت و وقعت کا مبدار و منشاء اور اہل کمال مسلمانوں
کا مرجع بنارہا۔ منجملہ اور سب علمی ترقیوں کے ابو حیان کے ایسے فرید عالم نامور پر بھی
خز کر رہا ہے۔ اسپین کا وہ دلفریب اور دلربا سواد اور اُس کے وہ سرسبز اور تر و
نازہ سبزہ زار جن کی تعریف پہلی صدی ہجری میں موسیٰ بن نصیر والی افریقہ نے
دار الخلافہ دمشق میں لکھ کے بھیجی تھی اس امر پر ناگزیر رہی ہیں کہ ابو حیان نے
ان کے دامن میں نشو و نما پائی۔

۶۵۴ھ میں شوال کا سربا عشرت اور مبارک مہینہ تھا کہ اندلسیہ علمی
کے سربراہ جبروت دار الخلافہ غناطہ میں جسے انگریزی نقشون میں ”گرینڈا“
پاؤ گئے یہ استاد فنون علمیدہ پیدا ہوا۔ ان باپ نے اپنے دامن تربیت میں اتنا
ذوق علم پیدا کر دیا تھا کہ سن قیصر کو پہنچتے ہی ابو حیان کو دل میں شوق کی ایک جھنجھٹی
پیدا ہو گئی۔ ارض عرب یعنی ملک اسپین کے بگائے آفاق علمائے عمدہ عمدہ درگاہیں
کھول رکھی تھیں۔ جن کے فیض تعلیم سے ایک اُس پایہ کا نامور بخوبی پیدا ہو سکتا
تھا جسے کہ علامہ ابو حیان ہونے والے تھے۔ ابوالحسن ابدی۔ ابو جعفر بن بربر۔ ابن
صالح۔ ابو جعفر لبلی۔ اس عصر کے نامور صاحبان درس اور مستند نحوی تھے۔ اور

جن کے فیضِ تلمذ سے علامہ مددِ وح نے علمِ نحو میں کمال حاصل کیا۔ جب نحو سے فراغت ہوئی تو علمِ قرأت قرآن کی طرف توجہ کی۔ قرأت ایک خاص علم ہے جس کو علماء ہند نے خدا جانے کیوں چھوڑ دیا۔ اس کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے مختلف قبائل نے کن کن مختلف طریقوں سے قرآن مجید کو پڑھا ہے۔ قدما اس فن کے متعلق بڑی محنتیں کرتے تھے۔ اور ان کی اصطلاح میں قرأت صرف اس کا نام نہ تھا کہ حروفِ معمولی طور پر مخارج سے ادا کر دیے جائیں ان دنوں غرناطہ میں علمِ قرأت کے استاد خطیب ابو محمد عبدالحق تھے جن کی دور دور شہرت تھی۔ علامہ ابو حیان نے ان کی شاگردی کی۔ اور تمام اختلافات قرأت اور گزشتہ قاریوں کے مذاہب مختلفہ کے ساتھ قرآن کے بیس دور خطیب صاحب کے سامنے تمام کیے۔ اس کے بعد مشہور خطیب غرناطہ حافظ ابو جعفر غرناطی کی جو ابنِ الطباع کے لقب سے مشہور تھے۔ اور جو علم قرأت میں یگانہ عصر تسلیم کیے جاتے تھے جا کے شاگردی کی اور اپنے تئیں کمال پر پہنچایا۔ لیکن اب بھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔ خطیب حافظ ابو علی بن عبد العزیز مشہور بہ ابن ابی الاحوص کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اتنے سورہ فاتحہ سے آخر سورہ حجر تک ان کو قرآن سنایا۔ جب یقین آیا کہ اب مجھے ساتوں قرأتوں پر صحیح طور پر اور تحقیق کے ساتھ عبور ہو گیا ہے۔ قرآن کے متعلق تمام باتوں سے فراغت ہوئی تو علمِ حدیث کا شوق ہوا۔ اس علمی فن کے شوق نے ایسا از خود رفتہ بنا دیا اور بنحو ذکر و یاد کہ بارہا وطن مالوف چھوٹ گیا۔ جہاں اور جس سرزمین پر کسی حافظِ حدیث کا نام سن لیا سامانِ سفر کیا اور اس کی خدمت میں حاضر ہو کے احادیث حاصل کیں۔ حتیٰ کہ مورخین کا بیان ہے کہ ابو حیان نے صرف حدیث حاصل کرنے کے لیے ساڑھے چار سو ائمہ حدیث کی شاگردی کا فرج حاصل کیا۔ قرآن اور حدیث دونوں میں تبحر ہوا تو علمِ فقہ کی طرف توجہ کی چنانچہ اس فنِ شریفِ دینی میں شیخِ علم الدین عوالتی کے مقرر استاد شاگرد ہیں پھر اصول فقہ۔ فنِ منطق اور نیز علمِ کلام کے کچھ مسائل استاد ابو جعفر ابن زبیر سے حاصل کیے چنانچہ امام غزالی کی کتابِ استصفیٰ اور قدیم نامور علامہ باجی کی

کتاب اشارہ۔ دونوں اسی گانہ عصر کے حلقہ مدرس میں حاصل کیں۔ اس کے بعد زیادہ حصہ علم منطق کا علامہ بدرالدین محمد بن سلطان بغدادی کے فیض افادت سے حاصل کیا۔ ان اساتذہ کی خدمت میں تعلیم پانے وقت علامہ ابو حیان نے ایسی سرگرمی اور محنت و جانفشانی سے کام لیا تھا کہ اپنے اساتذہ ہی کے عہد میں اعلیٰ درجہ کمال اور تحمیر پہ پہنچ گئے۔ اور ایک بہت بڑے مدرس مشہور ہو گئے۔ آداب۔ قرأت۔ حدیث تفسیر وغیرہ علوم کے حاصل کرنے کے لیے شائقان علوم عموماً اطراف اسپین سے اور اکثر اہل افریقہ اور ایشیا اطراف عالم سے آئے ان کے حلقہ افادت میں شریک ہونے لگے۔ ان کے شاگردوں میں سے اکثر لوگ مقبولیت عامہ کے درجہ کو پہنچے۔ آخر ساتویں صدی کے اکثر مشاہیر اور علمائے ان کے شاگرد بنے۔ بلکہ جس طرح علامہ ابو حیان اپنے اساتذہ ہی کے عہد میں علمی ناموری حاصل کر لی تھی اسی طرح ان کے اتنے ایک شاگردوں کو خود انھیں کے عہد میں شہرت اور ناموری حاصل ہوئی کہ مختصر ان کی فہرست بھی بخون تطویل نہیں گنائی جاسکتی۔ صلاح الدین صفوی جو دنیا کے مشہور امام ہیں اور جن کا نام غالباً تمام اہل علم کو معلوم ہو گا نہایت فخریہ بات کے ساتھ علامہ ابو حیان کی شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور اپنے استاد علامہ ابو حیان کی تعریف میں فرماتے ہیں۔ "لَمَّا أَدْرَيْتُ أَشْيَاءَ كَثْرًا شَغَلًا لَمْ أَتِي لَمَّا أَدْرَيْتُ أَنَّ قَطْرَ الْإِسْمَاعِ - أَوْ يَشْتَعِلُ أَوْ يَكْتَسِبُ وَلَمَّا أَدْرَيْتُ عَلَى غَيْرِ ذَلِكِ" یعنی میں نے اپنے استادوں میں ابو حیان سے زیادہ کسی کو فنون و علوم میں مشغول نہیں پایا اس لیے کہ ان بزرگوار کو میں نے سوا اس کے کہ یا وہ مسائل علمیہ کو دیگر اساتذہ سے سُن رہے ہوں یا خود پڑھا رہے ہوں یا تصنیف و تالیف میں مشغول ہوں اور کسی کام میں مشغول کبھی دیکھا ہی نہیں علامہ ابو حیان نے اپنے درس کو چند کتابوں پر محدود کر دیا تھا۔ چنانچہ تیسویہ کی الکتاب اور ابن مالک کی تہلیل اور اپنے تصنیفات کے سوا اور کوئی کتاب نہیں پڑھاتے تھے۔ نحو کی مشہور کتاب مقدمہ ابن حاجب بالکل نہیں پسند کرتے تھے۔ بلکہ اس کی شان میں اکثر کما کرتے تھے۔ "هَذَا لَحْوَ الْفَقْهَاءِ" یعنی یہ تو اہل فقہ کی نحو ہے۔

علامہ ابو حیان کی زبان میں کسی قدر لکنت تھی۔ ہمارے پنجابی اجاب

کی طرح اہل اسپین کے لہجہ میں بھی یہ نقصان تھا کہ قاف کو اُس کے مخرج سے نہیں ادا کر سکتے تھے۔ بلکہ قاف کی جگہ کاف بول جاتے تھے۔ اس اثر سے اسپین کا ایک باشندہ گودہ ناموری کے اعلیٰ درجہ پر پہنچ کے علامہ ابوجیان ہو گیا ہو کیونکر فرخ سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے یہ کمال بھی تھا کہ یہ نقصان صرف باعتبار معمولی گفتگو کے تھا جب قرآن کی قرأت کرنے یا احادیث وغیرہ پڑھتے اس وقت قاف اپنے اصلی مخرج سے ادا ہوتا تھا۔ اور کوئی پہچان بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جو بات چیت کے وقت قاف کی جگہ کاف بولتے تھے۔

ابوجیان کی لائف میں دو باتیں ایسی ہیں جن کے خیال سے اُن مرحوم کی وقعت اور عالی ظرفی پر حیرت آسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اُنھوں نے درجہ تکمیل اور مرجعیت پر پہنچنے کے خود اپنے بعض اساتذہ سے مخالفت کی صرف مخالفت نہیں بلکہ اُن پر سخت الفاظ میں حملہ کیے۔ دوسرے یہ کہ اُن کے مزاج میں بغل اعتدال سے بہت زیادہ تھا۔ بلکہ انسانی خیر پر جو ہمیشہ غلبہ کے ساتھ ہمدردی کرنے کی طرف متوجہ کرتا ہے غالب آگیا تھا۔

تفصیل
اول یعنی ابوجیان جس طرح اپنے اساتذہ کے ساتھ پیش آئے اس کی تفصیل یہ ہے کہ عنفوان شباب ہی میں تمام علوم میں تبحر حاصل ہو جانے کی وجہ سے ابوجیان کو ایک دعویٰ پیدا ہو گیا۔ اور اس دعوے نے بیان تک ترقی کی کہ خود اپنے اساتذہ ابوجعفر بن طباع اور ابن زبیر سے بڑھ کر جس کی ابتدائوں ہوئی کہ بعض صحبتوں اور محققوں میں اُنھوں نے دونوں کی بغرضین اور غلطیاں ثابت کیں۔ اس کی خبر جب ابن طباع اور ابن زبیر کو پہنچی تو اُن کو نہایت ملال ہوا۔ بلکہ اُنھوں نے انا قبیل اندیشی یا بے صبری سے ابوجیان کو بہت کچھ بُرا بھلا کہا۔ اُن کی بعض تصانیف پر اعتراض کیا۔ اور اُن کے بعض روایات کو غلط ثابت کیا۔ جب اُن صبر رسیدہ لوگوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ تو ابوجیان کی جوانی کا جوش کب مانتا تھا۔ فوراً مستعد ہو گئے۔ اور ابن زبیر کی روایات کو غلط ثابت کرنے میں تصانیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابن طباع کے رد میں بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام "المناخ" رکھا۔ ان تصانیف نے دونوں استادوں کی آتش

غضب کو نہایت مشتعل کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن طبار اسیر محمد بن نصر مدحیہ فقیہ کی خدمت میں دوڑے گئے۔ جو اُس عہد کے صاحب اختیار رؤسا میں تھے۔ اور ابو حیان کی شکایت کی۔ ادھر ابن زبیر نے اس سے بھی زیادہ کارگزاری کی وہ یہ کہ بادشاہ اسپین کی خدمت میں ایک عرضداشت اس مضمون کی بھیج دی کہ ابو حیان نے نالافتی سے بطرح میرے حقوق تلف کر دیے۔ اور یوں میری عداوت پر آمادہ ہو گیا۔ بادشاہ کو ابن زبیر کی بہت کچھ مراعات منظور تھی اور کیون نہ ہوتی۔ ابن زبیر ملک کے قدیم نامور و نامور تھے۔ الغرض اُس عرضداشت کے پہنچنے ہی حسب ضابطہ ابو حیان کی گرفتاری کے لیے سلطنت کی جانب سے وارنٹ جاری ہوا جب اس وارنٹ کی خبر ابو حیان نے سنی تو سو اس کے اندر کچھ نہ بن پڑا کہ دین کو خیر باد کہی۔ وہ سبزہ زار جن کا شوق عربوں کو یورپ میں نے گیا تھا۔ اور وہ عمارات جن کا حلیہ ہمیشہ یونان کے صفوں پر نظر آئے گا دل پر جبر کر کے سب کو رخصت کیا اور ملک مصر کی راہ لی۔ راستہ میں شہر فارس پڑا۔ وہاں تین روز قیام کر کے مشہور مقتداے عصر ابو القاسم خرقانی کی صحبت سے بہرہ یاب ہوئے۔ چوتھے روز جہاز پر سوار ہو کے سواد مصر میں داخل ہوئے۔

اور اُن کے نخل کا یہ حال ہے کہ مجلسوں اور صحبتوں میں بیٹھ کے خود ہی کفایت شعاری بلکہ نخل کی تعریف کیا کرتے تھے۔ درہم و دینار کی تعریف میں اُن کے اکثر اشعار بھی معروف و مشہور ہیں جن میں کہیں تو فرماتے ہیں کہ جو پیسہ پرے کیسے میں گرفتار ہوا اُس کی مجھ سے امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی بانجھ عورت سے بچہ کی امید رکھے۔ شیخ کمال الدین ادوی کہتے ہیں کہ خود علامہ ابو حیان کہتے تھے یہ میں جب مؤثر اور جذبات کو حرکت میں لایا تو اے اشعار سنتا ہوں تو انکا بہت زیادہ اثر میری طبیعت پر پڑ جاتا ہے جس شعر میں عاشقانہ جوش ہوتا ہو وہ مجھے فوراً ایک قیاب عاشق بنا دیتا ہے۔ جرأت بہادری اور جرات کے اشعار سنتا ہوں میں فی الفور ایک بہادر شجاع اور جانباز سپاہی بن جاتا ہوں۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے کہ فیاض لوگوں کی سخاوت اور جود و کرم کے اشعار سن کے مجھ پر کچھ اثر نہیں ہوتا لیکن نہیں کہ ایسے اشعار سنا کے اور ایسے پر اثر نہ کرے کہ کوئی مجھ سے ایک پیسہ بھی لے سکے

لیکن ان روایات کا چندان اعتبار نہیں اس لیے کہ کمال الدین اوفی اول تو کوئی مستند شخص نہیں ہے۔ دوسرے اسکے خیالات بعض مذہبی وجوہ سے ابو حیان کی نسبت اچھے نہیں ہیں۔

اس سبب نے تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ مگر سائزہ کی مخالفت ایک ایسی چیز تھی کہ علامہ ابو حیان کو وطن چھوڑنا پڑا۔ اور شیخ ^{۱۲۷۹ھ} میں اُنھوں نے ملک مصر کی راہ لی۔ علامہ مذکور نے ملک اسپین سے بادشاہ محمد ثانی بن ابن الامر شاہ غرناطہ کے عندین کو دعویٰ کیا بلکہ اسی سال جب شاہ محمد نے شاہ کیسل کو بہت بڑی فاش شکست دی ہے اور میسائیون کو قتل و قلع کیا ہے۔

مگر علامہ جلال الدین سیوطی بیان کرتے ہیں کہ خود ابو حیان نے اپنی کتاب نضار میں اس سفر غربت کا کچھ اور ہی سبب بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں ”میں نے جو شہر غرناطہ کو چھوڑا اسکی ایک قوی وجہ یہ بھی کہ سرزمین اسپین میں ایک بہت بڑا نامور اور مشہور فلسفی تھا۔ اس کی زندگی امور حکمت کے دریافت کرنے ہی میں گزر گئی تھی۔ جب اُس کے مرنے کا وقت قریب آیا اور اُسے یقین ہوا کہ میں بہت دنوں تک زندہ نہ رہوں گا تو وہ بادشاہ وقت محمد ثانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی زندگی حکمت و فلسفہ کے رموز و نکات دریافت کرنے میں بسر کر دی۔ اب میرا وقت آخر ہوا اور افسوس معلوم ہوتا ہے کہ جو رموز میں نے مدت العمر میں حاصل کیے ہیں وہ میرے ہی ساتھ تمام ہو جائیں گے۔ لہذا دربار شاہی کی طرف سے تمام اطراف اندلس میں اطلاع دیدی جائے کہ جو کوئی عالم ہو فوراً حاضر ہوتا کہ میں اُن لوگوں کو اپنے خیالات بے بدل اور اجتہادات فلسفہ بتا دوں اور اُن سب کو اپنا شاگرد بنا سکے وینا سے نامور اور نیکنام جاؤں۔ بادشاہ نے یہ راسے پسند کی۔ اور تمام علمائے اسپین طلب کیے گئے۔ میں خاص وار الخلافہ غرناطہ میں تھا۔ سب کے پہلے میری طلبی ہوئی۔ اور سلطنت کے دباؤ سے میں نے اُس کی شاگردی قبول کی۔ سلطان نے اس فرمان برداری کے صلہ میں میری عزت افزائی کی اور مجھے ایک نہایت ہی بیش بہا خلعت مرحمت ہوا۔ لیکن اپنے دل میں مجھے اس کی شاگردی پر نہایت ندامت معلوم ہوئی۔ اور اس ندامت نے اس قدر

مجھ پر غلبہ کیا کہ مجھے اپنی زندگی تنگ معلوم ہونے لگی! الغرض آزادی نے میرے دل میں جوش ارا۔ میں نے وطن کو خیر باد کہی افریقہ کا راستہ لیا۔

بہر حال جس طرح ہوا تو جہان نے اسپین کو چھوڑ دیا اور ایک مدت تک اسکندریہ میں رہے۔ وہاں شیخ عبدالنصر بن علی بن یحییٰ مرلو علی موجود تھے۔ جو دنیا بھر میں علم قرأت کے امام مانے جاتے تھے اور جھون نے اس امر خاص میں اپنے آپ کو تمام دنیا سے اسلام کا مربیع بنا دیا تھا۔ ابو جہان کو یہ موقع ملتا معلوم ہوا شیخ مدد روح کی خدمت میں حاضر ہوئے اور از سر نو پھر قرأت کو حاصل کیا۔

اس مقام سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علامہ ابو جہان نے اساتذہ کرام سے اگر مخالفت کی تو وہ ناجائز نہ ہوگی۔ اس لیے کہ اگر ان کو خود ستائی کا بے سبب دعویٰ تھا تو اسکندریہ یہودیوں کے اسی فن میں جس میں کیا کچھ کمال حاصل کر چکے تھے کیون اپنے تئیں طفلِ کتب بنا دیا اور شیخ عبدالنصر کے آگے زانو شاگردی نہ کیا۔ صرف شیخ عبدالنصر ہی نہیں علامہ ابو جہان مصر کے ایک دوسرے استاد قرات شیخ ابوطاہر اسمعیل بن ہبہ اللہ طبری کی خدمت میں بھی گئے اور ان کی شاگردی کو بھی خرجان کا اختیار کیا۔ اس کے بعد علامہ ابو جہان ایک مدت دراز تک سفر ہی میں رہے۔ مصر۔ عراق۔ شام۔ حجاز۔ یمن اور بلادِ سمودان۔ اور بہت سے دیگر مقامات ایشیا کی سیر کی۔ یہ سفر بھی صرف شوقِ علم میں تھا۔ جہان کسی استاد فنِ محدث فقیر قاری یا کسی اور فن کے استاد کا نام نہ لیا۔ وہاں دوڑے گئے۔ اور اس کا ملنا اختیار کیا۔ ابو عبداللہ محمد بن سعید زہنی کہتے ہیں کہ خود ابو جہان کہتے تھے ”جملۃ من یمتھ منہم منی من خمس مائۃ و اربعۃ و ستون الکوفۃ“ یعنی وہ سب لوگ جن سے میں نے درس سنا ان کا شمار تقریباً پانچ سو اور جن علمائے مجتہدین نے ان کا شمار ہزار سے زیادہ ہے۔

اس سیر و سیاحت اور علمی ذوق و شوق سے ابو جہان کو اتنا بڑا فخر حاصل ہوا جس کی قدر اگر کسی محدث کے دل سے پوچھیے تو معلوم ہو۔ ابو جہان کا شمار آٹھویں صدی کے علما میں ہے۔ مگر ان کو تین صدیوں ایسی ملیں جن کی روایت ان سے حضرت رسالت پناہ تک صرف آٹھ واسطوں سے پہنچتی ہے حقیقت میں

یہ نحر ان کے لیے بہت بڑا تھا۔ اور اس پر وہ جس قدر ناز کرتے نہایت تھا۔ ہم اپنے اہل حدیث و سنتوں کے محفوظ کر نیچے لیے اس سند کو بھی نقل کر دیتے ہیں۔ ابو حیان کہتے ہیں مجھ سے کہا محمد بن احمد بن مؤید ہمدانی اور شمسہ بنت ملک العادل ایوب بن شادی نے ان دونوں نے سنا ابو الفخر اسعد بن سعید بن روح سے انھوں نے روایت کی فاطمہ بن جانیہ بنت عبد اللہ بن احمد سے ہم انھوں نے سنا ابو بکر محمد بن رندہ حبشی اصفہانی سے انھوں نے حافظ ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مظہر مخفی طبرانی سے انھوں نے عبد اللہ بن ریاض قیس سے سزین بن سلمہ بن سلمہ سے انھوں نے روایت کی ابو عمر زیاد بن طار بابی سے اس وقت جبکہ ان کی عمر ایک سو بیس برس کی ہو چکی تھی کہا مجھ سے بیان کیا۔ ابو جریول زبیر بن مرد جشمی نے جو صحابی ہیں کہ غزوہ حنین میں جب مسلمانوں کو فتح ہوئی تو لوگ مجھے گرفتار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لے گئے۔ میں آگے بڑھا اور نہایت رقت قلب اور التجا و عاجزی کے پلچے آنحضرت کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھنے لگا (جو کتب تواریخ میں نہایت ہے) آنحضرت کے دل میں انتہا سے زیادہ رحم تھا وہ قصیدہ سن کے آپ کو مجھ پر رحم آ گیا۔ دوسری سند ابو القاسم طبرانی تک تو اسی سلسلہ سے گئی ہے مگر طبرانی کے شیخ دوسرے ہیں یعنی طبرانی کہتے ہیں مجھے خردی جعفر بن حمید انصاری نے کہ میرے نانا عمر بن ابان مدنی نے مجھ سے بیان کیا کہ آنس بن مالک نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا طریقہ بتایا۔ تیسری سند بھی طبرانی تک پہنچتی ہے اور اُس کے بعد یوں ہے کہ طبرانی نے روایت کی محمد بن احمد بن زید بصری سے انھوں نے دینار بن عبد اللہ آنس بن مالک کے غلام سے اور انھوں نے اپنے مولیٰ آنس بن مالک سے کہ انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خوشخبری ہو اس شخص کو جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا یا جس نے کسی میرے دیکھنے والے کو دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا یا میرے دیکھنے والے کو دیکھنے والے کو دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔ یہ سلسلہ ہیں جن کے ذریعہ سے ابو حیان کو صرف آٹھ ہی ذریعوں سے رسول اللہ کی احادیث پہنچ گئیں۔

اس کے علاوہ محدثین میں علامہ ابو حیان کو ایک اور حیثیت سے بھی تخصیص دے کر اکثر سندوں میں یوں طریقہ آیا ہے کہ بعض راوی اپنے آباؤ سے سلسلہ دار دو تین پشت تک روایت کر جاتے ہیں۔ جس کو یوں کہتے ہیں کہ "عن ابیہ عن ابیہ عن ابیہ" اس قسم کا سلسلہ اور تمام سندوں میں تین ہی چار پشت تک گیا ہے۔ لیکن ابو حیان کو دو سلسلوں سے یوں روایت پہنچی ہے کہ آباؤ اجداد کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک سلسلہ جس میں ابو حیان کے استاد ابو الحسن بن نامہ ہیں اور وہ چند واسطوں کے بعد شیخ رزق اللہ بن عبد الوہاب یثربی سے روایت کرتے ہیں۔ سند صرف بندوبست آباؤ اجداد ہی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئی ہے۔ یعنی رزق اللہ کہتے ہیں میں نے اپنے پردہ بزرگ ابو الفرج عبد الوہاب سے سنا، انھوں نے اپنے والد اجداد ابو الحسن عبد العزیز سے اُنھوں نے اپنے والد اجداد ابو کریم حرث سے اُنھوں نے اپنے والد آسہ سے اُنھوں نے اپنے باپ لیث سے اُنھوں نے اپنے باپ سلیمان سے اُنھوں نے اپنے والد ابو الاسود سے اُنھوں نے اپنے والد سقیان سے اُنھوں نے اپنے والد یزید سے اُنھوں نے اپنے باپ اکیمہ سے اُنھوں نے اپنے باپ یثیم سے اُنھوں نے اپنے باپ عبد اللہ سے جو صحابی ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا فرماتے تھے سلمان لوگوں میں کوئی ذکر خیر نہیں چھڑا کرے کہ ان پر ملائکہ سایہ کر لیتے ہیں اور رحمت عام ہو جاتی ہے۔ اس سند میں بارہ راویوں نے اپنے اپنے آباؤ سے روایت کی۔ اس کے علاوہ ایک اور سند ہے جس میں نو بیٹوں نے اپنے آباؤ سے روایت کی ہے۔ ایسی سندیں اور محدثین کو کم نصیب ہوئی ہیں اور ابو حیان ان پر جس قدر غور و فکر فرماتا کرتے نہایت تھا۔

علامہ مقرئ مشہور مورخ اندلس فرماتے ہیں کہ استاد ابو حیان نے جس وقت سرزمین اسپین سے کوچ کیا ہے اور مصر کی راہ لی ہے اگرچہ پوشیدہ طور پر وہ سلطنت کو روپوش ہو کے گئے تھے۔ لیکن محبت وطن کے جوش نے انھیں اس امر پر آمادہ کر دیا کہ ایک نصیحت نامہ اور دستور العمل لکھ کے اہل وطن کے سپرد کرتے گئے۔ تاکہ لوگ اس پر عمل کریں اور ہر قسم کی لغزشوں سے محفوظ رہیں۔ علامہ مقرئ فرماتے ہیں یہ نصیحت نامہ ابو الطیب بن حلوان قولسی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ملا جس نے استاد ابو حیان کے شاگردوں کے مدرسوں میں تعلیم پائی تھی۔ وہ وصیت نامہ کتب تواریخ میں

بلفظ موجود ہر شائقین اگر چاہیں تو نفع اطیب تاریخ اندلس میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا ہر لفظ ایک گران بنا جو ہر سہے۔ اور ہر دیکھنے والا اُس کی دو چار سطریں بھی دیکھ کے خیال کر سکتا ہے کہ استاد ابو حیان کس پائے کے شخص تھے۔ اور دیگر علما ایسا دستور عمل تیار کرنے سے کس حد تک عاجز ہیں۔ یہ عجبات ہے کہ خود محمد روح مورخ اندلس کی تصریح کے مطابق استاد ابو حیان کو مشائخ صوفیہ سے حسن عقیدت نہ تھا۔ بلکہ بعض مشائخ پر اُنھوں نے بہت کچھ رد و قدح بھی کیا۔ اور واقعی یہ شان اکثر محدثین میں پیدا ہو گئی۔ اور عموماً پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس وصیت نامہ میں اُنھوں نے جس اصرار اور تاکید سے لوگوں کو مشائخ صوفیہ کی طرف متوجہ کیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو حیان سے زیادہ کرامات اولیا کا کوئی معتقد بھی نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر ابو حیان نے ابو تمام فقیہ سے روایت کی ہے کہ کہتے تھے ایک بار میں نے ابو الحسن بن جالوت کی تربت کی زیارت کا ارادہ کیا۔ اہل اسلام کے قبرستان میں گیا۔ اس سے پیشتر جو کہہ اور کبھی مجھے اس تربت پاک کی زیارت کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اور نہیں ہی جانتا تھا کہ اُن کی قبر کون ہے لہذا ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ سب قبریں ایک ہی طرح کی نظر آئیں۔ اور کسی طرح نہ معلوم ہو سکا کہ قطب الافاق ابن جالوت کا مزار کون ہے۔ کچھ دیر توقف کر کے میں ایسی ہی کے ساتھ بٹھا۔ دو ہی چار قدم چلا ہوں گا کہ ایک قبر سے آواز آئی۔ "یا غائب الشمسی مآذرتی" اسے غالب (ابو تمام کا نام ہے) کہا بے ہم سے ملاقات کیے چلے جاؤ گے؟ ابو تمام کہتے ہیں یہ آواز سن کے میں پھر ہرا۔ اور اُس قبر کے پہلو میں جس سے آواز آئی تھی مجھ کے ساتھ پڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں شیخ مرحوم کے صاحبزادے آئے اور میں نے اُن سے پوچھا شیخ ابن جالوت کی قبر کون ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ جس کے برابر تم بیٹھے ہو۔ یہ مَن کے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ آواز شیخ مرحوم ہی کی تھی۔

استاد ابو حیان نے جب اس قسم کی روایات حسن عقیدت کے ساتھ بیان کی ہیں تو یقین کر لینا چاہیے کہ اُن کو صوفیہ کرام کی جانب سے کسی قسم کا سوء ظن نہ تھا۔ اور جو کچھ اُنھوں نے مخالفت کی ہے اس میں صرف وہ لوگ غیاط ہیں جو ہمارے زمانے کے اکثر یہ زنادوں کی طرح فریب اور کمرے کے ساتھ دعویٰ ولایت و تسوف

کیا کرتے ہیں۔ بلکہ ایک بے مثل قطعہ ابو حیان کا صاف بتا رہا ہے کہ اُن کو اپنے ہم عصر
مکار اور فحشی مدعیان تصوف ہی سے مخالفت تھی اور سخت مخالفت تھی جس طرح کہ وہ شرع میں اُن
کی غرض ظاہر ہو گی ہم نقل کیے دیتے ہیں تاکہ ہمارے دوستوں کو استاد ابو حیان کے
خیالات بخوبی معلوم ہو جائیں۔

وَمَنْ يَكُ يَدْعِي مِنْهُمْ صِلَا حَا
فَزَيْدٌ يَنْفُلُ فِي الضَّلَالِ
فَيَنْهَبُ مَا لَهُمْ وَيُصِيبُ مِنْهُمْ
نَسَاؤُهُمْ بِمُشْجِعِ الْفَعَالِ

یعنی ان میں سے جو کوئی صلاح و تقویٰ کا مدعی ہے وہ ایک زندقہ باز ہے کہ داوی
ضلالت میں گمراہ ہو گیا ہے۔ وہ مریدوں کا مال لوٹتا ہے اور اُن کی عورتوں سے بڑے
کام لیتا ہے۔

استاد ابو حیان کو زیادہ ناموری خاص کر علم نخو میں حاصل ہوئی اور ایسی بوری
کہ نحو کے وہ بہت بڑے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جلال الدین سیوطی نے نخو میں جو
کتاب مجمع الجوامع لکھی ہے اس کی نسبت خود اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے اس میں
جو کچھ لکھا ہے علامہ ابو حیان کی تصنیفات سے لے کے لکھا ہے اور مجمع الجوامع ایک
ایسی کتاب ہے کہ اُس کے مثل نخو میں کم کوئی کتاب نظر آئے گی۔ خصوصاً جب یہ خیال
کیا جائے کہ علامہ ابو حیان نے نخو میں متقدمین کی بالکل تقلید نہیں کی اور اپنی تحقیقات
میں کل اساتذہ سابق سے علحدہ ہو گئے ہیں تو حیرت معلوم ہوتی ہے کہ نحو کے دائرہ
میں اس استاد یگانہ نے کیونکر اجتہاد کا جھنڈا بلند کیا۔

ابو حیان کی مدح و ثنا میں مورخین نے جس زور قلم سے کام لیا ہے اور اُن
کی وقعت ثابت کرنے میں جیسی قوت تحریر دکھائی ہے اس کو دیکھ کے شاید عام لوگوں کو
دھوکا ہو گا کہ وہ الفاظ صرف مبالغہ پر محمول ہیں۔ صلاح الدین صفوی نے بہت بڑی
طوفاً عبارت کے ضمن میں صاف لکھ دیا ہے کہ "کان تصیروا المؤمنین فی النہو" اور اس جملہ
کے بعد اس شد و مد سے تقریر کی ہے کہ تمام ائمہ نحو کو استاد ابو حیان کے آگے ایک طفل
مکتب ثابت کر دیا ہے۔ سیبویہ۔ الحش۔ قرار۔ یزدی۔ کسائی۔ کسی کی کوئی اصل حقیقت
نہیں باقی رہی۔

علامہ صفوی جو آخر حدیث ابو حیان کے معاصر تھے انھوں نے ایک خط

کے ذریعہ سے استاد ابو حیان سے اُن کے تمام تصانیف اور تمام دیگر کتب کی روایت کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ یہ اگلے عہد میں دستور تھا کہ جب تک مستند شیخ جس کو سلسلہ در سلسلہ اجازت درس و روایت ملتی آئی ہو اجازت نہ دے اس وقت تک کوئی شخص نہ روایت کر سکتا تھا اور نہ درس دے سکتا تھا۔ الفرض علامہ صفوی کے جواب میں استاد ابو حیان نے تمام مشہور مصنفوں کی سرکہ آرا کتابوں کی فہرست لکھی ہے اور علامہ مدوح کو روایت کی اجازت دی ہے۔ اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے آندلس، آفریقہ، مصر، حجاز، وغیرہ دیگر بلاد اسلامیہ میں اپنے اساتذہ سے جو کچھ حاصل کیا اُس سب کی تم کو اجازت دیتا ہوں۔ میری راہ دایوں۔ تصنیفوں وغیرہ سے جو کچھ ہووے سب کی روایت یقین جائز ہے۔ سب سے زیادہ جس چیز کی سند میں تم کو دے سکتا ہوں وہ قرآن کا ساتون قرآن سے پڑھنا ہے۔ اور سب سے عمدہ میرے استاد قرأت میں فخر الدین ابو طاهر بلخی تھے۔ علامہ برین صحاح شریفہ، نحو طائے متدین، جملہ مستند داری۔ ان سب کتابوں کی میں تم کو اجازت دیتا ہوں۔ اس کے بعد بتایا ہے کہ میرے اتنے استاد تھے۔ اور میں ذرا ان کو تشویش سے یہ سند حاصل کی ہیں۔ اور کہاں کہاں مارا مارا پڑا ہوں۔

علامہ ابو حیان کے دلچسپ واقعات میں ایک یہ واقعہ ہے کہ اُن کی ایک صاحبزادی تھیں جن کا نام نضار تھا۔ نضار نے بھی اس عہد کی عورتوں کی طرح علوم دینیہ اور ادبیہ میں کمال حاصل کیا تھا خصوصاً ایک ممتاز عہد محدثہ خیال کی جاتی تھیں۔ تاریخ اسپین بتا رہی ہے کہ وہ ان کے سلمانوں میں تعلیم سنوں کا نہایت تکمیل کے ساتھ راج تھا۔ چنانچہ جس طرح ہر عہد نامور علما اور شعرا مردوں میں سے ہوا کرتا تھا اسی طرح عورتیں کمال حاصل کر کے ملک میں اعلیٰ کمال کا رتبہ حاصل کر لیا کرتی تھیں۔ اس باعصمت خاتون نے قرأت اور حدیث کو اپنے یگانہ عصر باپ سے حاصل کیا تھا۔ اور نحو کے اکثر متن بن زبیر وغیرہ علامہ آندلس سے اجازت لے کے نہ بانی یاد کر لیے تھے۔ آخر اس کی تعلیم نے نضار کے دل میں دین کا جو ش پیدا کر دیا اور وہ ارض اندلس چھوڑ کے بغرض حج مکہ معظمہ گئیں۔ کہ ہونج کے نضار نے اپنی سند سے اکثر اعلیٰ مشہور روایت کیں۔ اور وہ ان کے بعض لوگوں کو

گرویدہ بنایا۔ اور اسی طور پر نضار نے کہ معظمہ میں ایک مشہور اُستاد کی حیثیت پیدا کر لی علامہ ابو حیان کو اپنی اس بیٹی سے نہایت ہی الفت تھی اور حیان تک ہو سکتا تھا اس کی ناز برداری میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ بیٹی کی محبت نے حیان تک ترقی کی کہ اپنے بیٹے حیان سے بھی اس قدر انس نہیں رہا۔ اکثر زبان سے یہ کلمہ کل جاتا تھا کہ کاش اس کا (نضار کا) بھائی حیان اس سے اچھا نہیں تو اس کا ایسا ہوتا۔ علامہ صفوی کہتے ہیں ابو حیان نے بارہا خود مجھ سے نضار کی تعریف کی اور فرمایا: حدیث میں اس کی ایک تصنیف موجود ہے۔ زبان عرب کی ادب کے متعلق اس کی لیاقت بے مثل ہے۔ اشعار بھی خوب کہہ جیتی ہے۔ اور طبیعت بہت اچھی پائی ہے۔ آہ ابو حیان کو اس بیٹی کا بہت بڑا داغ دل پر اٹھانا پڑا۔ جمادی الآخر ۸۳۷ھ میں نضار نے ملک مصر میں انتقال کیا۔ ابو حیان اس صدمہ سے نہایت اندوہ میں ہوئے ملک ناصر ان دنوں خدیو مصر تھا۔ اس کی خدمت میں علامہ ابو حیان نے عرضداشت بھیجی کہ جس میں پہلے تو اپنے رنج و الم اور صدمہ جانکاہ کا حال لکھا تھا اُس کے بعد اجازت طلب کی تھی کہ اگرچہ عام طور پر شہر قاہرہ کے اندر کسی لاش کو دفن کرنا ممنوع ہو مگر میں امیدوار ہوں کہ مجھے اجازت دیجاسے گی کہ اپنی بیٹی نضار کی لاش خاص شہر کے اندر دفن کروں۔ ملک ناصر کو عرضداشت دیکھ کے بڑا ترس آیا۔ دستخط میں بہت کچھ ہمدردی و دلہی کے کلمات لکھے اور علامہ ابو حیان کی مرضی کے موافق اجازت دی کہ نضار کی لاش خاص قاہرہ کے اندر مدفون ہو۔ اس اجازت کے بعد ابو حیان نے اپنی بیٹی کو ہٹلا اور کفنا کے خاص اسی مکان میں دفن کیا جس میں رہتے تھے۔ یہ مکان قاہرہ کے محلہ برقوقیہ میں واقع تھا۔ ابو حیان کو بیٹی کا اتنا بڑا غم ہوا تھا کہ دفن کرنے کے بعد پورے ایک برس تک گوشہ نشینی کے عالم میں قریب پر بیٹھے رہے۔ اور اس زمانے میں کسی شخص سے نہیں ملے اور گویا خیال کر لیا تھا کہ سو امر اسم عزا داری اور سو گواہی کے اُغین اور کچھ کرنا نہ تھا۔

شیخ صلاح الدین کہتے ہیں میں رجمہ میں تھا کہ مجھے نضار کے مرنے کی خبر پہونچی۔ لہذا بہ بطریق تعزیت میں نے چند اشعار کہے اور شیخ ابو حیان کے پاس بھیج دیے۔ اس مرثیہ میں واقعی بعض بعض اشعار نہایت زور کے ہیں جن سے

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صلاح الدین کو بھی مرحومہ کے مرنے کا نہایت ہی قلق تھا۔ علامہ ابو حیان صرف ملا اور ایک مدرس ہی نہ تھے۔ طبیعت پوزن وں پائی تھی۔ اور اکثر شعر گوئی کا بھی مشغلہ رہتا تھا۔ ایک جھوٹا سادیوان اُن کی شاعری کی یادگار میں موجود ہے۔ اگر کوئی ان اشعار کو دیکھے تو معلوم ہو کہ خیال آفرینی میں اُس فاضل بیکانہ کی طبیعت کیسی لڑتی تھی۔ ہر شعر صاف الفاظ میں بتا رہا ہے کہ میرا کہنے والا ایسا قادر الکلام ہے کہ جہدِ ہر رُخ کرے گا تمام محفون پر سبقت لے جائے گا۔ عاشقانہ مضامین کو اس خوبی سے اور ایسے پُر جوش اور دلی پراثر ڈالنے والے الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا یہ کسی عالم و فاضل اور مولوی کے اشعار ہیں۔ شاعری کا یہی کمال ہے کہ انسان جس خبیث سال کی طرف توجہ کرے اپنی طبیعت کے دیگر جذبات سے بچائے اور کر جائے اور یہی سبب ہے کہ اہل علم کے اشعار شاعر وں کی محفون میں بہت کم وقت پیدا کر سکتے ہیں۔ علامہ ابو حیان میں یہ دوسرا کمال تھا کہ صرف عاشقانہ جذبات ہی اُن میں نہ تھے۔ اکثر نصائح اور دنیاوی فوائد کی باتوں کو بھی اُنھوں نے نظم کیا ہے اور اس خوبصورتی سے نظم کیا ہے کہ شاید اُس سے زیادہ موثر طریقہ اُن نصائح کے ادا کرنے کا اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ چند نصائح کے متعلق ابو حیان کے بہت اشعار ہیں۔ کہیں دنیا کی مذمت میں طبیعت داری کے جوہر دکھائے ہیں۔ کہیں وفادار دوستوں کے نہ ملنے کو عجب موثر طریقہ سے ادا کر گئے ہیں۔ غزلیت جو فارسی کی ایجاد ہے اس کا مادہ بھی اُن کی طبیعت میں کمال کے ساتھ تھا۔ اُن کے اکثر نظم اسی سلوب پر ہیں مگر اصل یہ ہے کہ جو غزل کی شان ہے وہ اُن میں نہیں لیکن ان کہتے تو خوب کہتے۔ مگر ہم تو یہ کہیں گے کہ خوب ہوا جو عربی میں غزل سرائی کی بنیاد نہیں ڈالی۔ ورنہ فارسی اور اردو کی طرح عربی شاعری بھی صرف خیال آفرینی پر محدود ہو جاتی۔ اور کلام کے موثر بنانے یا واقعہ کی تصویر دکھانے کی قوت بالکل سلب ہو جاتی۔

الغرض علامہ ابو حیان جب تک زندہ رہے عربی زبان کو بمثل ترقی دلاتے رہے۔ یہاں تک کہ زمانے نے اُنھیں تھکا دیا۔ اور پیام اجل نے

ایسے گرانمایہ شخص کو اس کے شاگردوں ہی نہیں ساری دنیا کے آغوش محبت سے جبین
 لیا استاد ابو حیان کی تاریخ وفات میں مورخین اسپین اور مورخین ایشیا میں اختلاف
 ہو گیا۔ اہل اسپین ۴۴۲ھ میں بتاتے ہیں۔ اور اہل ایشیا ۴۴۳ھ لکھتے ہیں۔ مگر مشہور
 مورخ اندلس علامہ مقرئ نے نہایت انصاف پسندی سے فیصلہ کیا ہے کہ مورخین
 ایشیا کا بیان زیادہ قابل قبول ہے اس لیے کہ استاد مرحوم نے انھیں کے پڑوس
 میں انتقال فرمایا علامہ صلاح الدین جو شام کے مشہور ادیب تھے اور جن کو
 ابو حیان کے ہم عصر ہونے کی عزت حاصل تھی۔ اور اپنے عصر کے مقتداے زمانہ تھے
 لکھتے ہیں کہ "علم نحو کے بادشاہ اور ہمارے استاد شیخ ابو حیان نے تقریباً اسی برس
 تک علم نحو کو فائدہ پہونچایا۔ یہاں تک کہ ضعیفی نے ان کو بالکل تھکا دیا۔ انھوں نے
 شہر فابره میں باب البحر کے باہر جس مکان میں رہتے تھے اُسی میں ہفتہ کے روز
 نماز عصر کے بعد صفر کی ۲۸ کو ۴۴۳ھ میں انتقال فرمایا۔ اور دوسرے روز مقبرہ
 صوفیہ میں جو باب نصر کے باہر ہے دفن ہوئے۔ دمشق کی مشہور مسجد جامع بنی اسیم
 میں لوگوں نے ان کے جنازے کی صلوٰۃ غائب پڑھی صلاح الدین جو ہر طرح
 سے علامہ ابو حیان کے معرفت تھے انھوں نے ابو حیان کا ایک نہایت ہی پرورد
 مرثیہ لکھا ہے۔ اس مرثیہ میں نحو کی تمام اصطلاحوں کو شاعرانہ خوبصورتی سے لکھایا
 ہے۔ بلکہ بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ مرثیہ زبان عرب کے دیگر مرثیوں
 پر بہت ترجیح رکھتا ہے۔

علامہ ابو حیان کی تصنیفات بہت ہیں تقریباً چالیس ہفتالیس کتابیں ہیں جو استاد ابو حیان
 کی برکتوں کی یادگار ہیں ان کی تصانیف کو زیادہ تعلق نحو و صرف اور خاص اصول زبان ہے
 اور تمام وہ مصنفین جو استاد ابو حیان کے بعد ہوئے ان سب پر ابو حیان کی تصانیف کا بہت بڑا احسان ہے
 انھوں نے استاد ابو حیان ایک ایسے شخص تھے کہ سرزمین اسپین اور
 غرناطہ کو ہمیشہ اُن پر فخر ہے گا۔ آج وہاں اُن کے معرفت اور اُن کے فاتح
 خوان بلکہ اُن کے نام کو عزت دینے والے باقی نہیں ہیں لیکن زمانہ ہمیشہ یاد دلاتا
 رہے گا اور سرزمین اسپین کو کبھی نہ بھولے گا کہ استاد ابو حیان ایک ایسے
 مقتداے عصر اور یگانہ دہر کا نام ہے جس کی وجہ سے مغربی یورپ کا ایک

لکھا اپنے علم و فضل اور اپنی تہذیب کے اعتبار سے ان دنوں ایشیا میں ناموری حاصل کر سکا جبکہ اُس کے برابر کے تمام اضلاع اور کل حصص مغربی یورپ کے وحشی اور بالکل غیر مہذب تصور کیے جاتے تھے۔

خدا غریقِ رحمت کرے ابو جان کو جو باوجودیکہ عرب سے اپنا بچہ ہزار میل فاصلہ پر تھے مگر زبان عرب کو اس سرگرمی سے ترقی دلا رہے تھے اور شاید اسی کا اثر ہے کہ ہزار کوشش کی جاے مگر عربی الفاظ زبانِ اسپین سے نکالے نہیں نکلتے۔

کانڈی جو مشہور مؤرخ اسپین ہے اس نے اپنی تاریخ میں صاف صاف لکھ دیا ہے کہ اسپین کی موجودہ زبان جس کو چار یا پانچ سو برس ہوئے عربی سے کوئی تعلق نہیں اب تک اُس میں نصف کے قریب عربی الفاظ موجود ہیں۔

اس کے بعد اس امر کا بھی خیال کرنا چاہیے کہ مسیحیوں نے اپنے ملک سے عربی کا اثر مٹانے کے لیے کیسی کیسی کوششیں کیں کہ تمام وہ علمی و کتب خانے جن کا تذکرہ اب صرف تاریخوں میں ہے۔ صرف اس خیال سے کہ وہ قرآنی زبان میں مٹے جانے والے تھے بھر بھر کے سمندریں ڈبو دیے گئے۔

کمیا۔ یہ اہواری رسالہ چارے دوست سید شریعت حسین صاحب نقوی ذی نجر الدہ جاد جالب ریڈ جالب صاحب ایدیڑ جہد لکھنؤ کی گزشتہ ۱۱۷۷ھ سے شائع کرنا شروع کیا ہے جس کے اجراء کا مقصد ملک کے سامنے صنعت و حرفت اور تجارتی و کاروباری لٹریچر کا پیش کرنا ہے۔ اس وقت تک اس کے دو نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا نمبر اپریل کے علاوہ ۸۰ صفحوں پر ختم ہوا ہے اور اس میں اعلیٰ درجے کے بتقیس مضامین ہیں۔ اس نمبر میں پہلا مضمون (کمیا کا پہلا نسخہ) خود حضرت جالب صاحب کا ہے اور باقی مضامین مگر شاہراہی قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔ دوسرا نمبر ۲۷ صفحوں پر ختم ہوا ہے اور ان میں ۲۶ مضامین ہیں اس نمبر میں حضرت جالب صاحب نے کمیا کا دوسرا نسخہ بتایا ہے جو باقی مضامین کچھ منتخب ہیں اور کچھ شاہراہی قلم کے۔ اس رسالے کی قطع ۲۰ + ۳۰ لکھائی چھاپائی عمدہ اور قیمت صرف لکھ سالانہ جوڑ ناظرین ذیل کے پتہ سے طلب فرمائیں۔ دفتر سالہ کمیا ۳۳۷ = ایسٹ روڈ۔ لکھنؤ



تفریح

(۲)

سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو دگل از
۱۹۲۵ء جون

ہم اکثر یہ سنتے ہیں کہ موسم خراب ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی موسم خراب نہیں ہے، سب موسم فرحت انگیز ہیں۔ مگر مختلف صورتوں میں بعض موسم کسادوں اور فصل کے واسطے خراب ہو سکتے ہیں۔ لیکن انسان کے واسطے کوئی موسم خراب نہیں ہو سکتا۔ دھوپ، خشک اور میٹھ۔ مازگی بخش ہوا۔ ہمیں اپنے آغوش میں لیے ہو ہیں۔ اور برف فرحت بخش ہے۔ جیسا کہ رسکن نے کہا ہے: ”حقیقہً کوئی موسم خراب نہیں، صرف یہ مختلف قسم کے اچھے موسم ہیں۔“

سنا: ابستی نہیں ہے۔ اور بعض اوقات گرمی کے ایام میں کسی درخت کے سایے کے نیچے گھاس کے مٹھی فرس پر لیٹ جانا پانی کے چشمے کے بننے کی آواز سننا۔ یا ابر کو نیلگون آسمان پر ادھر ادھر جانے دیکھنا ہرگز وقت کا ضائع کرنا نہیں ہو سکتا۔

علاوہ بریں ہوا اور ورزش ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ہونے ہیں۔ لہذا اگر تم سیر کرو گے تو تم کو دونوں فائدے حاصل ہوں گے۔ ہر شخص کو چاہیے کہ روز کم سے کم دو گھنٹے کشادہ ہوا میں جائے۔ کو پناہ اول اور پاک فرض سمجھے۔

مازی ہوا دماغ کے واسطے اسی قدر مفید ہے جس قدر جسم کے واسطے۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیر خود ہی یہ کوشش کر رہا ہے کہ ہم سے کچھ بات کرے۔ گو یا اس کو ہم سے کوئی بہت بڑا راز کہنا ہے۔ اور ہم بھی یوں نہیں سنکے پاس بہت بڑے بڑے راز ہیں جنہیں بیشک ہم کو بتلانا چاہتا ہے۔

زمین و آسمان صحرا و میدان۔ چھیلین اور دریا۔ بہارا اور سمندر بہت ہی عمدہ اسکول ماسٹر ہیں اور ہم میں سے بعض لوگوں کو ایسی باتیں قلم کر دیتی ہیں جو کتاب میں ہم کو ہرگز نہیں سکھا سکتیں۔ ۵

بزرگ درختان بنبر در نظر ہو شیار ہر درختے فزیزیت معرفت کردگار
 علاوہ اس کے اگر تم بتی کے باہر جاؤ اور دریا میں کشتی کھینچو۔ صحرا میں پھول جمع کرو
 یا مختلف قسم کے جمادات کو تلاش کرو۔ سمندر کے کنارے سپیان اور گھونگھیان اکٹھا
 کرو۔ گیند کھیلو۔ اپنے تین تازی ہو اسے مارو کرو۔ یا کسی اور قسم کی ورزش کرو تو
 تم کو یہ معلوم ہو گا کہ نہ صرف اس سے تمہاری تندرستی درست ہوئی۔ بلکہ یہ نظرائے
 گاہ کہ گویا ہوا تمہاری فکروں تکلیفوں۔ اور ترددات کو بھی اُڑالے گئی۔ یا کم سے
 اتنا ضرور معلوم ہو گا کہ وہ درج و غم کا بار جس سے تم دبے ہوے تھے ہلکا ہو گیا۔
 بجز ہم کو تسکین بخشی اور طاقت دیتا ہے اور دماغ کو اس سے سکون اور مسرت
 حاصل ہوتی ہے۔

ایک زندگی جو خوشی اور تفریح کے واسطے وقف کر دی جائے وہ نہ صرف
 خود غرضی کی زندگی زندگی ہوگی بلکہ ایک ناقابل برداشت اور بد مزہ زندگی ہوگی
 کھیل کو کبھی کار زندگی نہ سمجھ لینا چاہیے۔ مگر ان اُن سے اعتدال کے ساتھ لطف حاصل
 کرنا کا ہلی نہیں ہے۔

تفریح کے اجزاء کیا ہیں؟ دو قسم کی خوشیاں ہوتی ہیں۔ ایک سچی اور
 دوسری جھوٹی **افلاطون** کے بیان کے مطابق **سقراط** نے
سقراط سے پوچھا سچی خوشیاں کیا ہیں؟ **سقراط** نے جواب دیا کہ وہ خوشیاں
 جو ہم کو خوبصورت رنگوں صورتوں۔ خوشبوؤں اور آوازوں سے حاصل ہوتی
 ہیں اور نیز ان چیزوں سے جن کا ہونا ہم کو معلوم نہیں ہوتا اور نہ تکلیف دہ ہوتا
 لیکن اُن کی موجودگی ہم میں حس پیدا کرتی ہے اور ہم کو مسرت بخشی ہے۔

باوجودیکہ ہمارے حواس ہم کو سچی خوشی دیتے ہیں لیکن یہ اعلیٰ درجے
 کی اچھی باتیں نہیں۔ **سقراط** ہی نے یہ بھی کہا کہ **فیلی لیس** کی یہ رائے تھی
 کہ لطف خوشی۔ مسرت اور دیگر اسی قسم کے جذبات ہر ایک ذی روح کی واسطے

اچھے ہیں مگر میری یہ رائے ہے کہ یہ چیزیں نہیں۔ بلکہ عقل۔ علم۔ حافظہ اور دیگر اسی قسم کی دماغی قوتیں مثلاً اسے سلیم اور ٹھیک بحث کرنے کی طاقت بخشنے سے بہتر ہیں اور زیادہ تر اسی قابل ہیں کہ جو لوگ ان سے بہرہ اندوز ہوتے ہوں ان کی خواہش کریں اور یہ چیزیں ان لوگوں کے واسطے جن میں ان سے لطف اٹھانے کی قابلیت موجود ہے یا ہو جائے گی سب چیزوں سے زیادہ فائدہ مند ہیں۔

بھی خوشیاں قریباً بیشمار ہیں۔ عزیز واقارب۔ دوست۔ گفتگو۔ کتابیں۔ راگ۔ نظم۔ ہنر۔ ورزش۔ آرام۔ ہجرت کی خوبصورتیاں طرح طرح کے رنگ۔ گرمی جازا۔ صبح و شام۔ رات دن۔ دھوپ۔ اور آندھی۔ جنگل اور میدان۔ دریا۔ جھیل اور سمندر۔ جوتا و بنا مات۔ برگ و درخت۔ پھول پھل ان سب میں چند خوشیاں ہیں۔
مین کی گیسٹ ان کتاب ہے جب ہم یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے خدا ہم کو زمین کے پھل عطا کرنا کہ ہم ان سے لطف اٹھاویں تو ہم خدا سے ذرا اسی رحمت کے خواستگار نہیں ہوتے ہیں۔

اگر زندگی سے ہم لطف نہیں اٹھاتے تو یہ ہمارا ہی قصور ہے کہ
کتاب ہے "بہرخص لطف اٹھا سکتا ہے"۔ لیکن بہت ہی کم ہیں جو لطف اٹھاتے ہیں۔
الف لیلہ میں جو سب سے بڑا طلسم ہے وہ ایک طلسمی قالین ہے جس پر بیٹھ کر انسان جہان چاہے چلا جاوے۔ ریل آج کل ہم سب کے ساتھ ہی کر رہی ہے
رسک کتاب ہے "جون جون ہم اپنی نظر کو وسیع کرنے جاتے ہیں اسی قدر ہم اپنے تصور کے حوزے کو بڑھاتے جاتے ہیں۔"

دنیا میں جتنی خوشیاں موجود ہیں ان میں خوش بیانی کا بڑا مرتبہ ہے
یہ ایک عجیب مقوی دوا ہے جس سے دماغ اور جسم کو غذا پہنچتی ہے۔ ہر سرک
نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ "مین بن جائش کا نہایت ہی احسان مند ہوں"

۱۷۰۰ء میں ایک مشہور انگلش شاعر گدرا ہے جو ۱۷۵۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۷۰ء میں مرا۔
۱۷۵۰ء میں جانس۔ ایک مقبول عام انگریز شاعر اور ڈراما نویس تھا ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۷۷۰ء میں مر گیا۔

اور اُن کے بیان کے شام کے کھانے کو یوں بیان کیا ہے کہ جب ہم ایسے لوگوں کے مجمع میں تھے جن کی مزے دار باتیں ہم کو خوش تو کرتی تھیں مگر مجھ کو نہیں بناتی تھیں۔ اُس وقت ہر ایک شعر غذا اور شراب شوخ سے بھرت لے جاتا تھا۔

جانتے ہیں کہ جب کسی سرتوہ شام کا ذکر کرتا تھا تو یہ کہتا تھا کہ جناب ہم نے مزے کی باتیں کہیں نہ دیں۔ میری یہ حال ہے کہ اگر ایک گھنٹہ ڈارون یا لائل کننگس لے یا رسکن۔ ہو کر کھلسلی یا سڈل کی صحبت میں صرف ہوا تو وہ گھنٹہ بچھے دیا ہی تازگی بخش ہوا جیسے کہ آری ہوا کا ایک زندہ گی بخش جھونکا۔ تمام نعمتیں جو انسان کو عطا ہوئی ہیں اُن میں کسی میں آدمی ایک دوسرے سے اس قدر مختلف نہیں ہیں جس قدر کہ گفتگو کرنے کے ہنرمین بہت سے لائق آدمیوں کو جانتا ہوں اور ایسے لوگوں کو بھی جن کی صحبت میں بہت مزا آسکتا تھا۔ لیکن آپ اُن سے کوئی بات نہیں سن سکتے۔ تا وقتیکہ انہیں بار بار چھیڑ کے نہ پوچھیں۔ خوش تقریر شخص جس جگہ جائے گا لوگ اُسے آنکھوں پر بٹھا دیں گے۔ اور ہنزون کی طرح یہ ہنر بھی تربیت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور کوئی شخص بغیر مشق کیے عمدگی اور فصاحت سے گفتگو نہیں کر سکتا۔

سرولیمیمیل کہتا ہے، خوش بیانی کا پہلا جز راستی ہے۔ دوسرا خوش فہمی۔ تیسرا خوش مزاجی۔ اور چوتھا ظرافت۔ اور اولیٰ والے میں اجزاء تھوڑے بہت ہر شخص کے اختیار میں ہیں۔

بہت لوگوں نے بہت کچھ گفتگو کے ذریعہ سے سیکھ لیا ہے لیکن کہتا ہے جو شخص زیادہ پوچھتا ہے بہت کچھ سیکھ لے گا اور اپنا اطمینان کرنے کا۔ خاص کر اگر وہ شخص اس فن کے متعلق سوالات کرے جس میں جواب دینے والا دخل رکھتا ہو۔ کیونکہ اگر ایسا کرے گا۔ تو مخاطب نہایت خوشی سے جواب دے گا۔

سرولیمیمیل ایک معزز انگریز دہرہ سلطنت اور مصنف تھا۔ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۹۹ء میں مر۔

اور سائل اپنے واسطے بہت ساعلم جمع کر لے گا۔

مُحْسِن کا ذوق ہم نہ خود اپنے ذات میں پیدا کرتے ہیں اور نہ اپنے بچوں میں اور اس کے سوا کون خوشی ایسی پاک، بیلام اور سہل الوصول ہو سکتی ہے!

ایک آدمی سامنے کے منظر درختوں اور پتوں، پھل اور پھول، نیلگون آسمان، ابر کے ٹکڑوں، چمکتے ہوئے سمندر، جھیل کے ہلکوروں، دریا کی جھلک سبزے کے رنگ، اور چاند اور تاروں سے بہت زیادہ مسرت حاصل کر سکتا ہے چاند اور تارے کیا بے فائدہ چمکتے ہیں؟ کیا پرند اور تنگ، درخت اور پھول،

دریا اور جھیل، آفتاب، مانتاب اور تارے انسان کو خوشی نہیں دیتے ہیں؟ ہمسفرین کتنا جو ہمارے ایجاد کیے ہوئے رنگ ہمارے ناز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اگر ان رنگوں کا مقابلہ ایک مور کے پر کے رنگ سے یا غائب ہونے والی ابر کی بوقلمون چادر سے کیا جاوے تو وہ بالکل ہی حقیر معلوم ہوں گے۔

یہود کی کتب **طالمود** کے شارحین کا بیان ہے کہ **میرین** یا **مین** شخص کو وہی مزا ملتا تھا جو اُسے مرغوب ہوتا تھا۔ اسی طرح نیچر میں اگر تماشائی کی جائے تو ہر شخص کو اپنے مزے کی چیز مل جائے گی۔

میرا ارادہ اس بات کی کوشش کرنے کا نہیں ہے کہ سچی خوشیوں کی پوری فہرست لکھ ڈالوں۔ جب دنیا میں ہمارے واسطے ایسی خوشیاں کثرت سے موجود ہیں جن سے لطف اٹھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے تو پھر ہم کیوں اُن خوشیوں کو تلاش کریں جو خواب یا مفکوک ہیں؟ جتنی اچھی خوشیاں ہیں پہلے اُن کو ختم کر لیجئے۔ پھر اُن دوسری خوشیوں کا خیال کیجئے گا۔

جن لوگوں نے دنیا کو دیکھا ہے اور جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا کے متعلق بہت واقفیت ہے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اُن لوگوں کی ہستی کی حقیقت ایک کسان سے بھی کم ہے جو اپنے گاؤں سے کبھی باہر تو نہیں گیا مگر اُس نے ہر چیز کو عقل کی آنکھوں سے

۱۷۔ میں ۱۰۔ ایک قسم کے زہر کا نام رکھا گیا ہے۔ جس میں کہ نہ رنگ اور نہ مزا ہوتا تھا۔ اس زہر کو ایک اٹلی کی عورت سلمی طوفانی ڈبیوں میں بچا کرتی تھی اور جس سے اس نے چھڑھو آدمیوں کو ہلاک کیا تھا۔

دیکھا ہے۔ ایک ناز و نعم کی زندگی جس کو لوگ غلطی سے مرے دار زندگی کہتے ہیں اصل میں پوچھو تو سرست بخش زندگی گا ایک تکلیف دہ جھوٹا نمونہ ہے۔ جو لوگ اس میں پڑ جاتے ہیں وہ آخر میں دنیا کی شکایت کرتے ہیں۔ حالانکہ انھیں خود اپنے آپ کو الزام دینا چاہیے ہوسرک کا قول ہے جب مسرتین ہیں تھکا دیتی ہیں تو ہم یقین کرتے ہیں کہ ہم اتنی صرف کر چکے۔
دومی مسٹ نے کہا "میں جوان ہوں اور ابھی عمر کا صرف آدھا راستہ طے کیا ہے۔ مگر میں تھکا گیا ہوں اور تھکے پھر پھر کے دیکھتا ہوں یہ اترا کبسا ٹھکین افرام ہے اگر اس نے اپنی زندگی عقل کے ساتھ بسر کی ہوتی تو گزشتہ ایام کو شکر گزاری کی آنکھ سے دیکھتا۔ اور آئندہ زمانے کو امید کی نظر سے۔"

زندگی کی قدر کا اندازہ اس کی اخلاقی قیمت ہے۔ **جرمی بیل** کہتا ہے "روح اور جسم سے ایک پورا آدمی اس وقت بنتا ہے جبکہ روح عقل مندی کے ساتھ حکم دیتی ہے۔ محنت سے حکومت کرتی ہے۔ اور جسم کی خبر اسی طرح رکھتی ہے جس طرح کہ اس کے واسطے مفید ہے۔ اور اس کی ضرورت کے واسطے کافی چیزیں مہیا کر دیتی ہے۔ اور جسم کے ساتھ جو اس کا مرتبہ ہم نشین ہے ریمانہ برتاؤ کرتی ہے لیکن اگر جسم روح پر حکومت کرے اور قوت شہوانی کی زبردستی سے پہلو قوت ناطقہ کو خراب کر دے اور بعد ازان قوت متحرک اور قوت امتیاز پر مسلط ہو جائے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ روح اور جسم مناسب ہم نشین نہیں ہیں۔ اور آدمی بد قوت اور بد بخت ہے۔ اگر روح کی حکومت جسم پر نہیں تو وہ مناسب ہم جلس نہیں۔ روح کو یا تو حاکم ہونا چاہیے۔ یا غلام۔"

لے جرمی بیل انگلستان کا ایک زبردست مہربی عالم تھا جو ۱۳۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۳۷۶ء میں مر گیا۔

تندرستی

روح - انسان میں سب سے شریف حصہ ہے لیکن ہماری موجودہ حالت میں روح صرف جسم ہی کے وسیلے سے کام کر سکتی ہے۔ فیروز علی جوہار کے ملک میں ایک بڑا شخص گذرا جو اُس نے اس کی ایک بہت دلچسپ مثال پیش کی جو جسے یون شروع کیا ہو کہ "جان ایک لڑکے کی مثل ہے جو کسی کیمسٹ کی دکان میں لو کر تھا۔ ایک مرتبہ مالک نے پہلے پہل اُسے ایک گاہک کے مکان پر بھیجا تو اُس نے مکان پر جا کے دستک دئی مگر کسی نے نہ سنا۔ پھر اس بات کے دریافت کرنے کے لیے کہ آیا مکان میں کوئی موجود ہے یا نہیں اُس نے اپنا سر سنجون کے اندر ڈالا ساتھ ہی اُسے یہ فکر پیدا ہوئی کہ میں سنجون کے کس طرف ہوں۔ جس کا فیصلہ اس نے یون کیا کہ آدمی اُس جگہ ہوتا ہے جہاں اُس کا سر ہوا کرتا ہے۔ اتنے میں قبل اس کے کہ وہ وہاں سے علیحدہ ہو دروازہ یکایک کھلا اور اُس کی ٹانگیں سنجون کے درمیان میں پڑ گئیں کچل گئیں اس وقت اس کو اُس پرانی کہانی کا جو سراور پاؤں کے بابت مشہور تھی یقین آیا۔

ہماری موجودہ زندگی کی حالت کیونکر بہت ضروری ہے کہ ہم حفظ صحت کی طرف بالخصوص متوجہ ہوں۔ ہمارے آباؤ اجداد زیادہ تر دیہات اور کشادہ ہوا میں رہا کرتے تھے۔ اور کاشتکاری کا پیشہ کرتے تھے۔ اب ہم لوگ زیادہ تر شہروں میں رہا کرتے ہیں۔ اور زیادہ کام مکافون اور نوکافون اور کارخانوں میں کیا کرتے ہیں۔ ہمارے کام زیادہ تر ایسے ہوا کرتے ہیں جن میں حرکت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زیادہ جھکنا پڑتا ہے۔ اور دماغ پر بہت زور پڑتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کر سکتا کہ وہ لوگ جو ہمارے بڑے بڑے شہروں میں موجود ہیں اتنے طاقتور نہیں ہیں جتنے کہ اُن کے باپ اور دادا تھے۔ اگر کوئی شخص لندن کے اُن مقامات میں جائے جہاں غرب آدمی رہتے ہیں یا جان کارخانے موجود ہیں یا غیر ممکن ہے کہ اسے کمزور نہ کیلیں۔ زرد چہرے اور مرد اور عورتوں کے سر کے

لے فیروزی انگلستان کا ایک مشہور عالم تھا جو پیرل فلاسفی میں کمال رکھتا تھا ۱۹۵۷ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۹۷۱ء میں مرا۔

ہوے سینے نہ نظر آوین۔ علاوہ برین ہمارے حفظ صحت کی ترقیان ایک سبب سے بھی خطرناک ہیں کہ ہم کو درون اور بیرون کو زندہ رہنے دینے ہیں۔ زیادہ تر بیماری کی بھیت ایسے خفیف سببوں سے ہمارے جن کی طرف اگر تھوڑا غور اور خیال کیا جائے اور لوگوں کو حفظ صحت کے قواعد کا علم ہو جائے تو بہت زیادہ دشواریاں رفع ہو جائیں۔

جہاں تک ہمیں تاریخ سے پہلے ہر شروع زمانے میں عقلمند بران سلطنت تندرستی کا بہت خیال رکھتے تھے۔

اپنی تندرستی کا خیال رکھنا ہمارا متبرک فرض ہے۔ بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ حضرت یسویٰ کی مذہبی تعلیم میں زیادہ حصہ انجین قواعد کا ہوا کرتھا جن کو حفظ صحت سے تعلق ہوتا تھا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بیان بشکل صحیح ثابت ہو گا۔ مگر ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ جو کچھ کتب آسمانی میں ہر وہ قوانین کا ایک ضابطہ ہے جس میں دیوانی اخلاقی اور مذہبی قوانین شامل ہیں۔ ہر کیف اگر قانون تندرستی جہہ و مذہب انہیں تو بھی مذہب میں ان کا بہت کچھ لحاظ رکھا گیا ہے مقدس پولوس کہتا ہے "کیا اتم کو یہ نہیں معلوم کہ تمہارا جسم اس پاک روح کا معبد ہے جو تم میں موجود ہے جو خدا کی دی ہوئی ہے اور تمہاری ملکیت نہیں ہے۔ مصری لوگ جسم کی جس قدر عزت کرتے تھے اس کے اصول زیادہ تر عقل پر مبنی تھے۔ بتعالیٰ اس خفارت کے جو قرون وسطیٰ میں کیجاتی تھی جتنی طوروں اور دھولوں میں بالذات کوئی خوبی نہیں ہے۔ بلکہ اصل معاملہ اس کے خلاف ہے۔

کننگسلیہ کہتا ہے: اہل یونان نے طب اور نیز دماغی تعلیم کو ایک مستقل فن بنادیا۔ ان کی عورتیں طرح طرح کی نازک ورزشیں کیا کرتی تھیں اور بعض ان میں سے سخت کثرتیں بھی کرتی تھیں۔ ان کے جسم کا نمو آزادی اور تندرستی کی زندگی سے ہوا کرتا تھا۔ وہ شکیل انسان کی خوبصورتی کا ایسا نمونہ تھیں جو ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اور جس کا نظیر کبھی نہ پیدا ہو گا۔

ایک پرانی مثل ہے کہ خدا شناسی کے مرتبے کے بعد صفائی کا مرتبہ ہے۔

۱۲۸۷ء سے ۱۲۸۹ء تک کے زمانے کو قرون وسطیٰ کہتے ہیں۔

۱۲۸۹ء اور ۱۲۹۰ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۲۹۰ء میں مرا۔

اور آج کل کی طبی تحقیقات سے صرف اس پرانی کمادات کی تصدیق ہی نہیں ہوتی بلکہ دلائل سے ثابت کر دیا گیا کہ صفائی اور ہمارے کا یہ مرتبہ کیون قرار دیا گیا۔

ہم کو یہ بات معلوم ہو کہ بہت سی بیماریاں اس وجہ سے نہیں پیدا ہوتیں کہ ہمارے جسم کے اندرونی اجزاء اور ریشوں میں کسی قسم کی بے قاعدگی آگئی ہو۔ بلکہ اکثر دیگر اجسام کے حملوں سے پیدا ہوا کرتی ہیں جو پیچیدہ میں موجود ہیں۔ ہیضمہ۔ چھچک اور اکثر اس قسم کے اور امراض ہم میں خود بخود نہیں پیدا ہو جاتے۔ بلکہ اس وقت ہیں عارض ہوتے ہیں جب ان کا بیج کسی نہ کسی طرح ہمارے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے صفائی کی شدید ضرورت صرف ہمارے جسم کے واسطے نہیں ہے بلکہ ان مکانات کی بھی جن میں ہم رہتے ہیں۔ ان کی طرفوں کی بھی جھین ہم پہنتے ہیں۔ اس پانی کی بھی جس کو ہم پیتے۔ اور اس ہوا کی بھی جو سانس کے ذریعہ سے ہمارے جسم کے اندر جاتی ہے۔

انسان کا جسم ایک زندہ سچہ ہے اور ادر کے واسطے خود کر دکھنا بڑا علم ہمارے دماغ کے خزانے میں جمع ہے اور اخیال کر دکھنا کتنی جلد ہماری رگ اور پچھے قوت متحرک کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں!

سہرچمین عیظ کتاہو ایک بہت ہی شتاقی جاننے والا ایک پانہ پراک بل میں جو بیس ستر بجاسکتا ہے۔ ایک سر کے جاننے میں ایک عصبانی حرکت دماغ سے انگلیوں تک پہنچتی ہے۔ اور اسی طرح انگلیوں سے دماغ کو جاتی ہے۔ ہر سر میں انگلی کو تین حرکتیں ہوتی ہیں (۱) جھکنا (۲) اٹھنا (۳) ادھر ادھر ملنا یعنی ایک پل میں بہتر حرکتیں ہوتی ہیں۔ اور ہر حرکت میں قوت متحرک اپنا فعل جدا جدا دکھاتی ہے۔ اور بغیر کسی غلطی کے ایک خاص رفتار اور خاص قوت کے ساتھ کسی خاص مقام کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اور کھال بہت نازک اور رمل عضو ہے۔ اس میں ہزاروں لاکھوں سوراخ ہیں اور اتنی اور اتنی لمبی رگیں شریانیں اور عصاب ہیں جو اگر پھیلائی جائیں تو میلون تک ہوں۔ یہی عضو یعنی کھال متواتر اپنے تئیں از سر نو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اور اپنی اس خدمت کے انجام دینے میں اس کو تھوڑی جھکری اور بہت پانی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہر شے کا استعمال کھال کی واسطے اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ بالوں کی واسطے اس عجیب جملہ جسم کو تندرست رکھنے کے لیے ضرور ہے کہ اکثر اجزاء

کام میں مشغول رہیں۔

اکثر بیماروں کی نیت یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی خاص بیماری محض سکون بخور
سنگیکانے کہا ہے کہ مقام کیمینیا کے عیش و عشرت نے ہینبال کو کمزور
کر دیا جسے آپلیس کی برف بھی شکست نہیں دے سکی تھی۔ اپنے اسلحہ کے استعمال
میں وہ ہمیشہ فخر مند تھا لیکن عیش پرستی نے اسے شکست دیدی۔

ہمارے حواس چاہے ان میں ایسی ہی سرستیں کیوں نہ ہوں جو گناہ نہیں
ہیں اگر ہم اپنے تئیں ان کے اختیار میں دیدیں گے تو بیشک وہ ہمیں مذمت کی
کی کسی جہان سے نکال کے یا کسی گرداب میں ڈال کر یقیناً تباہ کر دیں گی۔ ہم
لوگ صرف کھانے کی وجہ سے اکثر اپنے تئیں بیمار یوں میں مبتلا کر لیا کرتے ہیں۔
اب لفظ پینے کے معنی ہی شراب پینے کے ہوا کرتے ہیں۔ جو شمالی قوموں کی ایک
بڑی شامت ہے بہت سی حالتوں میں شراب ایک بیش بہا دوا ہے۔ لیکن ہمارے
ملک کے لوگوں کی نصف سے کچھ زیادہ تکلیف مصیبت اور گناہوں کا سبب
یہی شراب ہے۔

خالص پانی جو ایمان داری کا آئینہ ہے کبھی کسی کو گنہگار نہیں
بناتا۔ لیکن شراب سے ہزاروں جرائم ہوا کرتے ہیں۔ پرانے یہودیوں کی مثل
ہر گز جب انسان کے اندر شیطان خود نہیں جاسکتا تو وہ شراب کو بھیج دیتا ہے
چالیں کا قول ہے کہ جہاں شیطان ایک دفعہ داخل ہوا اور دروازے کے
اندر رکھ دیا ہو گیا۔ پھر فوراً وہاں سے آرام اید اور خوشی ہمیشہ کے واسطے نصیب
ہو جاتی ہے۔

پلیٹینی کہتا ہے کہ شراب سے ہاتھوں میں رعشہ آنکھوں میں پانی
رات کو چینی اور بد خوابی صبح کو منہ سے بدبو اور ہوش و حواس میں بالکل بے
بہا ہو جاتا ہے۔ مذکورہ مضمون کو سر ڈیوڈ مل نے نقل کیا ہے اور اس کی تائید
بڑھایا ہے کہ جو شخص شراب سے بھرت کرتا ہے کوئی شخص اس کا اعتبار نہ کرے۔

۱۳۳۰ء قدم الامین میں روم کا ایک معزز شخص تھا جو مختلف علوم میں کمال رکھتا تھا
۱۳۳۰ء کے قریب پیدا ہوا اور ۱۳۳۰ء میں مرا۔

کیونکہ وہ راز کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ شراب انسان کو صرف جانور ہی نہیں بنادیتی بلکہ پاگل کر دیتی ہے۔ اگر تم اُس سے محبت کرو گے تو تمھاری بی بی۔ تمھاری اولاد اور تمھارے دوست تم کو حقیر اور ذلیل سمجھیں گے۔

شکیسہ نے بھی اس کی مذمت میں بہت عمدہ فقرے لکھے ہیں۔ کیسے فسوس کی بات ہو کہ آدمی اپنے دشمن (شراب) کو اپنے منہ میں رکھ لیں تاکہ وہ ان کی عقل کو چرائے جائے اور کیا غصہ ہے کہ ہم بہت خوشی و خرمی اور نعرہ ہاے سرست آئینہ کے ساتھ اپنے آپ کو جانور بنا لیتے ہیں؟

”ابھی ابھی سمجھ دار آدمی تھے۔ کڑی بھرمیں بے وقوف ہوئے۔ اور لمحہ بھرمیں جانور بن گئے۔“ ایسے آدمیوں کو چوپاؤں سے نسبت دینا بے انصافی ہے۔ کیونکہ چوپائے اُن سے اچھے ہیں۔

بجائے اس کے اعتدال کا درجہ کتنا بڑا ہو! شکیسہ کتنا ہر باوجود کیونکہ معلوم ہوتا ہوں تاہم میں طاقت و راہِ زندگی ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنے ایام جوانی میں کبھی گرم جوش دلانے والی رقیق سے (آتش سیال) کا استعمال نہیں کیا۔ اس لیے میری ضعیفی باوجود یکہ ہوا کے سخت موسم کی طرح نہایت مردہ ہے لیکن مہربان ہے۔

بعض اوقات اس بات پر بہت تعجب معلوم ہوتا ہے کہ کیوں انجیل میں بہت زیادہ اور مکرر دوسرے شراب خواری کے مذمت نہ کی گئی۔ لیکن ہم کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انجیل گرم ملک میں لکھی گئی تھی۔ اور شراب خواری ایسی برائی ہو جس کا مسکن خاصہ سرد ممالک ہیں۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کی مذمت یوں کی ہو کہ ”کس کو رنج ہوتا ہے؟ کس کو غم ہو۔ ماہے؟ کس کے درمیان میں تو ایساں ہوا کرتی ہیں؟ کون بک بک کیا کرتا ہے؟ کس کو بے سبب زخم لگا کرتے ہیں؟ کس کی آنکھیں سرخ رہتی ہیں؟ ان لوگوں کی جو شراب خانے میں زیادہ دیر تک ٹھہرتے ہیں۔ ان لوگوں کی جن کو شراب کی تلاش ہوتی ہے۔ جب شراب کا گلابی رنگ جام میں چمکتا ہوا نظر آئے تو تو اُس کی طرف نہ دیکھ۔ اس لیے کہ آخر میں وہ ایک سناپ کی طرح کاٹتی اور نہریلے پچھو کی طرح ڈبک مارتی ہے۔“

میں اس بات کے امید کرنے کی وجہ کہ شراب خواری ایک ایسی بُرائی ہے جو روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ اب چین چونکہ اس بات کا زیادہ موقع ملتا ہے کہ داغی کاموں میں مصروف ہوں اور راگ تصویر میں اور کتابیں لطف اٹھانے کے لیے بہ نسبت پیشتر کہ اب زیادہ آسانی سے ہم پہنچ سکتے ہیں۔ لہذا ان باتوں سے شراب کے چھوٹنے میں بہت مدد مل رہی ہے۔

لیکن شراب خواری کی بُرائیاں اگر انہر من الشمس ہیں تو زیادہ خواری کی بُرائیاں بھی کم مشہور نہیں۔ غالباً نوے فیصدی ایسے لوگ ہیں جو اس سے زیادہ کھا لیتے ہیں جتنا کہ اُن کے واسطے ضروری اور مناسب ہے کبھی بھی دعوت میں زیادہ کھا لینے میں جہان مضائقہ نہیں۔ مگر یہ روز روز کا معدے میں بھر لینا ہے جو مضر بڑھتا ہے اور پست کر دیتا ہے۔ حد سے زیادہ کھا لینا آسان ہے مگر حد سے کم کھانے کا کوئی خوف نہیں۔

اعتدال کو طاقت سے علاقہ ہے۔ کمزوری سے نہیں۔ اعتدال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کو اپنے اوپر اختیار حاصل ہے اور آپ کی خواہشیں آپ کے کئے میں ہیں۔

دستر خوان پر زیادہ زمانے تک نہ جم جاؤ۔ لیکن بہت جلدی بھی نہ کھاؤ۔ اُس وقت کھانے سے ہاتھ کھینچ لو جب تم کو تھوڑی اشتہا باقی ہو۔ اگر معدہ خوب بھرا ہو۔ ماسے تو داغ کام نہیں کر سکتا۔ دن کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنا بہت اچھا قاعدہ ہے لیکن یہ بہت افسوس ناک زندگی ہے کہ تم اتنا کھا لو کہ ایک کھانے کے وقت سے دوسرے کھانے کے وقت تک تم کو بڑا ہی رہنا پڑے۔ کھانا بڑے رہنے کے واسطے کھاؤ نہ یہ کہ اپنی زندگی کھانے کی واسطے وقف کر دو۔ شعر خور دن برائے زیستن و ذکر کردن است + تو معتقد کہ زینتِ زہر خور دن است زیادہ کھانا زندگی کو کم کرنا ہے۔

جب وحشی لوگ ٹڈیسن من (یعنی اپنی قوم کے کاہن اور طبیب) بننا چاہتے ہیں تو وہ منجھ اور باتوں کے ایک بڑے روئے کی بھی تیار کر لیا کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے اعصاب میں بہت چستی اور تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

جس کو وہ الہام سمجھتے ہیں۔ آخر انھیں اس بات کا ملکہ حد سے زیادہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی اور شخص کرے تو اس کو بھی یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ خدا کم کرنے سے داعی قوت زیادہ ہو سکتی ہے۔

علاوہ برین ہلکا معده دل کو ہلکا بنا دیتا ہے۔ اور زیادہ کھانا تو لوگوں کو کم کرتا ہے۔ اگر آپ اُن لوگوں کو جمع کریں جو بیمار ہیں تو آپ کو یہ معلوم ہو گا کہ صرف ضعف معده کے مارنے کی تعداد دیگر امراض کے مجموعی تعداد کے برابر ہے۔

سیکین کا قول ہے۔ اس بات سے ہوشیار رہو کہ تمہاری غذا میں یکایک کوئی بہت بڑی تبدیلی نہ واقع ہونے پائے اگر تبدیلی کی ضرورت ہے تو اور دوسری باتوں کو بھی اُس کے مطابق کرو۔ کھانے کے وقت دل میں دوسو سہ نہ لاؤ اور خوش و خرم ہو۔ سونے اور ورزش کرنے کا بہت خیال رکھو۔ یہ نصیحت نہایت ہی عمدہ اور بہت زمانے تک قائم رہنے والی ہے۔

ایئر تھری نے کہا ہے۔ اگر تم اچھے رہنا چاہتے ہو تو تم کو چاہیے کہ چھ پنس دن رات پر بسر کرو اور اُن کو خود پیدا کرو۔ یہ نصیحت جو بہت تھوڑے الفاظ میں کی گئی ہے اس میں نکل کھانے اور ورزش کے متعلق تمام ضروری باتیں شامل ہیں۔ چھ پنس میں اور خاص کر جبکہ ورزشانی ہو آپ کا فی الفور صحت بخش غذا خرید سکتے ہیں۔ مگر ان آپ کو اس میں بڑھنے نہ ملے گا کہ خوب ٹرین اڑائیے اور نا کون نا ک غذا بھی لیجیے۔ اس نصیحت میں ورزش پر بھی زور دیا گیا ہے۔

بالفعل جو بیماری موجودہ حالت ہے اس کے لحاظ سے اگر ہم تھوڑی بہرہ کشادہ ہو امین سیر کریں تو اسے کوئی وقت کا ضائع کرنا نہ خیال کرے گا۔ اتنا وقت زندگی کے حساب میں نہیں درج کیا جائے گا بلکہ اس سے زندگی بڑھے گی۔

صاف پانی کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ تازہ ہوا کی۔ پانی کی زیادہ مقدار (خاص کر ٹھنڈے پانی کی اگر تم اس کو بہداشت کر سکو) اندر اور باہر جسم میں دونوں جہتوں کے واسطے ضروری ہے۔ اور اذرا سی باتیں جیسے دانتوں کی صفائی کا خیال رکھنا زندگی کے آرام میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیتی ہیں۔

ایئر تھری ایک رابرٹ ڈاکٹر تھا جو اسکاٹ لینڈ میں علاقہ میں پیدا ہوا اور اس نے عرصہ عرصہ مرا

تندرستی کا دار و مدار دواؤں سے زیادہ عادات اور غذا پر ہے۔ ہمارے
آبا و اجداد صحت بیاہری کے دور کرنے کے واسطے دوا کا استعمال کیا کرتے تھے۔
طیبیوں کے کالج ہی نہیں بلکہ سیکین نے بھی دواؤں کی تعریف کی ہے۔ اور ان کے
استعمال کی سفارش کرتے ہیں۔ لیکن ابتدائی غلطی جو لاکھ پہلا شخص تھا جس نے
اس غلطی کو سب پر عیان کر دیا۔ ڈیکل سائنس کا نام ہی دواؤں کے استعمال کو بتلا گیا۔
لیکن اگر ہم ہوش و حواس کے ساتھ زندگی بسر کریں تو ہمیں دواؤں کی واسطے بہت
کم صرف کرنا پڑے گا۔

پتھر کو آزادی سے اپنا کام کرنے دو۔ اسے نہ چھیڑو۔ اور صحت اس کو کام
کرنے دو۔ یہی اصول صحت کا قول ہے۔ زندہ ہول کے خلاف کام نہ کرو۔ بس اتنا کرو۔
کہ اسے اپنے مقین خود پہچانے کی آزادی دیدو وہ تمہیں دوا سے زیادہ فائدہ
پہنچائے گا۔

ہوا اور پانی کی کثیر المقداری اور غذا میں اعتدال رکھنے سے ہم کو تندرستی
اور طاقت کے جذبات کا لطف حاصل ہو گا۔ اور جب تک ہم بہت ہی زیادہ سحر
نہ ہو جائیں گے۔ اس وقت تک ہمارے دل میں جوانی کی بہار قائم رہے گی۔ ہمارے
سینے سمجھ لینا چاہیے کہ تندرستی سے صحت جسم ہی کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ اگر
کہ حر و حر و سن کتنا ہے کہ غصہ۔ نفرت۔ رنج۔ اور خون ایسی چیزیں ہیں جو بہت ہی
سو ہان روح ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے خوشی۔ خوش مزاجی۔ اور دل جمعی تندرستی
کے بہت قوی اجزاء ہیں۔

یہ مشہور ہے کہ لائی گرس نے اسپارٹا کے ہر ایک ایٹک بال دکھانے
کے کمرے میں ایک چھوٹی تصویر ہنسی کے دیوتا کی نصب کرا دی تھی۔

۱۷۵۰ء کو جرمن انگلستان کا ایک شاہراہی لائن تھا جس نے فلسفہ زبان کے متعلق
تھاؤن کے پتے کو چھوڑ دیا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۵ء میں مر گیا۔ لائی گرس لوہان کے
شہر پارٹا کا مشہور معروف اور نامی گرامی معین تھا۔ وہ حضرت مسیح سے تقریباً ۱۸۰۰
پیشتر جزیرہ کریشیا میں مرا۔ ۱۸۶۵ء میں ایک فرانسیسی مسلم مستند ماہر فلسفہ طبیعی تھا
جو ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوا۔ اور ۱۸۶۵ء میں مر گیا۔

کہا ہو کہ بہت سے لوگ زیادہ عمر تک زندہ رہ سکتے لیکن اُن کو اندیشے اور آزر دگیان آندا
 میں یہ بات اُس نے صرف اپنے جو مطلقون کے بابت کہی تھی مگر صادق سب پر آتی ہے۔
 جب کہ ہم بد داغ ہوتے ہیں تو ذرا ذرا سی اور معمولی ناگوار یاں ہم کو ایک آفت ناگہانی معلوم
 ہوتی ہیں جب ایسی حالت ہو تو ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہمیں آرام لینے اور تازہ و جوانی ضرورت ہے
 ہم اکثر یہ سنتے ہیں کہ فلان لوگوں پر کام کا بہت بوجھ ہے۔ اور وہ سن رسیدہ لوگ کام
 کرتے کرتے مر گئے۔ بہت سی حالتوں میں صرف اوسط درجے کی مشقت سے نہیں بلکہ جو شغل اور
 مزد سے صحت جسمانی کو مضرب ہو چکا ہے بیکاری کی ہستی جیاشی۔ اور نفس پروری سے بہت
 سخت کام کے لوگوں کو زیادہ ہلاک کر ڈالا ہے۔ داغ کو بھی اعصاب کی طرح درزش کی
 ضرورت ہے۔ اگر تم اپنے تئیں سویرے سوئے۔ سویرے اٹھنے۔ اعتدال۔ اور عقلانیت کا وزن
 کا عادی بنا لو گے تو کام بلکہ سخت کام اگر حد سے زیادہ تجاویز نہ کر گیا ہو تو تم کو یہ نقصان
 کے فائدہ ہو چکا ہے۔

ہم میں بہت لوگ ایسے ہیں جن کو اکثر انون کو خند نہیں آتی۔ واقعی یہ حالت بہت
 آزار دہ ہے۔ ایسی کیفیت میں انسان کو یہ معلوم ہو۔ اچھو کہ جیسے کوئی بڑی سخت آفت ناگہانی
 سر پر آئے ہو گی۔ اور ذرا ذرا سے مشکلات جن کے حل کرنے میں اگر داغ کی ایسی حالت
 نہ ہو تو خوشی معلوم ہوتی اس حالت میں مالا محمل نظر آتے ہیں۔ اور یہ نظر آنے لگتا ہے
 کہ داغ مسرت دہ چیزوں سے بھاگتا ہے اور ایسی باتوں کے خیال میں جو گذر گئے ہیں یا جس
 کے داغ ہونے میں کوئی برائی ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو ناامید نہ ہونا چاہیے۔ نیند نہ آنے
 سے کوئی شخص مر نہیں جاتا ہے۔ سب سے اچھی یہ بات ہے کہ وہ نہ استعمال کرے۔ اس کا استعمال
 حقیقہً خطرناک ہے۔ جہاں یہ ممکن ہو مگر میں نہ رہو بلکہ باہر ہو۔ اور جہاں تک بنے باتوں کو
 آسان سمجھو اور اُن پر بھروسہ نہ کرو۔ نیند کی برکت پھر ایک دن تم کو نصیب ہو جائے گی۔ اگر
 بے خوابی کو بہت عرصہ نہیں ہو گیا ہے تو اس کا یہ اجر ملے گا کہ تم کو نیند کی برکت اور قدر معلوم
 ہوگی جس کی ہم لوگ عموماً آدمی بھی قدر نہیں کرتے ہیں۔

بہت سی جماعتی شکایتوں کا مرکز داغ ہی ہوا کرتا ہے۔ طبیبوں کو صورت جسمانی
 علامات ہی نہیں سوچنا پڑتے ہیں بلکہ بعض اوقات اُن کو مندرجہ ذیل مسئلہ پر غور کرنا پڑتا ہے۔
 کیا تو بیمار دل کا علاج نہیں کر سکتا؟ اور حافظہ سے مدد کی جو کو نہیں اٹھ کر سکتا؟ کیا

دماغی تفکرات کو نہیں جھیل سکتا؟ کیا جیسے پاس کوئی ایسی بھلا دینے والی دوا نہیں کہ جس سے
تو سینے کو اس ایذا رسان مادے سے پاک کر لے جو دل کو دبا رہے ہو؟
علاوہ برین تندرستی صرف سرت کا ایک بہت بڑا جزو ہی نہیں بلکہ اچھے کام کو سہل بناتا
ضروری ہے۔ اس کا پھینک دینا صرف ضائع کر دینا ہی بلکہ خود فرضی ہے۔

اگر ہم اپنے اعضاء پر حد سے زیادہ زور دین گے تو پھر ہمیں اچھا کام کرنا غیر ممکن ہوگا۔
یاد رکھنا چاہیے کہ بہت عمدہ کام نہ ہو سکے گا۔ یہ ایک بہت بڑی حکمت علیٰ ہے کیونکہ اگر ہم اسی
طرح محنت کرتے رہے تو آئندہ ہمیں پھر زیادہ زانے تک سہانا اور آرام کرنا پڑے گا۔ قطع
نظر اسکے جو کام ایسی حالت میں کیا جائے گا وہ اعلیٰ درجے کا کام نہ ہوگا۔ اس میں کمزوری
اور جھجلاہٹ کے نشان باہر آئیں گے۔ اسے ابھی نہ ہوگی۔ اگر اس راس کے انجام دینے
میں دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملات کرنے کی ضرورت ہوگی تو آپس میں جھگڑا اور بال
ہو جانے کا احتمال ہوگا۔ اگر کسی کو اس بات کا اعتبار نہ ہو تو امتحان کر کے دیکھ لے۔ اس
سے ایسی حالت میں نقشہ بنانے کو کہہ اسے بنانے وقت خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ کس کا فہم
قائم نہیں جو اور نہ پوری طرح اسکے اختیار میں ہے اس حالت کا سبب رگ پٹھوں کی ٹھکاوٹ نہیں ہے بلکہ
اعصاب کی بیداری۔ جن مشقت سے لطف اٹھانا چاہیے اور لطف اٹھانے کا سہل طریقہ ضروری ہے
کہ ہم استقلال اور قوت کے ساتھ کام کریں لیکن ہم کو لگا ہوا محنت نہ کرنی چاہیے جس میں ہم کھائے
آرام و ورزش اور تعطیلات تک کو بھلا دیں۔

جس وقت انسان بیماری کو خود اپنے ہاتھوں مول لیتا ہے اس وقت اس کو یہ بات
اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ بیماری کا کس قدر میلان اس کے کمزور کرنے اور اس کی قوت کھلانے کی طرف
ہو رہا ہے بخلاف اسکے آپ کو بہت لوگ ایسے بھی ملین گے جنہوں نے اپنے تئیں خود بیمار اور کمزور
نہیں بنا لیا ہے بلکہ ان کے جسم کی بناوٹ ہی پیدائش کے وقت سے ایسی ہو کر آئے دن بیمار ہو کر رہ
ہیں۔ ایسی حالتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پھر اس کا معادہ اخین یہ دیتا ہے کہ ان کا دماغ بہت
صاف اور روشن ہو رہا ہے۔ ہم سب لوگوں کو ایسے اشخاص بھی ملتے ہیں جو مصیبت میں مبتلا ہیں۔
جن کی خوشی اور خوش مزاجی سے ہم کو تندرست بن کر صحت پسن ہی نہیں لایا بلکہ وہ لوگ
اپنی اس مصیبت ہی کو جو ہم سے عالمگیر تہ اور پاک لوگ خیال کیے گئے ہیں۔



ابن سمعون

(از مولانا عبدالحلیم صاحب شریعہ رحمہ اللہ)

”ابن سمعون محمد بن احمد بن اسماعیلؒ دولت عباسیہ میں جہان ہر فن کے اہل کمال گذرے ہیں وہاں بعض واعظ اور اسپیکر بھی بلا کے جادو بیان ہوئے ہیں جس امر کو بیان کرنا چاہیں اُس میں ایسے ایسے نکات اور رموز پیدا کرتے تھے کہ عقل حیرت میں رہ جاتی تھی خصوصاً اس کے دل پر اثر ڈال دینے میں تو ایسا کمال حاصل تھا کہ ممکن کیا یہ کسی امر کو بیان کرین اور سننے والے اعتراف نہ کر لیں۔ ان کی موثر زبان کے ایسے ایسے واقعات مشہور ہیں کہ لوگوں کو سن کے حیرت ہو جائے گی۔ اپنی اس معجز نازبان سے انھوں نے دین اسلام کی بہت خدمت کی۔ کہتے ہیں کہ جب ابن سمعون آیات و احادیث کا وعظ کیا کرتے تھے اور عذاب الہی کا نمونہ دکھانے لگتے تھے اس وقت لوگوں کی رقت قلب کا یہ عالم ہوتا تھا کہ وہ شخص جس کا دل سخت سے سخت ہوتا تھا وہ بھی زار و قطار روتا تھا۔ اور تمام دنیا وی دلچسپیان اُس کی نظر میں بیچ ہو جاتی تھیں۔“

ان کی تعریف میں اکثر مورخین نے بہت مبالغہ کیا ہے لیکن وہ صریح خیال میں یہاں تک اور اصل میں ابن سمعون کے سچے حالات بیان کیے گئے ہیں چنانچہ ابو جریج بن عبد اللہ کا ایسا مشہور و معروف نامور مورخ اپنی تاریخ بغداد میں اس آتش زبان فخر بغداد کی نسبت لکھتا ہے۔

كَانَ وَاحِدًا دَهْرًا وَقَدْ رُفِعَ عَصَا فِي الْكَلَامِ وَلِسَانُ الْوَاعِظِ دُونَ النَّاسِ حِكْمَةٌ وَجَمْعُ الْكَلَامَةِ۔ یعنی ابن سمعون لمحاظ زبان آوری اور پند و نصائح کے اپنے عہد کے یکتا زمانہ تھے۔ لوگوں نے اُن کے کلمات حکمت آیات

کو لکھا اور نقل کیا احمد بن عبدالمومن تریسی نے ان کی تعریف میں اور بہت سے کلمات کے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید ابن سمعون کا ایسا کوئی شخص دنیا میں نہیں ہوا۔ جلال الدین جوزی نے ابن سمعون کی بہت کچھ تعریف کر کے لکھا ہے کہ اُن کو لوگوں نے شیخ اناطی بالکلت کا خطاب دے رکھا تھا۔ یعنی ایسے بزرگ جو حکمت کی باتیں فرمایا کرتے ہیں۔

ان کی پیدائش کی صحیح تاریخ نہیں معلوم مگر اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب تیسری صدی ہجری تمام ہوئی اور چوتھی صدی شروع ہوئی تھی۔ دارالسلام بغداد میں پیدا ہوئے۔ اسی مبارک اور مشہور شہر میں نشوونما پایا۔ اسکی فضائیں کھیل کھیل کے بن تیسرے سو پچھتر کے پچیس ہی میں ان کو شہر سے نکالا اور سعادت مندی کے آثار ظاہر تھے۔ اہل بصیرت ان کی صورت دیکھتے ہی کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ ہونا بچہ کسی عہد میں اعلیٰ درجہ کمال کو پہنچے گا۔

ابو بکر اصفہانی جو شیخ شبلی کے خادم خاص تھے کہتے ہیں ایک دن شیخ شبلی جامع بغداد میں بیٹھے تھے اور میں بھی موجود تھا کہ اتفاقاً ابن سمعون جن کا ابھی پچیس تھا سامنے آئے گذرے۔ ابن سمعون اُن دنوں اس قدر کم عمر تھے کہ بچوں کی ایسی ٹوپی سر پہ تھی۔ اور شرارت اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ شیخ شبلی کے سامنے سے ہو کے نکلے مگر سلام تک نہیں کیا۔ شبلی نے ان کی صورت دیکھ کے ذرا اہل کیا اور میری طرف متوجہ ہو کے کہنے لگے۔ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ اس لڑکے میں کیسے کیسے اوصاف کا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے؟ ابو بکر اصفہانی خود ہی بیان کرتے ہیں کہ شبلی جب مجھے ہمیشہ یاد رہا بیان تک کہ وہ زمانہ آگیا جب ابن سمعون کی شہرت و ناموری دنیا بھر میں مشہور تھی۔

ابن سمعون ایک ایسے شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں علم کے صد ہا چشمہ بہہ رہے تھے۔ اور تمام شایقانِ علوم کو دور دور سے کھینچنے کے واسطے آتے تھے۔ لہذا تقدیر نے اُن کے ساتھ اسی ہمدردی کی کہ انھیں طلب علم میں کہیں دور کا سفر نہ کرنا پڑا۔ ان کے طالب علمانہ سفر اسی پر محدود رہے کہ ایک محلہ سے نکل کے دوسرے محلہ میں چلے گئے۔ مگر بغداد میں یہ کسی خاص استاد کے

دامن سے وابستہ نہیں رہی بلکہ ہر صاحب درس کے آگے کتاب کھول کے بیٹھے اور ہر حشر سے سیراب ہوئے۔ فن حدیث میں عبداللہ بن ابوداؤد و سجستانی، ابو عبد اللہ محمد بن محنف دوری، احمد بن محمد بن مسلم بخاری سے باکمالی حاملان احادیث بنوی کے شاگرد ہیں۔ ذوق تصوف بھی دل میں تھا۔ اگرچہ بچپن کی نا سمجھی نے کسی عہد میں شیخ شبلی کو سلام کرنے کی بھی اجازت نہیں دی تھی لیکن آخر ایک ایسا عہد آیا کہ تصفیہ وطن کے شوق نے انھیں بزرگ کی خدمت میں پہنچایا۔ انھوں نے شیخ شبلی کا آخر عہد پایا۔ لیکن طبیعت ایسی مناسب پائی تھی کہ ٹھوڑی ہی محنت میں بہت کچھ فیض حاصل کر لیا تھا۔ علامہ ابن سمون چونکہ ایک بہت بڑے واعظ اور معربان ہونے والے تھے لہذا ان کی طبیعت بچپن ہی سے ادھر کا رخ دکھا رہی تھی۔ وہ واعظ جمہور نے دار الخلافہ بغداد کی اعلیٰ محفلوں اور محفلوں میں پند و نصائح کے دروازے کھول رکھے تھے۔ اور جن کی شیوا بیانی کی دھوم موری تھی ان کی محفلوں میں ہمیشہ اپنے طبعی میلان سے جاتے تھے۔ اور ان کی زبان سے جو جملہ نکلتے تھے ان پر اس حیثیت سے غور کرتے تھے کہ یہ کیوں کر ہو کر ہو گئے۔ اور جو باریکیاں اور نکات ان کی تقریر سے ظاہر ہونے لگے ان کو سمجھ کر لیا کرتے تھے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی شیوا بیانی کی شہرت ایسی غالب ہوئی کہ یہ باوجود تمام علوم میں کمال رکھنے کے ایک اعلیٰ درجے کے سیکر ہی مشہور ہوئے۔ اور تقریر سے دائون پر اثر ڈال دینے کی شہرت نے اور سب اوصاف کو بادیار حتیٰ کہ ابوالقاسم حریری نے اس کے ایک واعظ کی تعریف میں ابن سمون کا نام مطرح لیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیوا بیانی اور طلاق لسانی میں ضرب المثل ہو گئے تھے۔

مرآۃ الجنان میں ابن سمون کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ یعنی ابن سمون ابتداء عہد میں نہایت پریشان حال تھے۔ لہذا وہ ان کے محتاج اور غرب زدہ فقراء میں ان کا شمار بھی تھا۔ لیکن اس پریشان حالی کے زمانے میں یہ لوگوں سے خیرات اور صدقات نہیں لیتے تھے بلکہ نہایت پر بسواقت کرتے تھے اکثر کنایہ میں اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے امداد ان کو بغداد کے علمی بازاروں

میں فروخت کر لیا کرتے تھے۔ ایک ضعیف اور فلاکت زدہ ماں زندہ تھی جس کی میت گزاری اس طرح کرتے کہ گویا جو کچھ کماتے تھے صرف اسی کے لیے۔ ورنہ میں اپنا پیٹ وہ ہر طرح پال سکتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ابن سمعون نے صرف ماں کی خدمت گزاری کے لیے اپنے بہت سے طبعی شوقوں کو دوبارہ کھا تھا۔ ذوق علم نے جو ان کا قدم سفر کی منزلوں تک نہ پہنچنے دیا اس کی وجہ شاید وہی ضعیف ماں تھی۔ ایک دن بیٹھے ماں سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرنے ہی کرتے کچھ دینی ذوق نے ایسا جوش پیدا کیا کہ ماں سے کہنے لگے۔ ماں جان مجھے حج اور زیارت بیت اللہ کا نہایت شوق ہے اگر آپ اپنے اس ذلیل بیٹے کو سفر حج کی اجازت دیتیں تو مجھ سے جس طرح فقر و فاقہ سے بٹا کر عظیم کا عازم ہوتا اور وعدہ کرتا ہوں کہ خانہ کعبہ میں اور نیز ہر مقام مقدس میں جس کی زیارت کی مجھے عزت حاصل ہوتی نہایت آپ کو یاد کرتا۔ اور آپ کی طرف سے مغفرت اور نجات کی دعائیں مانگتا۔ ماں نے یہ خیال سن کے شدت سے انکار کیا۔ اور کہا۔ ابن سمعون بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے۔ اول تو اس مصیبت و افلاس میں مجھ سے سفر کیونکر کیا جائیگا۔ اور اگر بالفرض تو چلا بھی گیا تو بتا میری زندگی بسر ہو نیکی کو نہ صورت ہو۔ جب تک تو آئے آئے میرا کام افلاس میں تمام ہو جائے گا۔ ماں کی زبان سے یہ جواب سن کے ابن سمعون خاموش رہا۔ اور ڈر گئے کہ ایسا نہ ہو ماں جان نہ زیادہ خفا ہو جائیں۔ اتفاقاً اسی وقت اور اسی صحبت میں بیٹھے بیٹھے ان کی ماں کی آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی ہی دیر اس ضعیف پر عالم غم ہو گئی طبعی رونا ہوا گا کہ یک بیک وہ چونک پڑی۔ اور اٹھنے ہی جو ہیلا جملہ اس کی زبان سے نکلا یہ تھا کہ "بیٹا ابن سمعون سفر حج کا سامان کرے میں ہرگز نہیں روکتی ہوں" ابن سمعون نے پوچھا "ماں جان کیوں؟ کیا ہوا جو آپ نے یوں یک بیک مجھے اجازت دے دی۔ اور نہ میرے مصائب سفر کا خیال کیا اور نہ اپنی تنگ حالی کو دیکھا۔ ماں نے جواب دیا کہ "بیٹا۔ ابھی جو میری آنکھ لگ گئی تو میں نے خواب میں جناب رسول اللہ صلیم کے جلال پاک کی زیارت کی اُنھوں نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے خدا کی بندی اس لیے بیٹے کو ایسی دولت سہمی اور ایسے ارادہ نیک سے کیوں

روکتی ہو۔ اُسے فوراً اجازت دے۔ اس لیے کہ اُس کے لیے دینی اور دنیاوی دونوں
 بھلائیوں اس سفر پر منحصر ہیں۔ بھلا اب حضرت رسول صلعم کی زبان مبارک سے من کے
 میں کیونکر بچھے روک سکتی ہوں۔ بس اب تو سفر کے لیے آمادہ ہو۔ مجھ سے جس طرح بنے گا
 اپنی بسر کروں گی۔ ان کی زبان سے اس خواب کا حال سن کے ابن سمعون پر عجیب حالت
 طاری ہوئی اور پھر اس کے ساتھ نہایت درجہ خوش ہوئے کہ حضرت رسالت پناہ صلعم کے
 حکم سے میں سفر حج کروں گا۔ الغرض جوش میں آ کے اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دو چار
 کتابیں جو لکھی رکھی تھیں ان کو ہاتھ میں لیا اور بازار میں جا کے جس قیمت کو بیکین فوراً بیچ
 ڈالا۔ اُن کی قیمت لاکھ ان کو دی اور کہا جب تک بن سکے آپ اس تھوڑی سی رقم
 پر اپنی زندگی بسر کیجیے۔ میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کے گھر کو خیر باد کہی اور حاجیوں کا جو قافلہ
 مکہ معظمہ جاتا ہوا اُس کے ہمراہ پایادہ روانہ ہوئے۔ ابھی قافلہ اور بُری قسمت نے
 ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ان کی شوخی قسمت اور سب اہل قافلہ پر بھی اثر کر گئی۔ وہ
 عظیم الشان اور لائقِ وق صحرا جو عراق سے مغربی سواحل عرب تک چلا گیا۔ اس
 میں دیگر شائد عرب کے علاوہ یہ بہت بڑی مصیبت پڑی کہ صحرائی بددیون نے
 قافلہ کو لوٹ لیا۔ ہر مسافر کے پاس جو کچھ مال و اسباب کھانا و برہ دستی چھین لیا۔ یہاں
 کہ سب اہل قافلہ سے کپڑے تک اُتر دائے۔ ابن سمعون پچاس کے پاس کیا تھا لیکن
 لیٹھوں نے اُنھیں بھی نہ چھوڑا۔ کپڑے اُتار لیے اور بالکل برہنہ صحرا میں چھوڑ دیا خود
 کہتے ہیں کہ میں وہاں تنگا اور زنا دھو رہا تھا۔ دو انگلی کپڑا بھی نہ تھا۔ جس سے ستر عورت
 کرتا۔ قافلہ والے بھی سب اسی طرح لٹ گئے تھے۔ اتفاقاً قافلوں نے دیکھا کہ ایک شخص
 ہاتھ میں ایک عبا لیے کھڑا ہے۔ میں اُس کے قریب گیا اور کہا۔ آپ میری حالت ملاحظہ
 فرمائیے اور مجھ پر ترس کھائیے۔ اُنھوں نے وہ عبا مجھ کو دیدی۔ میں نے اُس کو پھاڑ کر
 دو حصوں پر تقسیم کیا۔ ایک کو کمر میں پیٹ لیا اور ایک کو کندھے پر ڈال لیا۔ خبر لوٹے
 مارے اہل قافلہ آگے روانہ ہوئے۔ قافلہ میں اور لوگوں کو تو خیر کچھ کھانے پینے کو
 مل جاتا تھا مگر میرا یہ عالم تھا کہ قافہ پر قافہ ہوتے تھے۔ جب زیادہ شدت گرمی
 ہوتی تو اس وقت جب کہ قافلہ کے لوگ کھانا کھانے کو بیٹھتے میں اُن کے سامنے
 جا کے کھڑا ہو جاتا۔ وہ ترس کھا کے ایک آدمہ کھڑا رہتی گا سیری طرف پھینک دیتے

میں شکر یہ ادا کر کے لے لینا اور اسی پر زندگی بسر کرنا۔ اس فقیری کے عالم میں
 بھیک مانگتا ہوا میں اُس مقام پر پہنچا جہاں سے اہل بندہ و احرام باندھا کر سستے
 تھے۔ انہیں دونوں کپڑوں سے اُنہیں خوب دھو کے اور پاک دھوا کر کے
 میں نے احرام کا کام لیا بہر حال جس طرح بنا میں نے حج کر کے خدا کا شکر ادا کیا۔
 کہ مجھے ایسے کار خیر کی توفیق دی۔ چند روز دہن رہا۔ بنی شیبہ میں سے ایک
 شخص تھا جس کے قبضہ میں خانہ کعبہ کی کنجیاں تھیں۔ میں ایام قیام مکہ میں ایک
 روز اس کے پاس گیا اور اپنا حال بیان کیا۔ اُس کو میرے حال پر بہت کچھ تسکین
 معلوم ہوا۔ اس کے متاثر ہونے پر مجھے اتنی جرأت ہوئی کہ میں نے کہا: "آپ سے
 اتنی درخواست کرتا ہوں کہ چونکہ خانہ کعبہ آپ کے اختیار میں ہے لہذا مجھے کوئی
 ایسا موقع دیجیے کہ تنہا میں ہی اندر جا کے خلوت میں خدا سے کچھ دعا مانگوں"
 اس نے وعدہ کیا۔ اور ایک روز جب سب لوگ خانہ کعبہ سے نکل چکے تھے اُس
 نے مجھے اندر داخل کر کے دروازہ بند کر لیا۔ مجھے یہ نہایت عمدہ موقع ملا
 تھا۔ میں نے نہایت خشوع و خضوع سے درگاہ باری تعالیٰ میں دعا مانگنا
 شروع کی۔ اور اس عالم بخود میں میری زبان سے یہ کلمات نکلتے: "بار الہا
 تو میرے فقر و فاقہ اور افلاس کا حال بخوبی جانتا ہے۔ کچھ اس کی ضرورت نہیں
 کہ میں اپنی زبان سے عرض کروں مجھے اپنے خوانِ کرم سے ایسا کچھ مرحمت کر
 کہ سوائے اور کسی کا محتاج نہ رہوں" اور یہ کلمات میری زبان سے نکلے
 اور مٹا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے: یا اللہ یہ شخص دعا میں غلطی کرتا ہے۔ اس کو
 ایسی ہی زندگی ملے کہ کبھی معاش کی طرف سے اطمینان نہ ہو" یہ آواز سن کے
 میں چاروں طرف حیرت سے دیکھنے لگا مگر کوئی شخص نظر نہ آیا۔ میں پھر
 خدا کی طرف متوجہ ہوا اور دعا میں وہی الفاظ لے اور پھر وہی آواز
 آئی اور دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ تین دفعہ ایسا ہی اتفاق ہوا۔ خیر میں نے چند
 خیال نہ کیا۔ اور خانہ کعبہ سے باہر نکل آیا اور مکہ منورہ کے عراق کی
 راہ لی۔ طالع اللہ خاندان حضرت عباس سے خلیفہ بنیاد تھا۔ اس نے اتفاقاً
 اسی زمانہ میں اپنی ایک بہیمانہ لوندی کو کسی سبب سے اپنے اوپر حرام

کر لیا تھا۔ لیکن اُسے خوف ہوا کہ اگر لونڈی یونین گھر سے کمال دی جائے گی تو خون
 جو کہ بے عصمت ہو جائے۔ لہذا بعض شیسروں سے صلاح پوچھی۔ ایک شہر نے کہا
 ابن سمعون و اعفا غریب حج سے واپس آیا جا رہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اسے لومنین اس
 لونڈی کو اس کے سپرد کر دیں اور شرط کر لیں کہ ابن سمعون اُس کے ساتھ نکاح
 بڑھ جائے۔ اس صورت میں لونڈی بھی با عصمت رہے گی۔ اور ابن سمعون بھی خوش
 ہو جائے گا۔ خلیفہ بغداد نے اس رائے کو پسند کیا۔ الغرض میرے بغداد میں داخل ہونے
 ہی آستان خلافت میں چند صلاح کار لوگ جمع کیے گئے جنھوں نے میرے ساتھ اُس
 لونڈی کا عقد کر دیا۔ اور بہت سے مال و اسباب اور دولت و سامان کے ساتھ اُسے
 میرے گھر پہنچ دیا۔

یہی زمانہ ہے جس وقت سے ابن سمعون دولتمند ہو گئے۔ اُن کا عقائد
 تھا کہ یہ اُن کی والدہ محترمہ کے اُس خواب کی تعبیر ہے۔ وعظ کی صحبتوں اور پند و
 نصائح کی محفلوں میں ہمیشہ اس واقعہ کو موثر الفاظ سے بیان کر کے خدا کا شکر ادا
 کیا کرتے تھے۔ اور لوگوں کو بتایا کرتے تھے کہ خداوند تعالیٰ کیونکر اپنے بندوں کے ساتھ
 بہ لطف و محبت پیش آیا کرتا تھا۔ آخر عہد میں ابن سمعون کے زہد و تقدس نے انھیں اس
 کمال پر پہنچا دیا تھا کہ واقعی کا بیان ہے اُس عصر کے مشہور علما قاضی ابوبکر اور شیخ
 ابوبکر حاتم جو خود بھی رؤساء اسلام میں سے تھے اور ناموران بغداد میں تھے
 ابن سمعون کی خدمت میں کمال ادب حاضر ہوتے تھے اُن کے ہاتھوں کو چومنے تھے
 اور اس کو اپنی اعلیٰ سعادت خیال کرتے تھے۔ بلکہ بعض اُس زمانہ کے نامور زاهدوں
 نے اُن کے مقابل میں ایسے ایسے واقعات بیان کیے ہیں کہ صاف ظاہر ہوتا ہے
 ابن سمعون اسلامی جبلت میں اپنے تمام معصرون سے زیادہ مقبول تھے گوکہ بعض
 واقعات جو ان کے مقابل میں لوگوں نے بیان کیے ہیں اُن میں سائلہ معلوم ہوتا ہے
 لیکن اس میں شک نہیں کہ علامہ ابن سمعون جتنے بڑے داعی تھے اتنے ہی بڑے
 دینی ائمہ اور عالم بے بدل بھی تھے۔ ان کی بہت سی کرامتیں بھی عوام میں مشہور
 ہیں۔ جن کو اُن کی لاف سے آج کل کے مذاق میں بہت کم تعلق ہے۔ لہذا ہم ان
 سے درگزر کرتے ہیں۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنی زبان کو اس قدر موثر بنالیا تھا کہ بعض موقوف پر اُن کے بیان کی تاثیر خرقِ عادت کا دھوکا دے جاتی تھی۔

ابوعلیٰ ہاشمی کہتے ہیں طالع اللہ کا غصہ خاندان عباس کے سب لوگوں سے بڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے غصہ سے کوئی شخص بمشکل نجات پاسکتا تھا۔ ایک مرتبہ اُس نے مجھے حکم دیا کہ ابن سمون کو لاکے ابھی حاضر کرو۔ چہرے سے غصہ کے آثار ظاہر ہونے لگے جس سے مجھے خوف ہو گیا کہ دیکھیے ابن سمون پر کیسی گزرتی ہے میں ابن سمون کے پاس گیا اور اُنھیں اپنے ہمراہ آستانہ خلافت میں لے گیا۔ اور خلیفہ سے عرض کیا کہ ابن سمون حاضر ہیں خلیفہ نے اپنے سامنے بلایا۔ ابن سمون جاتے ہی آداب شاہی بجالائے۔ اور بند و نصائح کا سلسلہ شروع کر دیا۔ زبان کھولتے ہی انھوں نے کہا: "لَوْ لِي عَيْنٌ أَمِيرُ الْمُؤْمِنِينَ عَلِيٌّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ" یعنی حضرت علیؑ سے روایت ہے۔ ایک روایت تمام ہوئی تو دوسری روایت بھی حضرت علیؑ ہی کی سند سے شروع کی۔ آخر تک جتنی روایتیں بیان کیں سب کی سند حضرت علیؑ ہی تک پہنچتی تھی۔ اور اُن کے مضامین سے دل پر ایسی رقت طاری ہوتی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ طالع کا دل موم ہو گیا اور اُس نے رونا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہاں جو خلیفہ کے ہاتھ میں تھا بالکل تر ہو گیا۔ اس کے بعد ابن سمون نے زبان روکی اور خاموش ہو گئے۔ اور ایک مشک کا ڈبہ مجھے دیا اور اشارہ کیا کہ خلیفہ کی خدمت میں بطور نذر پیش کرو۔ میں نے اس ہدیہ کو خلیفہ کے سامنے رکھ دیا۔ اب ابن سمون سلام کر کے جانے لگے۔ میں محل خلافت کے دروازے تک اُنھیں پہنچانے گیا اور نہایت حسن عقیدت سے دروازے پر میں اُن کو رخصت کر کے خلیفہ کے حضور میں واپس آیا۔ اب تنہائی میں میں نے خلیفہ سے دریافت کیا کہ "امیر المؤمنین ابن سمون کے آنے سے پہلے حضور کے چشم و ابرو سے آثار غیظ و غضب نمایاں تھے لیکن اُن کے آنے ہی وہ سب بائیں جاتی رہیں اور حضور نہایت مہربانی و رحم دلی سے پیش آئے" خلیفہ نے جواب میں فرمایا کہ: "نالائی اور جھل خورون لے مجھ سے کہا تھا کہ ابن سمون خباب علیؑ رضی کی شان میں بے ادبی کے کلمات کہا کرتا ہے اسی وجہ سے غضبناک ہوئے میں نے اُسے بلا بھیجا تھا۔ مگر اُس وقت جو وہ آیا تو اُس نے ابتداء سے

آخر تک جتنی روایتیں بیان کیں سب جناب علی مرتضیٰ سے اور ہر موقع پر ان کا نام اس تعظیم سے لیا کہ مجھے معلوم ہو گیا کہ لوگوں نے جو کچھ کہا جھوٹ تھا اور حسد پر مبنی تھا۔ اور ابن سمون کے عقائد میں کسی قسم کا فرق نہیں ہے۔

۳۶۷ھ میں عضدالدولہ دہلی نے ایک لشکر جمراہ ہراہ لے کے ارادہ کیا کہ ملک عراق پر قبضہ کرے۔ اور بغداد کی جانب روانہ ہوا۔ عزالدولہ اختیار ابن سعد الدولہ کو جب یہ خبر ہو چکی تو اس کو اپنی نجات اسی میں نظر آئی کہ بغداد کو چھوڑ کے موصل کی راہ لی۔ عضدالدولہ نے جب بغداد میں داخل ہو کے سنا کہ عزالدولہ نے کھانہ کے موصل میں پناہ لی ہے تو اس طرف کا قصد کیا۔ اور فوراً چل کھڑا ہوا۔ بختیار نے موصل میں اپنی فوجیں بھی آراستہ کیں۔ اور مقابلہ کو میدان میں آیا۔ حوالی موصل میں دونوں فوجوں کا سامنا ہوا۔ بختیار نے اگرچہ بڑی کوششیں کیں مگر اس کو کیا کرتا کہ تقدیر بد سرخلافت تھی۔ جس نے پہلے ہی سے دل کو بے دانا بنا دیا تھا۔ لڑائی میں انجام کار عضدالدولہ کے بڑھے ہوئے حوصلہ کام آئے اور عزالدولہ بختیار اُسکے ہاتھ میں گرفتار ہو کے جان سے مارا گیا۔ عضدالدولہ نے اس کامیابی کے بعد تمام ملک عراق پر قبضہ کر لیا۔ بغداد پہنچا تو خلیفہ بغداد نے اُس کی نہایت تعظیم و تکریم کی۔ جرأت و طوق اُس کی گردن میں ڈالا۔ اور سونے کے کڑے ہاتھوں میں بچھا دیے جو شاہی عزت افزائی کا طریقہ تھا۔ اور اس کو وہ نشانِ مرحمت ہوا جو سوادلی عہدوں کے اور کسی کو مل ہی نہیں سکتا تھا۔ بختیار جب عزالدولہ شان و شوکت کے ساتھ تختِ عراق پر جلوہ افروز ہوا اُس وقت حکم دیا کہ بغداد کے تمام گلی کو چون میں ڈھنڈو بچھا دیا جائے کہ آئندہ سے کوئی داعیِ صحابہ اور یارِ اہل رسول خدا کے فضائل علی الاعلان نہ بیان کیا کرے۔ جو کوئی بغرض حصولِ ثواب بیان کیا کرتا ہو اُسکو ثواب حاصل کرنے کے اور طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ اور اس بے ریا عبادت کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلعم کی رضا مندی حاصل کرے۔ تعریفِ صحابہ سے تعصب بڑھتا ہو اور آتشِ فساد بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور جو کوئی اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا بیشک وہ قتل کر ڈالا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عضدالدولہ کی تعہذی سے پہلے

ملک عراق میں مابین شیعوں اور سنیتوں کے صرف مذہبی بنا پر جھگڑا پیدا ہو گیا تھا۔ اور اس نے جان تک طول کھینچا تھا کہ دونوں طرف کے صدمہ آدمی جان سے مار گئے۔ جو بغداد کے میسون گاؤں میں آگ لگا دی گئی۔ اور رعایا کا اس قدر مال و اسباب لٹ گیا کہ بیان سے باہر ہے۔ عضدالدولہ نے اس جھگڑے کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ساری خونریزی اور بربادی صرف داعظون کی وجہ سے ہوئی جو مسجدوں کے ممبروں پر بیٹھ بیٹھ کے لوگوں میں اشتعال طبع اور جوش و خروش پیدا کر رہے تھے۔ اور نیز ان داستان گویوں کی وجہ سے جو سرکاروں پر اور گلی کو چون میں مذہبی فساد کو تیز کرتے تھے۔ (اس دور میں اور قدیم عرب سے داستان گوئی کا زیادہ رواج تھا۔ اور داستان گو اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے جس مسئلہ کو چاہتے تھے نہایت جوش کے ساتھ ملک میں پھیلا دیا کر دیا کرتے تھے۔ ہمارے داستان کہنے والوں کی طرح ان کی غرض صرف ایقونوں کا خوش کرنا نہیں ہوتی تھی، ان قصہ خوافوں اور اس عہد کے داعظون ہی کی یہ کاروائی تھی کہ صحابہ کرام کے مناقب اور فضائل بیان کر کے انھوں نے تمام عراق میں ایسی برہمی پیدا کر دی کہ ملک میں امن و امان قائم رکھنا سلطنت کے اختیار سے باہر ہو گیا۔ عضدالدولہ نے اسی وجہ سے ممانعت کر دی کہ ایسے خلاف قانون مجمع آئندہ مسجدوں اور نیز سرکاروں اور گلی کو چون میں نہ ہونے پائیں۔ اتفاقاً ابن سمون نے اس سرکاری حکم کی مخالفت کر کے جامع بغداد میں نہایت آزادی سے وعظ کی۔ اور وعظ میں بہت کچھ فضائل صحابہ کرام بھی بیان کیے۔ یہ خبر عضدالدولہ کو ہوئی تو نہایت برہم ہوا۔ اور اپنے مقربان دولت میں سے ابوالنشا کو حکم دیا کہ ابن سمون کو لاکے حاضر کرے خود ابوالنشا کا بیان ہر کہ عضدالدولہ کے حکم کے بموجب میں نے علامہ ابن سمون کو آدمی بھیج کے اپنے مکان میں بلایا۔ وہ آئے تو مجھے ان کی صورت پر کچھ ایسا جلال اور ایسی ہیبت نظر آئی کہ بے اختیار میں ان کی تعظیم و تکریم کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو اپنے بل پر بلا کے بٹھایا۔ رسم مزاج پرسی کے بعد میں نے کہا: جناب والا بادشاہ عضدالدولہ کو لوگوں نے آپ کی شکایتیں کر کے نہایت برہم کر دیا ہے اور

آپ کو معلوم ہے کہ وہ کیسا سخت گیر اور کتنا بڑا سخت دل بادشاہ ہوا۔ آپ اس کے دربار
 میں تشریف لے جائیں تو پہلے جاتے ہی نہایت عاجزی اور ادب سے آستان بوسی
 فرمائیے اور شاہی عظیم و مکرم من کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے گا۔ اور پورے حضور دل
 سے خدا کی طرف متوجہ ہو کر نجات اور عفو کی دعا مانگیے گا۔ شاید خداوند تعالیٰ جل شانہ
 آپ کو ایسے شیر غضب آلود کے پیچھے سے نجات دلا دے۔ یہ سن کے ابن سمعون نے کہا
 ”الْحَقُّ أَكْبَرُ كُلِّ شَيْءٍ“ یعنی سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ یہ سمجھا بھلا کے ابن
 ابن سمعون کو اپنے ہمراہ لیا اور دربار کو روانہ ہوا۔ در دولت پر پہنچ کے میں نے
 اُن سے کہا آپ دم بھر بیان ظہریے میں آپ کی اطلاع کر کے حاضری کی اجازت لے
 آؤں۔ لیکن اُن دیکھے میں نے جو کچھ کہا ہے اُس کا خیال مزور رکھیے گا۔ اس سے
 میری غرض یہ تھی کہ اتنیے فاضل گران پایہ اور عالم بے بدل کو عضد الدولہ کے ماتم سے
 کوئی حد نہ ہو تو رخ جائے۔ غرض تمام باتیں علامہ مددوح کے ذہن نشین کر کے
 میں جیسا ہوا انداز گیا۔ وہ اُن کیا دیکھتا ہوں کہ ابن سمعون میرے برابر کھڑے ہوئے ہیں
 اور جو کچھ میں نے کہا سنا تھا گویا اُن سب باتوں کو اُنھوں نے یا تو غو خیال کیا یا بھول
 گئے۔ کیونکہ نہ تو آستان بوسی کی نہ کوئی شاہی عظیم و مکرم بجالائے۔ بلکہ بخیار جس کو
 عضد الدولہ نے قتل کر کے حکومت عراق حاصل کی تھی اس کے مکان کی طرف اشارہ کر کے
 یہ آیت پڑھی کہ ”وَكُنَّا لَا أَخْذُ وَلَا إِذَا أَخْذُ الْقَرْمِي وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذًا
 أَلِيمًا مُشْدِيدًا“ یعنی وہ گاؤں جن میں ظلم ہوا تھا جب اُن کو خدا کا غضب لے لیتا ہے
 تو ایسا ہی کرتا ہے خدا کا مواخذہ کرنا دردناک اور سخت ہے۔ اس کے بعد عضد الدولہ
 کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ مُخْلِئِينَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ
 كَيْفَ تَعْمَلُونَ“ اس کے بعد ہم نے اُن کی جگہ تم کو وارث تاج و تخت کیا۔ کہہ دیکھیں
 تم کیا کارروائی کرتے ہو۔ اس کے بعد ابن سمعون نے جو بند و نضاح کا دروازہ کھولا
 اور اپنی زبان بھر بیان کے جوہر دکھانا شروع کیے تو یہ عالم تھا کہ کل اہل دربار اور
 خود عضد الدولہ پر ایک ہوشی اور انداز خود رفتگی کا عالم طاری ہو گیا۔ میں نے عضد الدولہ
 کو کبھی رحم سے کام لیتے نہیں دیکھا تھا اور گو باریقت قلب کہیں چھوٹی نہیں گئی تھی
 لیکن ابن سمعون کے بیان نے یہ اثر کیا کہ اس نے روال اپنی اُنھوں پر رکھ لیا۔ اور

نہ اردو قطار رو نے لگا۔ ابن سمون دیر بہکنا سب کو اسی عالم میں رکھ کے ایک ایک ہم لوگوں کے درمیان سے غائب ہو گئے۔ وہ سارے دربار کو بخود ہی کی حالت میں چھوڑ کے بغیر اجازت لیے نکلے چلے گئے اور ہم کو خبر بھی نہ ہوئی۔ بیان سے جا کے وہ میرے مکان میں بیٹھ رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب عبداللہ ولد اپنے ہوش میں آیا تو اُس نے میری طرف متوجہ ہو کے حکم دیا کہ جاؤ خزانے سے تین ہزار درہم اور دس جوڑ خلعت گران ہالو۔ اور ابن سمون کو میری طرف سے دو۔ اگر وہ لے لیں تو فوراً قتل کروالنا اور اگر انکار کریں تو کہنا اچھا لیجئے ان کو اپنے اہباب اور غرباے اسلام پر تقسیم کر دیجیے۔ ابوالنثار کہتے ہیں کہ اس حکم نے مجھے نہایت ہی تشویش میں ڈال دیا۔ اس لیے کہ مجھے خون معلوم ہوا کہ ابن ایسا نہ ہوا ابن سمون ان چیزوں کو اپنے نام سے قبول کر لیں اور مجھے ایسے علامہ عصر کے قتل کا مرتکب ہونا پڑے۔ الغرض میں درہم اور خلعت اسے گران ہالے کے گیا۔ اور کہنے لگا۔ لیجئے بادشاہ عبداللہ نے سب سامان بطور نذر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے یا انھوں نے جواب دیا۔ ابوالنثار بھلا تم ہی انصاف کرو میں ان چیزوں کو لے کے کیا کروں گا۔ یہ کپڑے جو میں پہنے ہوئے ہوں ان کو چالیس برس ہوئے والد مرحوم و مغفور نے میرے لیے قطع کرایا تھا۔ میں جب کہیں آتا جا تا ہوں تو ان کو پہن لیتا ہوں۔ اور گھر جاتے ہی نہایت احتیاط سے انھیں تھکے رکھ دیتا ہوں۔ میری عمر بڑھنے کے لیے یہی جوڑا کافی ہے۔ اور زیادہ ساز و سامان دنیاوی کی مجھے حاجت نہیں باقی رہے درہم یہ بھی پرے لیے قبول ہیں۔ وہ گھر جو مجھے والد سرور کے ورثہ میں ملا ہے اس کا کرایہ اس قدر کافی ہو۔ ماہر کہ میں اطمینان سے اپنے حوائج ضروری کو پورا کر لیتا ہوں۔ مجھے شاہی انعام کی کوئی حاجت نہیں یہ سن کے میں نے کہا اچھا تو اگر آپ کو اپنے لیے ضرورت نہیں تو آپ کے اہباب میں جن لوگوں کو ضرورت ہو ان پر تقسیم فرمادیجئے۔ خود بادشاہ نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ اگر وہ نہ لیں تو یہی دے کے کہہ دینا کہ اپنے اہباب پر تقسیم کر دیجیے یا انھوں نے فرمایا اے ابوالنثار میرے دوستوں کو بھی ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ دربار داران دولت

میرے اجاب کی بہ نسبت اس ساز و سامان کے زیادہ محتاج ہیں۔ ابن سمون کی یہ تقریر سن کے من نہایت ہی خوش ہوا۔ اور عضد الدولہ کی خدمت میں جانے کے ساری دہان بیان کر دی۔ اس کو بھی سن کے بڑی خوشی ہوئی۔ اور شکر کے طور پر کہنے لگا: **اللّٰهُ الَّذِیْ مَسَّلَهُ مُنَادٍ مَّسَلْنَا مِنْهُ**۔ یعنی اس خدا کا شکر جس نے اُن کو مجھ سے اور مجھ کو اُن سے محفوظ رکھا۔

عضد الدولہ نے اپنے نزدیک نہایت عمدگی۔ سے ابن سمون کا امتحان لیا۔ لیکن بسا اوقات اس میں ظلم بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر روپیہ لے لینا ایک مسئلہ ہے جس میں باعتبار اجتہاد علما میں اختلاف ہے اور جہاں تک خیال کیا جاتا ہے دونوں مابین حق پر نظر آتی ہیں۔ ایک تو ابوذر غفاری صحابی رسول اللہ کی پالیسی ہے کہ انسان کو اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ لے لینا حرام ہے۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک تمام مال دنیاوی خدا کا مالک ہے اور اس میں سے بقدر ضرورت لے لینا انسان کا حق ہے اور زیادہ لینا ایسی ہی جس طرح کوئی کسی کا مال غصب کرے۔ جس طرح وہ غاصب غصب کا جواب دہ خدا اور شرع کے آگے ہے۔ اُسی طرح انسان کسی شخص کے ہدیہ اور عطا پر بھی اپنی ضرورت سے زیادہ لے لینے کی صورت میں خدا اور شرع کا جواب دہ ہے۔ اس واسطے پر عمل کرنا دشوار ہے۔ اور اسی وجہ سے اس مذہب کے علما دنیا میں بہت کم نظر آئیں گے۔ مان دو برس مذہب لے زیادہ ہیں جن کا اعتقاد ہے کہ مال چاہے کتنا ہی زیادہ ہو اُس کا لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ طریقہ اخذ شرعاً جائز ہو۔ اس اعتقاد کے لوگوں کو کوئی لازم نہیں ٹھہر سکتا۔ اور اگر کوئی ایسا قصد کرے تو اس کو شریعت ہرگز الزام نہیں دے سکتی۔ وہ باوجود دولت مندی کے شریعت کا پورا پابند اور پیرو رہتا ہے۔

اگر علامہ ابن سمون خدا نخواستہ دوسری راے کے شخص ہوتے اور اُن کے اعتقاد میں وہ روپیہ لے لینا جائز ہوتا تو اُس میں کوئی شک نہیں کہ وہ حق پر ہوتے اور حق ہی پر ان کی گردن ماری جاتی۔ اور عضد الدولہ خدا کے دیباچہ میں ایک پاک نفس اور فرشتہ خصلت علامہ زمان کے قتل کرنے کا مجرم قرار پاتا۔ افسوس شاہان سلف کے خود اختیارانہ احکام نے بار بار ایسے ظلم کیے۔ اور یہ مظالم ایسے تھے کہ اُن سے دنیا کو بہت بڑے صدمہ پہنچ گئے۔

ابن سمون کے کلام کا اثر دنیا میں مشہور تھا۔ جو واقعات ہم بیان کر چکے ہیں اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام اور اپنی زبان میں خواہ اپنی قوت اکتسابی سے یا اپنے زہد و اتقا کی وجہ سے ایسا اثر پیدا کر لیا تھا کہ دشمنوں اور شگدون کے سامنے بھی جب اُنھوں نے ہندو نصائح کا دروازہ کھولا۔ وہ خیال عداوت و ظلم اُن کے دل سے فوراً جاتا رہا اور عداوت کی جگہ اعلیٰ ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے ایسے شخص کے چند کلمات بھی نقل کر دیے جائیں تو زیادہ سنا سب ہو گا۔ تاکہ لوگوں کو اس امر کے خیال کرنے کا موقع ملے کہ ابن سمون کی زبان میں کیا بات بھی جو ایسے ایسے واقعات عجیب اور آثار غریب ظاہر ہوئے۔ ہندو نصیحت میں اکثر فرما کرتے تھے: "بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ" یا الشَّيْءُ وَاسْتَمِعْ بِالْعَظِيمِ" پاک ہر وہ خداوند کرم جل شانہ جس نے گوشت کے ذریعہ سے بائین گرائیں اور حیرلی کے ذریعہ سے قوت بنائی عطا کی اور بڑی کے واسطے سے سننے کی قوت مرحمت فرمائی۔ جناب امیر المومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کلام ہدایت نظام میں بھی یہی کلمات موجود ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معجزہ خیال کو اُن بزرگ نے حضرت علی ہی سے لے لیا۔ آخر زمانے اپنے معمول کے موافق چاہا کہ اُس دور کا درق الٹ دے جس میں ابن سمون کا ایسا نامور و عظیم وجود تھا۔ ابن سمون کے مرنے کا غم شاید دنیا کو مدتوں رہا ہو گا۔ اس لیے کہ وہ اُن علمائین تھے جو گھر میں بیٹھ کے صرف اتقا کے ذریعہ سے خلق اللہ کو نیک راہ بتاتے تھے۔ وہ ایک ایسے باکمال شخص تھے کہ اُن کی آنکش بانی نے ہر دل میں ایک آگ لگا دی تھی۔ ساری دنیا سے اسلام اُن کی معتقد تھی وہ روزانہ ملک کے عام سٹیج پر نظر آیا کرتے تھے اور اُن کے جوہر علم کے کمالات عام لوگوں پر ہمیشہ ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ آہ کیا ہوا ہو گا جب ایک بیک ہندو نصائح کا دروازہ بند ہو گیا ہو گا۔ اور وہ مہر جو اُن کا معمولی جلوہ گاہ تھا خالی نظر آیا ہو گا۔

لیکن زمانے کو ان خیالات سے کیا تعلق چاہے کچھ ہو جائے مگر وہ وہی کر رہا ہے جو ہمیشہ سے کرتا آیا ہے ہمیشہ میں ذیقعد کا نصف ہی ہمیشہ

گزرنے پایا تھا کہ ابن سمون نے انتقال کیا۔ یہ سانحہ خاص شہر بغداد میں واقع ہوا جامع منصور میں اُن کے جنازے پر نماز پڑھی گئی۔ اور خوشی مکان میں دفن کر دی گئی جس میں وہ سکونت پذیر تھے۔ لیکن خدا جانے کس ضرورت سے اس کے چالیس برس بعد پختہ شدہ ۱۱۔ رجب ۲۶۱ھ میں لوگوں نے ان کی لاش کو دیوان سے کھود کے نکال لیا اور باب الحرب میں امام احمد بن حنبل کے مقبرہ کے نزدیک لچا کے دفن کر دیا۔ یہ امر بہت زور دے دے کے اُن کے فضائل میں بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس برس کے بعد جب اُن کی لاش کھود کے نکالی گئی تو اُس میں کسی ختم کا تغیر نہیں ہوا تھا۔ جسم درکنار کفن کا کپڑا تک ویسا ہی تھرا اور صاف تھا۔ سر اُٹا اور گھٹنا کیسا۔ بہر حال چالیس برس کے بعد اُن کی قبر بدل دی گئی۔ اور اس دنیائے اُنھیں انتظار قیامت میں بھی ایک حالت پر نہ بڑھنے دیا۔

ان کی تصانیف میں سے صرف کتاب مجالس کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ سے اُنھوں نے اپنی اصلی شان یعنی وعظ و نصائح کی کیفیت دکھائی ہے۔ لیکن افسوس یہ خیال اکثر اہل علم میں مشہور ہے کہ وعظ و نصیحت کو نوالے روایت کو بیان کر دیتے ہیں لیکن اُن کو اس کے عیوب اور صحت و اچلت سے کوئی بحث نہیں رہتی۔ بس اسی غفلت نے شاید اُن کی کتاب مجالس میں بھی نقصان پیدا کر دیے۔ اس لیے کہ کہا جاتا ہے اُس میں کوئی حدیث اور کوئی روایت صحیح نہیں ہے افسوس کہ داعظوں کی یہ شان آج تک باقی ہے۔ اور گویا وہ اس امر کے مخفی ہی نہیں ہیں کہ روایات کی جا بجا پر مال کر رہے۔

وعظ سننے والوں کو اُس وقت نہیں معلوم ہوتا کہ ان ضعیف یا موضوع روایات کے بیان کرنے سے کیا نقصان ہوا۔ لیکن چند روز بعد وہ روایات عام ہلک میں ایک مضبوط قدم پکڑ لیتی ہیں۔ اور پھر اُن سے غلی تاریخ پیدا ہونے لگتے ہیں اور دینی اعمال ایسے ہیں جن کا نام عرف میں بدعت رکھا گیا ہے۔ شاید لفظ بدعت سے بہت لوگ چونک پڑیں گے۔ اور اُنھیں خوف ہو جائے گا کہ کہیں وہ باطنی بدعتی فی بحث تو نہیں چھیڑ دی گئی۔ نہیں وہ بحث نہیں چھیڑی گئی۔ ہمیں اس مقام پر کوئی خاص مذہبی بارش لینا نہیں منظور ہے۔ لیکن دنیاوی حیثیت سے اور نیز اخلاقی معاملات

میں دیکھیے تو وہ مان بھی ایسی ہی خرابیاں مجھ واس وجہ سے پیدا ہو گئیں کہ سرگردان ملک اور ریفاہ مردوں نے بے احتیاطی سے اور بے سوچے سمجھے گزشتہ نامور دن کے واقعات بیان کر دیے۔ آپ غور کر کے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہو کہ عام دنیا کیا بہ لحاظ اخلاق اور کیا بہ لحاظ مذاہب اسی قسم کی ضعیف الاعتقاد یوں ہیں مبتلا ہے۔ ہم کو کسی قدر آزادی سے کام لے کے صاف صاف بیان کر دینا چاہیے کہ باوجود سخت احتیاطوں اور بکثرت قیود کے ایسے ہی ضعیف رویوں کی وجہ سے نہ کوئی مذہب اپنی اصلی حالت پر باقی رہا جس پر بانی مذہب نے اس کی بنا ڈالی تھی۔ اور نہ کوئی اخلاقی اصول قائم رہ سکا جو بلحاظ مناسبت زمانہ کے مخدوش نہ نظر آتا ہو۔

لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جنھوں نے ابتداً عمر پر بیٹھ کے ایسی روایتیں بیان کیں۔ ان کی غرض اس بیان سے کسی قسم کی بدیہی تھی۔ وہ صرف اس قدر چاہتے تھے کہ لوگوں کے دل میں دینی ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے جس قدر زیادہ موثر اور نئی روایت لے اسی قدر بہتر اور مناسب ہو گا۔ انھیں یہ خبر نہ تھی کہ نتائج میں ایسے امور ظاہر ہوں گے۔ اگرچہ سلف سے لے کے آج تک طبقہ محدثین کے تمام لوگوں نے پوری احتیاط سے کام لیا۔ لیکن ان کی کوششیں محدود رہیں۔

اسرار و بار حرام پور

(حصہ سوم)

مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شریعہ مرحوم نے اس سلسلہ کا تیسرا حصہ بھی لکھا تھا مگر بعض وجوہ سے وہ اس وقت نہ شائع ہو سکا۔ با زیر طبع ہے۔ اس کی قیمت بیچلہ ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے جو صحاب اسے جلد سے جلد دیکھنا چاہیں ہمیں پہلے سے مطلع کر دین تاکہ کتاب تیار ہونے پر ان کی خدمت میں ذریعہ دی جاتی روانہ کر دی جائے۔

متمم - منظر دگلدان
لکھنؤ



فتح مصر اسکندریہ

مسلمانوں کی فتح مصر کے متعلق ایک نہایت دلچسپ واقعہ تاریخوں میں ملتا ہے جو ہر یہ ناظرین ہے اور اسی سلسلہ میں ہم مصر اور اسکندریہ کے پوری طرح قبضے میں آ جانے کے واقعات تفصیل کے ساتھ لکھتے ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب حسن المجاہدۃ فی اختیار

مصر والقہرہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ سلسلہ ہجری میں حضرت عمر فاروق

جانبہ میں رونق افروز تھے۔ اسی زمانے میں حضرت عمرو بن عاص ان کی

خدمت میں حاضر ہوئے موقع پا کر تنہائی میں آپ کو مصر کی فتح کا شوق

دلایا اور عرض کیا کہ آپ مجھے مصر کی جانب پیش قدمی کی اجازت دیں۔

اگر وہ ملک فتح ہو گیا جس کا مجھے کامل یقین ہے تو مسلمانوں کو اس سے بڑی مدد

ملے گی اور ان کی قوت بڑھ جائے گی مصر کا علاقہ بڑا زر خیز ہے اور مال

و دولت میں وہ ساری دنیا میں مشہور ہے اس کے ساتھ ہی وہ آج کل

لڑائی میں سب سے زیادہ کمزور ہے۔ حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا کہ ادھر فوج بھی

کرنے سے مسلمانوں کو کمین نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ اس پر برابر

اصرار کرتے اور طرح طرح سے شوق دلاتے رہے۔ آخر حضرت عمرؓ کو اطمینان

ہو گیا اور انھوں نے روانگی کی اجازت دیدی۔

حضرت عمروؓ نے جو خاص طور پر اصرار کیا اور انھیں اپنے ہاتھوں مصر

کے فتح ہونے کی جو اس قدر قوی امید تھی اس کا ایک خاص سبب تھا۔ وہ

واقعہ اس طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرو بن عاص قریش کے بعض لوگوں کے ساتھ تجارت کی غرض سے بیت المقدس کی جانب گئے اتفاق سے انھیں دنوں اسکندریہ کا ایک رومی راہب زیارت کی غرض سے وہاں آیا ہوا تھا۔ اور بیت المقدس کے گرد پہاڑوں میں پھرا ہوا تھا۔ وہیں حضرت عمرو اپنے اور اپنے ساتھیوں کے اونٹ چرا رہے تھے ان کا اور ان کے رفقاء قریش کا معمول تھا کہ باری باری سے اپنے اونٹ چرایا کرتے تھے آج حضرت عمرو بن عاص کی باری تھی۔ وہ راہب پہاڑوں میں حضرت عمرو کو ملا اور ان سے پانی مانگنے لگا کیونکہ شدت پیاس سے جان بلب ہو رہا تھا حضرت عمرو نے اپنے مشکیزے سے اسے پانی پلا یا۔

راہب دیر سے پانی کی تلاش میں پہاڑوں میں پھرتا رہا تھا اور دھوپ کی شدت سے بالکل تھکا گیا تھا۔ پانی پیتے ہی وہ ایک درخت کے سایے میں لیٹ کے سو گیا۔ جہاں وہ لیٹا تھا اس کے قریب ہی ایک سوراخ تھا۔ اُسے سوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس سوراخ میں سے ایک بڑا بھاری زہریلا سانپ نکلا اور اس راہب کی طرف چلا۔ حضرت عمرو بن عاص کی اُس پر نظر پڑ گئی اور آپ نے اپنا تیرکمان میں جوڑے کے ایسا۔ تاک کے نشانہ لگا یا کہ سانپ جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ دیر کے بعد راہب سو اٹھا تو اُس نے قریب ہی مرا ہوا سانپ دیکھا اور بہت گھبراہٹ ہو کر حضرت عمرو بن عاص سے اس کا حال پوچھا۔ آپ نے ساری سرگزشت بیان کر دی اور کہا کہ میں نے اس کو تمھاری طرف جانے ہوئے دیکھ کے تیر کا نشانہ بنا یا ہے یہ سنتے ہی راہب نے اٹھ کے حضرت عمر کی پیشانی چومی اور بولا کہ تم نے دو دفعہ میری جان بچائی ہے۔ ایک دفعہ تو اس وقت جبکہ میں پیاس سے جان بلب ہو رہا تھا اور دوبارہ اس موزی سانپ سے اب تم یہ بتاؤ کہ یہاں کیسے آئے؟ عمرو بن عاص نے بتایا کہ میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ تجارت کی غرض سے آیا ہوں۔ راہب نے پوچھا تو تھیں اس دفعہ کتنے نفع کی امید؟ حضرت عمرو نے کہا اتنے نفع کی کہ میں ایک اونٹ خرید سکوں۔ میرے پاس دو اونٹ ہیں جہاں ہوں کہ ایک اونٹ اور بڑھ جائے۔ پھر راہب نے پوچھا کہ تمھارے ملک میں انسان کی ایک جان کا بدلہ کیا ہے؟ عمرو نے کہا کہ ایک سو اونٹ۔ راہب نے کہا کہ ہمارے یہاں اونٹ نہیں ہیں گران رو پیہ ہے۔ عمرو نے کہا کہ اگر وہ پیہ ہو تو سو اونٹوں

کی قیمت ایک ہزار دینار ہوتی ہے۔ راہب نے کہا تم جانتے ہو کہ میں مسافر ہوں۔ اور بیت المقدس کے گرجے میں فقط عبادت اور زیارت کی غرض سے آیا ہوں۔ اب ان سے فارغ ہو چکا ہوں۔ یہاں میرے پاس روپیہ نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ میرے وطن چلو تو میں تمہیں دو جانوں کا معاوضہ دوں گا۔ کیونکہ تم نے دوبار میری جان بچائی ہے۔ عمرؤ نے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ راہب نے بتایا کہ ملک مصر میں اسکندریہ نام ایک شہر ہے اور وہی بلد وطن ہے۔ عمرؤ نے کہا میں نہیں جانتا کہ اسکندریہ کہاں اور کتنی دور ہے اور میں کبھی وہاں نہیں گیا ہوں۔ راہب نے کہا تم چلو تو سہی۔ وہاں پہنچ کے تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی۔ دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ ایسا بارونتی اور آباد شہر تم نے کبھی نہیں دیکھا۔ عمرؤ نے پوچھا تو تم وہاں پہنچ کے اپنا وعدہ ضرور پورا کرو گے؟ اس نے کہا میں خدا کو بیچ میں ڈال کر اور اسی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ اور تمہیں یہ حفاظت نام تمہارے ساتھیوں کے پاس واپس بھیج دوں گا۔ عمرؤ نے پوچھا اسکندریہ جانے آنے میں مجھے کتنے دن لگیں گے؟ راہب نے کہا دس دن جانے کے۔ دس دن واپسی کے اور دس دن وہاں ٹھہرنے کے اس طرح کل ایک مہینہ صرف ہو گا۔ جانے وقت میں تمہارے ساتھ ہوں اور خود تمہاری حفاظت کروں گا۔ اور واپسی میں اپنے ایک ایسے معتبر شخص کو تمہارے ساتھ کر دوں گا کہ وہ تم کو پوری حفاظت کے ساتھ جان تک کہے گا۔ پہنچے گا۔ حضرت عمرؤ نے کہا کہ ذرا ٹھہرو۔ میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر لوں تو قطعی جواب دوں۔ یہ کہہ کر حضرت عمرؤ اپنے ہمراہیوں کے پاس گئے۔ راہب کے وعدہ و بیان کا ذکر کر کے کہا جب تک میں واپس نہ آ جاؤں تم یہیں ٹھہرے ہو۔ اور تم میں سے کوئی شخص اگر میرے ساتھ چلے اور میرا بیس سفر ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں اس روپیہ میں سے جو مجھے ملے گا ایک حصہ اسے بھی دوں گا۔ ان لوگوں نے اسے منظور کیا اور ایک آدمی ان کے ساتھ کر دیا۔

حضرت عمرؤ اور ان کا رفیق سفر راہب کے ساتھ مصر کی جانب روانہ ہوئے مصر کے علاقہ میں داخل ہوئے تو عمرؤ کو وہاں کی عالیشان عمارتیں آبادی کی کثرت اور لوگوں کا تولدیکہ کو بڑا تعجب ہوا۔ اور کہنے لگے کہ بے شک میں نے مصر کا ایسا کوئی مقام نہیں دیکھا ہے اور نہ کبھی یہاں کی سی دولت اور مرفع المجانی ہی کہیں نظر آئی۔ اس کے بعد وہ اسکندریہ میں پہنچے تو وہاں کی عمارتیں اور ان کی مضبوطی اور خلقت کا ہجوم

دیکھ کر اور زیادہ متحیر ہو گئے۔ حضرت عمروؓ جس دن اسکندریہ میں پہنچے اتفاقاً وہاں ایک بہت بڑی عید تھی جس میں سب سردار، روسا اور غرقا جمع ہوا کرتے تھے۔ اور اُسی دن سونے کا ایک مرصع گیند اچھالا جاتا تھا۔ اور سب لوگ اُسے اپنی آستینوں میں لینا چاہتے تھے۔ قدیم زمانے سے یہ عقیدہ چلا آتا تھا کہ جس کسی کی آستین میں وہ گیند چلائے وہ اپنی عمر میں ایک مرتبہ مصر کا بادشاہ ضرور ہوگا۔

اسکندریہ میں پہنچ کر اہلب نے عمروؓ کی بہت خاطر مدارت کی۔ نہایت قیمتی ریشمی کپڑے پہنا کر اُن کو اپنے ساتھ اسی عید کے جلسہ میں لے گیا جہاں گیند بھینکا جا رہا تھا۔ اور لوگ اُسے آستینوں میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں گیند بھینکا گیا اور وہ سدھا عمروؓ کی آستین میں داخل ہو گیا۔ اس پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ کتنے لگے کہ اس گیند کے معاملے میں جمن کبھی دھوکا نہیں ہوا ہے۔ آج خدا جانے کیا اتفاق ہو گیا۔ بھلا یہ گنوار بدوی بھی ہمارا بادشاہ ہو سکتا ہے؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد عمروؓ کو وہ راہب اپنے دوستوں سے ملاتا رہا اور اُن سے کہتا کہ اُنھوں نے دیارِ سری جان بچائی ہے اور میں ان سے دو ہزار دینار دینے کا وعدہ کر کے یہاں ساتھ لایا ہوں۔ پھر راہب نے اپنے معتقدوں سے کہا کہ دو ہزار دینار جمع کر کے ان کو دیدینا چاہیے۔ چنانچہ اُن لوگوں نے یہ رقم عمروؓ کے حوالے کر دی۔ عمروؓ جب وہاں سے واپس چلے تو راہب نے نقطہ ان کے زادراہ اور ناشتہ ہی کا کافی بندوبست نہیں کر دیا۔ بلکہ حسب وعدہ اپنا ایک معتبر شخص ان کے ساتھ کر دیا۔ تاکہ اُنھیں ان کے ساتھیوں تک پہنچا آئے۔

غرض اس سفر میں عمروؓ بن قاض کو مصر کا راستہ اور وہاں کا صحیح حال معلوم ہو گیا تھا اور جو کچھ اُنھوں نے دیکھا اس سے ان کو یقین ہو گیا کہ مصر نہایت ہی متمول اور خوش حال ملک ہے اور اس کے ساتھ ہی لوگ بالکل عیش و عشرت میں مبتلا ہیں جب عمروؓ اپنے ساتھیوں میں پہنچے تو ایک ہزار دینار اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیے اور ایک ہزار اپنے قبضے میں رکھے۔ حضرت عمروؓ اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ سب سے پہلا مال ہے جو خود میں نے حاصل کیا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے ان کو شرفِ اسلام سے سرفراز کیا اور شام کا اکثر حصہ اُنھیں کی جد و جہد سے فتح ہو چکا تو اُنھیں

مصر اور اسکندریہ کے فتح کرنے کا شوق ہوا۔ اور یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس گنبد کے آستین میں آجانے کے نتیجے کو بھی دیکھ لیں۔ اور اس کی تصدیق ایک حد تک آنحضرت (صلعم) کے اس ارشاد مبارک سے ہو گئی تھی کہ "عنقریب میرے بعد تم مصر کو فتح کرو گے اور جب اس کا وقت آئے تو قبیلوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا کیونکہ ان سے تم سے سُسرالی قرابت ہے اور ان کے حقوق ہیں۔"

اب حضرت عمرؓ نے حضرت عمرؓ کو مصر کی فتح کا شوق دلایا اور حضرت فاروقؓ نے ان کو چار ہزار آدمیوں پر انصر مقرر کر کے روانہ کر دیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سارے تین ہزار ہی فوج تھی جس کے آپ انصر تھے اور جب آپ روانہ ہونے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس وقت تو تم بیان سے روانہ ہو جاؤ مگر میں اس بارے میں خدا سے استخارہ کرتا ہوں اور عنقریب راستے میں تم کو میرا خط ملے گا۔ اگر مصر میں پہونچنے یا سرحد مصر میں داخل ہونے سے پہلے ملے اور اس میں واپس ہونے کو لکھا ہو تو تم واپس چلے آنا۔ اور اگر میرے خط کے پہونچنے سے پہلے تم مصر کی سرحد میں داخل ہو چکے ہو تو پھر بڑھتے چلے جانا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کی دعا کرنا۔

چنانچہ حضرت عمرؓ بن عاصؓ آدھی رات کو بغیر کسی کو خبر کیے فوج لے کر روانہ ہو گئے۔ ان کی روانگی کے بعد حضرت عمرؓ نے استخارہ کیا تو انھیں مسلمانوں کے متعلق اندیشہ نظر آیا اور عمرؓ بن عاصؓ کو لکھا کہ اپنی فوج لے کر واپس چلے آؤ۔ عمرؓ بن عاصؓ کی فتح کے شوق میں جلد جلد کوچ کرتے چلے جاتے تھے کہ کہیں حضرت عمرؓ کا خط واپسی کے متعلق نہ آجائے۔ مصر کی سرحد پر شہر ترفیح میں تھے کہ حضرت عمرؓ کا قاصد انھیں آتا نظر آیا اس خیال سے کہ مبادا واپسی کا حکم ہوا انھوں نے فوراً کوچ کر دیا۔ اور مصر کے علاقہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں قاصد آپ کے پاس آیا اور اس نے حضرت عمرؓ کا خط آپ کو دیا۔ آپ نے وہ خط مسلمانوں کو سنا کہ کہا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ اب ہم مصر کے حدود میں داخل ہو چکے ہیں حضرت عمرؓ نے آپ کے سامنے یہ فرمایا تھا کہ اگر میرا خط تمھیں مصر کی سرحد میں داخل ہو جاوے تو پہلے مل جائے تو میرے حکم کی تعمیل کرنا اور اگر اس وقت ملے کہ تم مصر کی سرحد میں داخل ہو چکے ہو تو پھر بڑھتے چلے جانا۔ اب یہ خط تمھیں اس وقت ملا ہے کہ ہم سب مصر کی سرحد میں داخل ہو چکے ہیں لہذا اب ہمیں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔

یہ کہہ کے حضرت عمرو بن عاص آگے بڑھے۔ اُن دنوں مصر کا حاکم ایک قبطی سردار مقوقس تھا جب اُسے عمرو بن عاص کی پیش قدمی کا حال معلوم ہوا تو اس نے مقابلے کے لیے اپنی فوجیں روانہ کیں۔ مصر میں سب سے پہلا مقام جہاں مسلمانوں اور رومیوں میں مقابلہ ہوا فرما ہے۔ بیان تقریباً ایک مہینے تک سخت لڑائی ہوئی رہی آخر مسلمانوں کو فتح ہوئی اور رومی شکست کھا کے بھاگے۔ اسکندریہ میں قبطیوں کا ایک پادری آلبو میامین نامی تھا۔ جب اُسے لشکر اسلام کے مصر میں پہنچنے کی خبر ہوئی تو اپنے پیرو قبطیوں کو لکھا کہ اب رومیوں کی حکومت باقی رہنے کے آثار نہیں نظر آتے۔ اور اُن کی حکومت درہم و برہم ہو گئی ہے۔ لہذا تمھارے لیے مناسب یہ ہے کہ عمرو بن عاص سے مل جاؤ۔ اس پر بعض قبطی حضرت عمرو کے طوقار ہو گئے۔ بعض قبطیوں نے مسلمانوں کی ایسی جرأت دیکھ کے آپس میں کہا کہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ یہ مٹی بھر فوج اور رومیوں کے اتنے بڑے لشکر کے مقابلے کا ارادہ! ایک قبطی نے یہ سن کر جواب دیا کہ یہ لوگ جدھر رخ کرتے ہیں غالب ہی ہوتے ہیں۔

حضرت عمرو اب آگے بڑھے اور راستے کے معمولی چھوٹے چھوٹے مقابلوں کے بعد یمن میں پہنچا جہاں ایک مہینے سے زیادہ میدان جنگ و جدال گرم رہا اور آخر میں یہاں بھی مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ مسلمان یہاں سے آگے بڑھ کے مقام آم و نین میں پہنچے۔ یہ نہایت مستحکم قلعہ تھا اور کسی طرح فتح نہیں ہوتا تھا آخر عمروؓ نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں ملک کے لیے لکھا چنانچہ وہاں سے چار ہزار فوج روانہ ہوئی۔ جب یہ ملک مصر میں عمروؓ کے پاس پہنچ گئی تو اس ساری فوج کو لے کر انھوں نے مستحکم قلعہ باب الیون پر حملہ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ یہاں روزانہ صبح شام لڑائی ہوتی۔ مگر کسی طرح قلعہ فتح نہ ہوتا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمروؓ نے پھر بارگاہ خلافت میں ملک کے لیے لکھا حضرت عمرؓ نے پھر چار ہزار آدمی روانہ کیے جن میں ہر ہزار پر ایک سردار تھا اور لکھا کہ میں چار ہزار آدمی اور بھیجتا ہوں۔ مگر اس میں تیرہ سو عوام مقداد بن اسود۔ عبادہ بن صامت۔ اور سلمہ بن مخلد ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک ایک ہزار فوج پر بھاری ہے۔ اب جان لو کہ تمھارے پاس سب مل کے بارہ ہزار فوج ہوئی۔ اس پر بھی اگر تم مغلوب ہو تو قلت فوج کی وجہ سے نہ ہو گا۔

اور رومیوں نے اپنے قلعے کے گرد خندقیں کھود لی تھیں اور خندقوں میں اندر ہی اندر راستے رکھے تھے اور پھر ان سب کے آگے فولا دی تھیں گاڑ کے کہہ اس

بنالیا تھا۔ جب یہ ملک بھی پہنچ گئی تو حضرت عمرؓ بن عاصؓ باب الیون کی طرف بڑھے اور اس کے سامنے منجیقین لگا دیں۔ اس مقام کا قلعہ دار ایک لنگڑا شخص تھا۔ یہ ایک رومی سردار تھا مگر حاکم مصر مقوقس کے ماتحت تھا۔ عمرؓ بن عاصؓ خود اپنے کا صدر بن کر اس کے پاس گئے اور صورت حال پر گفتگو کی۔ پھر اُس سے کہا کہ اچھا میں جاتا ہوں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر آؤں تو قطعی جواب دوں۔ قلعہ دار نے پچھا کہ کسے دربان کو حکم دے کہ کھاتا کہ جب یہ شخص واپس جائے لگے تو ایک بڑا سا پتھر اس کے سر پر اوپر سے ڈھکیں دیتا تاکہ یہ چلی جکے رہ جائے۔ واپسی میں حضرت عمرؓ بن عاصؓ کو ایک عرب ملا۔ اور بولا کہ آپ یہاں چلے تو آئے ہیں مگر اب زندہ واپس جانے نہیں نظر آتے۔ حضرت فوراً سمجھ گئے کہ کوئی سازش کی گئی ہے لہذا وہ اسی وقت قلعہ دار کے پاس واپس گئے اور کہا کہ اب میرا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے چند اور ساتھیوں کو بھی تمہارے پاس لے آؤں تاکہ جو کچھ گفتگو مجھ سے ہوئی ہے اُن سے بھی ہو جائے۔ قلعہ دار نے یہ خیال کر کے کہ اچھا ہمارے لوگ بھی آجائیں گے ایک دشمن کے قتل کرنے سے کئی ایک دشمنوں کا قتل کرنا بہت اچھا ہے۔ لہذا اپنا آدمی بھیج کر دربان کے پاس کہلا بھیجا کہ ابھی اس شخص کو صحیح و سالم مکمل جانے دو۔ اور اس طرح حضرت عمرؓ بن عاصؓ بحیرہٴ مدینہ واپس آ گئے۔

فتحِ مدینہ دیر ہوئی تو حضرت زبیرؓ بن عوامؓ نے کہا کہ ابھی اپنی جان اللہ تعالیٰ کی نذر کرتا ہوں اور امید ہے کہ خدا اسی بہانے مسلمانوں کو فوج دے گا۔ یہ کہہ کر آپ نے قلعہ کے ایک سمت جدھر سوئی حمام تھا سیڑھی لگائی اور لوگوں سے کہا کہ جب میں اوپر پہنچ کے تکبیر کہوں تو تم سب لوگ مل کر کیا رہی نعرہٴ تکبیر بلند کر دینا۔ اس کے بعد وہ اوپر چڑھ گئے۔ اس کا حال بہت سے لوگوں کو اس وقت معلوم ہوا جب حضرت زبیرؓ اوپر پہنچ چکے تھے۔ آپ نے وہاں پہنچ کے تلوار ہلائی اور تکبیر کہی۔ اُن کا تکبیر سنتے ہی سب نے زور و شور کے ساتھ نعرہٴ اللہ اکبر بلند کیا اور بہت سے لوگ سیڑھی کے پاس جمع ہو گئے اور اوپر چڑھنے لگے۔ حضرت عمرؓ بن عاصؓ نے اس خیال سے کہ سیڑھی ٹوٹ نہ جائے لوگوں کو سیڑھی کے پاس سے ہٹالیا۔ مگر بعض لوگ اوپر چڑھ ہی گئے اور تکبیر کے نعرہ بلند کرنے لگے۔ اور ادھر باہر کے مسلمانوں میں بھی تکبیر کا غلغلہ بلند ہوا تو قلعہ والوں کو ذرا بھی شک نہ رہا کہ عرب قلعہ کے اندر گھس آئے ہیں۔ اور وہ حیران و پریشان ہو کر چاروں طرف بھاگنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت زبیرؓ قلعہ کے

اند اتر گئے قلعے کے دروازے کا رخ کیا اور دروازہ کھول لیا۔ اب کیا تھا سارا لشکر اسلام قلعے کے اندر داخل ہو گیا۔ اب مقوقس کو اپنی جان کا خطرہ ہوا۔ فوراً حضرت عمرو کی خدمت میں آیا۔ صلح کی درخواست پیش کر دی کہ ہر قبیلہ اہل عرب کو دو دینار دے گا۔ حضرت عمرو نے یہ درخواست منظور کر لی اور صلح ہو گئی۔ کل محاصرہ اور فتح میں سات ماہ کا زمانہ صرف ہوا۔

لیکن ابن عبد الحکیم اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مسلمان ایک ماہ تک بابا الیون کا محاصرہ کیے رہے۔ اور قلعے میں رومیوں کی ایک بڑی جماعت تھی اور قبطیوں کے رؤسا اور عمائد بھی بڑی تعداد میں تھے اور ان سب کا ہنس خود مقوقس تھا۔ جب اُس نے یہ دیکھا کہ مسلمان اس قلعے کے فتح کرنے پر بڑی طرح اڑے ہوئے ہیں تو جو فوج مسلمانوں سے لڑ رہی تھی اس کو ان کے مقابلہ پر چھوڑا اور قبطیوں کے بڑے بڑے لوگوں کو ساتھ لے کر قلعے کے سامنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اور دریا کے پار جا کر اس خیال سے کہ کہیں مسلمان بھی پل کے ذریعہ سے نہ آجائیں پل توڑوا دیا۔ اس کے بعد لنگڑا قلعہ دار باقی رہ گیا تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ مقوقس چل دیا اور قلعہ عنقریب ہاتھ سے جانیوالا ہے تو جو رؤسا اور عمائد شہر میں باقی رہ گئے تھے ان کو بھی لے کر کشتیوں میں سوار ہوا جو پہلے سے قلعے کی دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔ اور خود بھی اُس پار مقوقس کے پاس چلا گیا۔

اس کے بعد مقوقس نے حضرت عمرو بن عاص کے پاس پیام بھیجا کہ تم تھوڑے سے لوگ ہمارے شہر دن میں گھس آئے ہو اور ہم سے لڑنا چاہتے ہو اور ایک مدت دراز سے ہمارے ملک میں پڑے ہوئے ہو۔ مگر تم سبھی بھر آدمی ہو۔ اب رومی لشکر آہو چاہے جو تعداد اور اسلحہ میں تم سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ علاوہ برین تم دریائے نیل میں گھرے ہوئے ہو اور اصل یہ جو کہ تم ہمارے ہاتھ میں قید ہو۔ اب تمھارے لیے مناسب یہ ہے کہ اپنے کچھ آدمی ہمارے پاس بھیجو تاکہ ہم میں اور تم میں تبادلہ خیالات ہواور کوئی ایسی صورت نکل آئے جس کو ہم بھی منظور کر سکیں اور تم کو بھی پسند ہو۔ اور اس رومی لشکر کے پھونچنے سے

پہلے ہی تمھارے لشکر میں خونریزی موقوف ہو جائے۔ کیونکہ اس رومی لشکر کی کیا
ہونچنے کے بعد پھر کوئی گفتگو فائدہ بخش نہ ہو سکے گی اور اس وقت اپنے مقصد
میں کامیاب نہ ہونے سے شاید تم کو ندامت ہو۔ لہذا مناسب یہی ہے کہ کچھ لوگ بھیج دو
جن سے اس معاملے میں گفتگو کی جاسکے۔

حضرت عمرؓ کے پاس جب متوقس کے سفیر یہ خط لے کر آئے تو آپ نے اُن کو دو دن
کے لیے اپنے پڑاؤ میں روک لیا۔ اور متوقس کو یہ خیال ہوا کہ شاید قاصد قتل کر ڈالے
گئے۔ وہ اپنے لوگوں سے کہنے لگا دیکھتے ہو! یہ لوگ سفیر دن کو بھی قتل کر ڈالنے یا
قید کر لیتے ہیں۔ شاید ان کے ملک اور مذہب میں یہ جائز ہے۔ حضرت عمرؓ نے عاص
نے اُن قاصد دن کو فقط اس لیے روک لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اور ان کی حالت
کو اچھی طرح دیکھ لیں۔ دو روز کے بعد آپ نے اُن سفیر دن کو واپس کیا اور خط کے
جواب میں لکھا کہ ہمارے تمھارے درمیان صرف تین صورتیں ہیں یا تو تم مسلمان
ہو جاؤ۔ اُس وقت تم ہمارے بھائی ہو جاؤ گے اور جو کچھ ہمارے حقوق ہیں وہی
تمھارے لیے ہو جائیں گے۔ اگر تم کو اس سے انکار ہے تو جزیہ دو اور اس ذلت
کی صورت کو قبول کرو۔ اور یہ بھی نہیں تو صبر و تحمل کے ساتھ ہم پر جہاد کریں گے یہاں
تک کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی کے مطابق ہمارا اور تمھارا فیصلہ کر دے۔

یہ قاصد جب متوقس کے پاس پہنچے تو اُس نے اُن سے پوچھا کہ تم نے
مسلمانوں کو کیسا پایا۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جس کو زندگی سے
موت زیادہ پیار ہی ہے۔ اور تواضع شان و شوکت سے زیادہ عجز ہے۔ ان کو
دنیا کی طرف ذرہ برابر بھی رغبت نہیں۔ یہ لوگ خاک پر بیٹھتے اور سوار یوں کی پیٹھ
پر بیٹھے بیٹھے کھانا کھاتے ہیں۔ ان کے سردار میں کوئی خاص امتیاز نہیں۔ اُن کا
امیر اُن ہی کا سا ایک شخص ہے۔ ان کے ہاں اس کا مطلق تہ نہیں چل سکتا کہ کون
بڑا ہو کون چھوٹا۔ کون آقا ہے اور کون غلام۔ ناز کا دھت آیا تو کوئی شخص لیا
نہیں ہوتا جو ہاتھ پاؤں دھو کر تیار نہ ہو جاتا ہو۔

یہ سن کے متوقس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا کہ ایسے
لوگ اگر ہمارے گمراہین گئے تو اس کو بھی جگہ سے ہٹا دیں گے۔ ان کا کوئی مقابلہ

نہیں کر سکتا۔ اگر تم لوگوں نے اس وقت جبکہ وہ نیل میں محصور ہیں ان کے شرائط صلح کو غنیمت نہ سمجھا تو جب ان کو راستہ مل جائے گا تو پھر یہ لوگ ہماری کسی درخواست کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ اس کے بعد مقوقس نے اپنے چند آدمی حضرت عمرو بن عاص کے پاس بھیجے اور پیام دیا کہ اپنے چند آدمی بھیج دیجئے تاکہ شرائط صلح طے ہوں۔

حضرت عمرو بن عاص نے اپنے بیان سے دس آدمی بھیجے جن میں حضرت عبادہ بن صامت بھی تھے حضرت عبادہ کا قد دس بالشت کا تھا۔ وہ مشہور بہادر و دلور اور خوش بیان مقرر و نین تھے۔ حضرت عمرو بن عاص نے فرما دیا تھا کہ آپ ہی وہاں گفتگو کریں۔ اور ان تین شرطوں کے علاوہ کچھ نہ منظور کریں کیونکہ حضرت عمرؓ نے مجھے ان تین شرائط کے علاوہ اور کسی شرط کے منظور کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

حضرت عبادہ بہت سیاہ فام بھی تھے۔ غرض یہ لوگ جب مقوقس کے پاس پہنچے تو حضرت عبادہ آگے بڑھے۔ مقوقس ان کی کالی رنگت دیکھ کے ڈر گیا۔ اور کہنے لگا کہ اس کالے آدمی کو میرے سامنے سے ہٹاؤ۔ کوئی اور شخص مجھ سے گفتگو کرے۔ اُن کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ کالآ آدمی علم اور عقل میں ہم سب سے بڑھا ہوا ہے۔ یہی ہمارا سردار ہے۔ ہم سب سے افضل ہے اور ہمارا افسر ہے۔ ہم سب اسی کی راے پر چلتے ہیں۔ اور ہمارے امیر نے اپنے احکام بھی اسی کو دیے ہیں۔ تب مقوقس نے عبادہ سے کہا خیر تم ہی آگے بڑھو۔ لیکن مجھ سے نرمی اور سہولت سے باتیں کرنا کیونکہ میں تمہاری کالی رنگت سے ڈرتا ہوں۔ تم نے باتوں میں بھی سختی اور درشتی سے کام لیا تو میں اور زیادہ ڈر جاؤں گا۔ حضرت عبادہ آگے بڑھے اور بولے میں نے تمہاری باتیں سنیں۔ لیکن یہ سن لو کہ جن لوگوں کے پاس سے میں آیا ہوں اُن میں ایک ہزار اور کالے آدمی موجود ہیں جن کا رنگ مجھ سے زیادہ کالا اور مجھ سے زیادہ ہیبت صورت کے ہیں حالانکہ تم اُن کو دیکھو گے تو کہا حال ہو گا۔ میں باوجودیکہ بوڑھا ہو گیا ہوں اور میرا شباب رخصت ہو چکا۔ لیکن الحمد للہ کہ میں تمہا سود شمنوں سے

بھی نہیں ڈرتا۔ اور یہی حال میرے اور ساتھیوں کا ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ہمارا مقصد اصلی اور ہماری مرغوب ترین چیز خدا کی راہ میں جہاد کرنا اور اس کی رضامندی حاصل کرنا ہے۔ ہم دشمنوں سے کسی دنیوی خواہش یا محض غلبہ حاصل کرنے کے لیے نہیں لڑتے ہیں۔ ہم تو فقط اس لیے لڑتے ہیں کہ خدا نے ہمیں اس کام کا حکم دیا ہے اور لڑائی میں جو کچھ مال غنیمت ملے اس کو خدا نے ہمارے لیے حلال کر دیا ہے۔ ہمیں دنیوی تمول کی کوئی پروا نہیں۔ ہمارے پاس لاکھوں درہم ہوں یا صرف ایک درہم ہو برابر ہے۔ کیونکہ ہمیں دنیا میں زیادہ سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ اتنی غذا ہے کہ بھوک ٹک جائے اور فقط ایک چادر جس کو ہم اوڑھ سکیں۔ لہذا ہم میں کسی کے پاس اگر اس کے سوا کچھ نہ ہو تو بھی اس کے لیے کافی ہے۔ اور اگر اس کے پاس لاکھوں روپیہ ہوں تو اتنے ہی پر قناعت کر کے وہ ساری دولت کو خدا کی خوشنودی کے لیے خرچ کر ڈالے گا۔ ہمارے لیے دنیا کی نعمتیں اور راحتیں اصل میں کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ اصلی نعمت اور راحت آخرت کی ہے۔ اسی سبب سے ہمیں خدا اور رسول نے حکم دیا ہے اور ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم سے عہد لیا ہے کہ ہمارے پاس مال دنیا سے اسی قدر ہو کہ بھوک کو روک سکیں اور ستر کو چھپا سکیں۔ ہماری ساری ہمت اور کل کوششیں صرف خدا کی رضامندی حاصل کرنے اور اس کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ہوں۔“

یہ تقریر سن کے مقوقس نے ان لوگوں کی طرف جو اس کے ارد گرد بیٹھے تھے مخاطب ہو کر کہا کہ اس شخص کی ایسی کوئی تقریر تم نے کبھی سنی ہے؟ میں تو اس کی صورت ہی سے ڈرا تھا مگر اس کی تقریر میرے نزدیک اس کی صورت سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ اور خدا نے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو فقط شہر دن کو تباہ و برباد کرنے کے لیے بھیجا ہے۔“

اس کے بعد مقوقس حضرت عبادہ کی طرف متوجہ ہوا اور بولا کہ تم نے جو کچھ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے متعلق کہا میں نے سب سن لیا۔ میں اپنی جان کی قسم تمہارے کہتا ہوں کہ اس درجے کو تم فقط ان ہی وجوہ سے پہونچے ہو جن کو تم نے اپنی تقریر میں بیان کیا ہے۔ جن لوگوں پر تم غالب آئے ہو وہ بھی محض اس

وجہ سے مغلوب ہوئے کہ ان کو دنیا کی طرف رغبت اور اس سے محبت تھی۔ فی الحال تم سے مقابلہ کرنے کے لیے میرے پاس اس قدر رومی جمع ہو گئے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لوگ شجاعت اور دلیری میں مشہور ہیں اپنے دشمن اور مقابل کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ مجھ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ان پر ہرگز غالب نہ آسکو گے۔ اپنے ضعف اور قلت تعداد کی وجہ سے تم کبھی ان سے پیش نہیں پاسکتے۔ تم اس جگہ ایک مہینہ بھر سے پڑے ہو اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ سخت تنگی و تکلیف میں مبتلا ہو۔ تمھاری کمزوری اور تعداد کی کمی کیوجہ سے تم پر ہر جم کرتے ہیں اور بہت خوش ہوں گے اگر اس شرط پر صلح ہو جائے کہ ہم تم میں سے ہر شخص کو دو ہاتھارے سردار کو ایک سو دو تیار اور تمھارے خلیفہ کے لیے ایک ہزار دینار دین اور تم ان کو لے کر قبل اس کے کہ اس رومی جماعت کا سامنا ہو جس کے حملوں کی تم ہرگز تاب نہ لاسکو گے اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔

یہ سن کے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم اور تمھارے ساتھی دھوکے میں نہ رہیں اور تم جو رومیوں کی ٹڈی دل فوج کی دھکی دے رہے ہو۔ اور اس خیال میں ہو کہ ہم اس کا مقابلہ نہ کر سکیں گے تو میرے سر کی قسم ایسا نہیں ہو کہ ہم اس سے ڈر جائیں یا ہمیں اس سے شکست ہو جائے۔ یہ بات جو تم کہہ رہے ہو اگر دراصل صحیح ہو تو اس سے ہمارے دلوں میں تم سے لڑنے کا اور شوق پیدا ہو گیا۔ کیونکہ جب ہم خدا کے سامنے جائیں گے تو یہ امر ہمارے لیے ایک قوی غدر ہو گا اور بیان ہم کو دو برکتوں میں سے ایک ضرور ملے گی۔ فحیاب ہوئے تو کثرت کو دعویٰ مال غنیمت ہاتھ آئے گا۔ اور اگر تم غالب آئے یعنی ہم شہید ہوئے تو ہمارے لیے دولت آخرت بڑھ جائے گی۔ اور یہ آخری صورت اس وقت ہے جبکہ ہم اپنی پوری کوشش دکھا چکے ہوں۔ اور یہی بہت زیادہ پسندیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے کہا ہے کہ بہت سے چھوٹے گروہ ہیں جو خدا کے حکم سے بڑی جماعت پر غالب آئے ہیں۔ اور خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ہم میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو صبح و شام خدا سے اس کی دعا کرتا ہو کہ شہادت نصیب ہو اور اس کو پھر اپنے گھر بار اور بال بچوں میں نہ جانا پڑے۔ ہم میں سے کسی

شخص کا دل اُن لوگوں میں نہیں لگا ہے جن کو ہم مگر پر چھوڑ آئے ہیں۔ کیونکہ ہم
 سب نے اپنے گمراہیوں اور بال بچوں کو خدا کے حوالے کر دیا ہے۔ ہماری توجہ
 فقط موجودہ امور کی طرف ہے۔ اور تمہارا یہ کہنا کہ ہم تنگی میں ہیں غلط ہے۔ ہم
 بڑے مزے میں ہیں۔ اگر ہم کو ساری دنیا بھی مل جاتی تو ہم اس میں سے اپنے
 لیے فقط اسی قدر لیتے جس قدر اس وقت ہمارے پاس موجود ہے۔ غرض تمہارا
 جو کچھ ارادہ ہو بیان کرو۔ ہمارے تمہارے درمیان صرف تین صورتیں ممکن ہیں ان کے سوا اور
 کوئی بات ہم نہیں منظور کر سکتے۔ تم اپنے دل میں کوئی برا خیال نہ کرو۔ اس لیے کہ ہمارے
 سردار نے ہم کو یہی حکم دیا ہے اور ہمارے ایمر المؤمنین کا بھی یہی ارشاد ہے۔ اور اسی
 کا ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہم سے عہد لے چکے ہیں۔ وہ تینوں صورتیں
 یہ ہیں کہ یا تو تم اسلام قبول کرو۔ یہی وہ دین ہے جس کے سوا کوئی دین
 خدا کے نزدیک مقبول نہیں اور یہی خدا کے کل نبیوں۔ رسولوں اور فرشتوں
 کا دین رہا ہے۔ جو شخص اس کی مخالفت اور اس سے اعراض کرے ہم کو اس سے
 مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس دین میں داخل ہو جائے۔ اسلام
 قبول کرنے کے بعد اس کا نقصان ہمارا نہیں اور ہمارا مال اسکا مال ہوگا۔ اور وہ ہمارا
 دینی بھائی ہو جائے گا اگر تم اور تمہارے ساتھی اس دین کو قبول کر لیں تو دنیا و آخرت
 میں سرخ رو ہوں گے اور پھر ہم تم سے نہ لڑیں گے۔ اس وقت تم کو تکلیف پہنچایا
 تم کو ذلیل کرنا ہم پر حرام ہو جائے گا۔ اور اگر تم جزیہ کے سوا کچھ نہیں منظور کرتے
 تو دولت کے ساتھ جزیہ دو۔ لیکن اس صورت میں تمہارا وہ اعزاز نہ ہوگا۔ لیکن
 ہم تمہارے ساتھ ہمیشہ ایسا برتاؤ کریں گے جس کو ہم بھی پسند کرتے ہوں اور تم بھی
 اس سے راضی ہو۔ جو تم پر حملہ کرے گا ہم اس سے لڑیں گے۔ تمہارے ملک
 تمہاری جانوں اور تمہارے مال کی ہم اس وقت تک حفاظت کریں گے جب تک
 تمہاری ذمہ داری ہمارے سر رہے گی اور ہم خدا کے نزدیک تمہارے ذمہ دار
 ہوں گے۔ اس لیے کہ تمہارے متعلق خدا سے ہمارا عہد ہوگا۔ اور اگر تم کو اس سے
 بھی انکار ہے تو پھر تلوار ہمارا تمہارا فیصلہ کرے گی یہاں تک کہ ہم سب کے سب
 مرجاویں۔ یا جو کچھ ہم چاہتے ہیں وہ حاصل ہو جائے۔ یہ ہمارا وہ دین اور طریقہ ہے

جو خدا سے وابستہ ہے اور اس کے سوا ہم اپنے اور خدا کے فیما بین کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ لہذا اب تم خود ہی اپنے متعلق فیصلہ کر لو کہ کون سی صورت پسند ہے۔

موقوفین نے تقریر میں کہہ گائی کہ تو اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک تم ہیکو

ہمیشہ کے لیے اپنا غلام نہ بنا لو۔ حضرت عبادہ نے کہا یہ خیال ہو تو جو صورت

چاہو اختیار کر لو۔ موقوفین نے کہا کیا ان میں صورتوں کے علاوہ اور کوئی

بات نہ منی جائے گی؟ حضرت عبادہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ نہیں جتنم ہے اس ذات

باری کی جو آسمان کا رب ہے۔ اس زمین کا برد و گار اور تمام چیزوں کا

خالق ہے ان میں صورتوں کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ انھیں

تینوں میں سے جس کو پسند کرو اختیار کر لو۔ یہ سن کر موقوفین اپنے ساتھیوں کی طرف

متوجہ ہوا اور بولا گفتگو ختم ہو گئی۔ اب بناؤ تم کیا کہتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا کیا

کوئی شخص بھی اس ذلت کو گوارا کر سکتا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ ہم ان کے دین میں

داخل ہو جائیں تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مسیح بن مریم کو چھوڑ دین اور ایک ایسے دین

کے پیرو ہو جائیں جس کو ہم جانتے ہی نہیں کہ کیسا ہے۔ ان کا یہ خیال کہ ہم کو قید

کر لیں اور ہمیشہ کے لیے ہمیں اپنا غلام بنالیں اس سے تو موت بہتر ہے۔ ان لوگوں

سے جو کچھ دینے کو کہا گیا اگر اس کی دوزی رقم کر دین تو بھی ہم آسانی سے قبول کر لیں

گے موقوفین نے حضرت عبادہ سے کہا تم نے دیکھ لیا کہ ہماری قوم اس سے انکار کرتی ہے

تو کہو اب تمھاری کیا رائے ہے؟ تم اپنے سردار کے پاس جا کر کہو کہ تم جو مانگو ہم اس کے

دینے کو تیار ہیں۔ لو اور واپس چلے جاؤ؟ یہ سن کر حضرت عبادہ اور ان کے ساتھی

اٹھ کھڑے ہوئے اور واپس چلے آئے۔

ان کے جانے کے بعد موقوفین نے اپنے ساتھیوں سے کہا میرے خیال

میں انھیں تین صورتوں میں سے ایک کو منظور کر لینا چاہیے۔ میں جانتا ہوں

کہ تم میں ان کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے آج خوشی خوشی اس بات کو منظور

نہ کرو گے تو کل بکبر و اکراہ یہی باتیں منظور کرنی پڑیں گی۔ لوگوں نے پوچھا پھر

کون سی صورت اختیار کی جائے؟ موقوفین بولا کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ ان

کے دین میں داخل ہو جاؤ۔ رہا ان سے لڑنا تو میں اسکی بھی رائے نہ دوں

کیونکہ میں جانتا ہوں تم ان پر فقیاب نہ ہو سکو گے اور نہ لڑائی میں تم سے ان کی
 سی جفا کشی ممکن ہے۔ ان دونوں باتوں کے سوا جو صورت ہو اسی کو اختیار کرنا پڑے
 گا۔ لوگوں نے کہا تو کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ ہم ہمیشہ کے لیے ان کے غلام بن جائیں۔
 مقوقس نے کہا بیشک مگر ایسے غلام کہ اپنے گھر دن اور اپنے ملک میں بادشاہ بنے رہو
 اور اپنی جانوں۔ مالوں۔ غلاموں اور جائیدادوں کی طرف سے مطمئن ہو۔ یہ بات اس سے
 اچھی ہے کہ سارے کے سارے مرجاؤ یا ایسے غلام بنو کہ بازار دن میں بیچے جاؤ اور پھر
 دن و فرزند ہمیشہ کے لیے غلام بنا کر مختلف ملکوں میں منتشر کر دیے جائیں۔ یہ سن کر سب نے
 کہا کہ ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ اور اس کے بعد مقوقس نے فسطاط اور جزیرہ
 کے درمیان کا پہلے توڑ وادیا۔

محل میں رومیوں اور قبطیوں کی بہت بڑی جماعت موجود تھی۔ اتنا محبت
 کے بعد مسلمانوں کو خیال ہوا کہ پہلے محل ہی پر حملہ کرنا چاہیے چنانچہ انھوں نے
 قصر پر حملہ کر دیا۔ اور لڑائی میں مسلمان کامیاب رہے۔ رومیوں اور قبطیوں
 کے بہ کثرت لوگ قتل ہوئے۔ جو قید ہو سکے قید کر لیے گئے باقی سب کشیدہ بن گئے
 جزیرہ میں یعنی دریائے اس پار چلے گئے۔

اب نیل کی طغیانی کا زمانہ آگیا اور اس کے باعث مسلمان چاروں
 طرف سے پانی میں گھر گئے۔ وہ نہ کہیں جاسکتے تھے اور نہ کسی طرف کا رخ کر سکتے
 تھے۔ اس شگست کے بعد مقوقس نے اپنے ساتھیوں سے کہا اسی انجام کو میں ڈرتا
 تھا اور یہی میں نے تم سے کہہ دیا تھا۔ دیکھو اب بھی موقع باقی ہے۔ خدا کی قسم اس وقت
 خوشی خوشی ان کا کہنا مان لو ورنہ اس سے بھی زیادہ سخت باتیں مجھ پر اور
 ناگواری کے ساتھ ماننا پڑیں گی۔ خدا کے لیے ندامت اٹھانے سے پہلے میرا کہنا
 مان لو۔ جزیرہ دینے پر راضی ہو جاؤ اور اس طریقے سے تم ایک ایسی صلح حاصل
 کرو جس کے وہ لوگ ہمیشہ بائبر رہیں گے۔ اس کے بعد مقوقس نے حضرت عمرو بن
 عاص کے پاس پیام بھیجا کہ میری نذر سے یہ خواہش تھی کہ آپ کی تین شرطوں
 میں سے ایک کو منظور کر لیں جو رومی اور قبطی میرے بیان تھے انھوں نے
 منظور نہ کرنے دیا۔ اور میں ان کو مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ میری نصیحت

کار بند ہونے کو کہتے ہیں۔ اس لیے مجھ کو امان دیجیے۔ معاہدہ کی تکمیل کے لیے ہم آپ اور ہمارے آپ کے ساتھ کے کچھ لوگ ایک جگہ جمع ہوں تاکہ کوئی مناسب صورت نکل آئے۔ اگر یہ مسئلہ طے پا گیا تو جنگ ختم ہو جائے گی۔ اور اگر آپ نے نامنظور کیا تو دہی ہونے لگے گا جو ہو رہا ہے۔

اس پیغام کے متعلق حضرت عمرو بن عاص نے اپنے ساتھیوں سے راس لی۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ اب ہم کسی طرح ان لوگوں سے صلح نہ کریں گے۔ اور نہ جزیہ منظور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامل فتح عنایت کرے گا۔ یہ قصر ہی نہیں بلکہ سارا ملک مصر ہمارے قبضے میں آجائے گا اور مال غنیمت حاصل ہوگا عمرو بن عاص نے کہا تم اچھی طرح معلوم ہے کہ حضرت امیر المومنین نے مجھ سے کیا وعدہ لیا ہے۔ اگر یہ لوگ ان تین شرطوں میں سے کوئی شرط منظور کرتے ہیں تو تم کو صلح کر لینی چاہئے۔ پھر تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ جن مقامات پر ہم حملہ کرنا چاہتے ہیں ان کے اور ہمارے درمیان میں ایک دریا حاصل ہے۔ لہذا ان سے ہمدردی اور اس شرط پر صلح ہو جائے کہ مصر کا ہر امیر غریب بڑا چھوٹا قبضی جو بالغ ہو ہم کو دو دینار دے۔ مگر بڑے نابالغ اور عورتیں اس سے مستثنیٰ رہیں۔ مسلمانوں کو وہ اپنے بیان رہنے کی جگہ دیں۔ اور مسلمان خواہ ایک ہو یا بہت سے ہوں جب بیان آئیں تو ان کی یہ لوگ تین دن تک ہتھانداری کریں۔ ان کی زمینیں اور ان کا مال انھیں کے قبضے میں رہے۔ ہم کو اس سے زیادہ تعرض کا حق نہیں ہے۔ یہ سب شرطیں صرف قبطیوں کے ساتھ تھیں۔

اس معاہدہ کے بعد ان قبطیوں کا جو جزیہ دینے کے قابل تھے شمار کیا گیا۔ اور اعلان کر دیا گیا کہ فلاں فلاں لوگوں کو جزیہ دینا ہو گا۔ ان کے دربار میں جزیہ لکھا لکھا کے جزیہ ادا کرنے کا اقرار کیا۔ مصر میں جزیہ دینے کے قابل لوگ نسبت چھ لاکھ سے کچھ زائد تھے لہذا ان کا جزیہ بارہ لاکھ دینار سالانہ ہوا کرتا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ غلہ جس کا ہر سال لیا جاتا تھا اس کی مجموعی قیمت آٹھ لاکھ دینار تھی نفوس زبردستوں کو اختیار دیا تھا کہ ان میں جو چاہیں شرط کو منظور کرے اور اس صورت میں اسکو بھی جزیہ دیا جائے گا اور جو چاہیں اسکندریہ اور اس کے قریب وجار کے مصری مقامات میں جا کے عہدہ بیان سے چلا جائے۔



ابو بکر احمد بن علی بن ثابت بن احمد بن ہمدانی بن ثابت بغدادی مشہور
مورخ بغداد، خدا غریقِ رحمت کرے عجیبِ غریب فضل و کمال کے بزرگ تھے۔
ان کے سحر کو زمانے ہی نے نہیں تسلیم کر لیا۔ بلکہ اس نے ہر شخص کو تسلیم کروایا
کہ وہ حافظِ حدیث تھے اور روایتوں کے نقل کرنے اور وسعتِ نظر کے اعتبار
سے وہ اپنے ہی عہد میں نہیں ہر عہد کے لوگوں کی نظر میں اعجازِ روزگار اور
بیشمل و بے بدل شخص تھے۔ راویوں کی جانچ پڑتال اور فقہ رجال میں ان کا
رتبہ اس پایہ پر ہے کہ متاخرین ہر امر میں ان کے فیصلوں پر اعتبار کرتے ہیں ان
سمعیانی نے ان کی تعریف میں فرمایا ہے "وہ اپنے عہد میں یا متاخرین میں اس مرتبہ
کے فاضل و علامہ تھے جس مرتبہ کو فقہاء قدیم اور ائمہ سلف نے حاصل کر لیا تھا۔ یہ
بڑے صاحبِ خلق اور صاحبِ عجب تھے۔ سچائی اور راست بازی میں اس آزادی سے کام لیتے تھے
کہ انھوں نے جو کچھ اپنی تصانیف میں تحریر فرمایا وہ علی الاطلاق سب کے لیے حجت
ہو گیا۔ ایک محدث تھے کہ تیز باعتبارِ نقل روایات نیز لمحاظِ خوبی خطا اور نیز خشیت
قوتِ حافظہ اور یادداشتِ زمانہ میں نامور تھے۔ جو کچھ بیان کرتے تھے اس کو نہایت
فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ خدا نے خلق و مروت اور خوبصورتی
و زیبائی صورت و لون باتوں میں انھیں کمال بخشا تھا۔ علمِ حدیث کا ان پر خاتمہ
ہوا۔ اور حفاظِ حدیث کا سلسلہ ان پر منقطع ہو گیا۔

جو بینِ جمادی الثانی ۳۹۷ھ میں جمعرات کے روز دارالسلام بغداد

میں پیدا ہوئے۔ اور اسی مبارک و مشہور شہر کے سوادین نشوونما پائی جب کھیل کود کا ابتدائی زمانہ اور بچپن کی آزاد اور دلچسپ زندگی گزر گئی اور کچھ کچھ رشد و تہذیب کے سن میں قدم رکھا تو مکتب میں آئے اور عام مسلمان لڑکوں کی طرح سعادت دارین سمجھ کے قرآن مجید پڑھنے لگے۔ قرأت کے تمام اصول کے ساتھ کلام پاک آہی کو پڑھ کے نحو و صرف اور زبان عرب میں لیاقت حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ شیخ ابو اسحق ابراہیم بن عقیل قرشی جن کو عام پبلک نے "کبر نخوی" کا خطاب دے رکھا تھا۔ ان کے شاگردوں میں شامل ہوئے۔ نحو و صرف کے قاعدے ان سے حاصل کیے اور علم فقہ میں بصیرت پیدا کرنے کے لیے قاضی ابو الطیب طبری اور شیخ ابو الجین محالی اور دیگر فقہاء معروف کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے شاگردی کیا۔ پندرہ مہینے میں جب کہ ہنوز گیارہ ہی برس کی عمر تھی علم حدیث نے اس کو عمر اور ہونہار بننے کو اپنی خوبیوں کا فریضہ کر لیا۔ علم حدیث ایک ایسا علم تھا جس پر تمام کمالات علم منحصر خیال کیے جاتے تھے۔ اور جمہور قدما کے اسلام کے اپنی لیاقت کا اظہار اسی فن شریف میں معرکہ آرائی کر کے کیا ہو علم حدیث میں خطیب بغدادی کو اس کم سن ہی کی عمر میں کچھ ایسی لذت حاصل ہوئی کہ وہ عہد جبکہ انسان کو سوا کھیل کود کے کچھ نہیں سو جھتا۔ اُسکی ساری دلچسپیاں انھیں بھول گئیں۔ کلام پاک رسول اللہ صلعم کے ذوق نے گیارہ بارہ برس ہی کی عمر میں خطیب بغدادی کو دنیا کی تمام لذتوں اور راحتوں کا مزہ بھلا دیا تھا کبھی شب و دروہ میں کوئی ایسی گھڑی نہ آتی تھی جس کو وہ نو عمر عاشقِ قدس رسول سوا حدیث کے کسی اور کام میں صرف کرتا ہو۔ حتیٰ کہ کہتے ہیں اگر کسی خانی اور سردار کا کام کے لیے انھیں مجبوراً گھر سے نکلنا بھی پڑتا تھا تو کتب احادیث کا کوئی جز و ماتہ میں لیتے جاتے تھے تاکہ راستہ میں اسے یاد کرتے جائیں۔ مشہور محدث ابن جوزی خطیب بغدادی کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس ذوق و شوق کا یہ نتیجہ ہوا کہ خطیب مملوہ روح تمام علماء بغداد کے فیض افادت سے تھوڑے ہی دنوں میں بے پروا ہو گئے اور اس مرکز و دار الخلافہ بنو عباس کے علمی خزانوں میں جو کچھ تھا سب حاصل کر لیا۔ آخر شوقِ علم اور اُسکی بے چینی نے بغداد چھوڑ دیا۔ وطن

ماون کا چھوٹا تھا کہ یہ عالم ہو گیا جہاں اور جس شہر میں کسی نامور عالم اور حافظ حدیث کا نام سنتے اُسکی صحبت سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے وہاں روانہ ہوتے۔ مدت تک خاک بصرہ پر مقیم رہے اور ایک عرصہ تک سوا دیشاپور کی ہوا کھاتے رہے۔ کچھ دنوں صفہان میں قیام کیا جی کہ مختلف استادوں اور شیوخ سے حاصل کر کے اپنی روایتوں اور سندوں کو نہایت ہی مضبوط کر لیا جب اس امر میں اطمینان حاصل ہو لیا تو شش و طن نے اُنھیں کچھ کے پھر بغداد پہنچایا۔ کچھ دنوں وطن میں قیام رہا۔ اعراد اقرار ب صحبت سے تھوڑا کھٹا اٹھانے پائے تھے اور بارہ آشنا کو ان کی دوستی سے زیادہ نفع حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تھا کہ شوق علم کا جوش پھر داغ میں پیدا ہوا۔ اور سفر کی تیاریاں کر دین وہ مالک جو بغداد سے مشرق کی جانب واقع ہیں اُن کی آب و ہوا کا تو پہلے سفر میں امتحان کیا تھا اس مرتبہ جو وطن سے قدم نکالا تو مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔ اطراف شام کو بھی دیکھا علم میں بہت کچھ شہرت حاصل تھی عراق سے مکمل کے پہلا ملک شام جو وہاں سے مغرب کی جانب واقع ہے۔ لہذا خطیب بغدادی سرزمین شام میں پہنچے کچھ دنوں دمشق میں رہے کچھ دنوں شہر صور کے لوگوں سے لطف صحبت اٹھایا۔

عمر نسوی کہتے ہیں جن دنوں خطیب بغدادی شہر صور میں تھے اتفاقاً وہاں کی جامع مسجد میں ایک روز مجھ سے اُن سے ملاقات ہوئی۔ میں اُن کی صحبت میں بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں ایک علوی شخص آیا۔ اُسکی آغوش میں کچھ دینار تھے جن کو لاتے اُس نے خطیب ممدوح کے سامنے رکھ دیا اور عرض کرتے لگا کہ شہر کے فلان رئیس نے یہ دینار بطور نذر آپ کی خدمت میں بھیجے ہیں۔ اور عرض کیا ہے کہ ان کو آپ اپنے جو ضروریہ میں صرف کیجیے۔ ابو بکر خطیب نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ مجھے ان کی کچھ ضرورت نہیں، اُس علوی نے یہ جواب سُن کے کہا، "شاید آپ ان دیناروں کو تھوڑا خیال ہے نہیں قبول فرماتے۔ بہتر تو لیجیے اور بھی حاضر ہیں، یہ کہہ کے اُس نے آستین جو جھاڑی تو چھنا چھین بہت سے دینار گر پڑے اور اس جانا زربھیل گئے جو خطیب صاحب کے نیچے بھی ہوئی تھی۔ اور اُن دیناروں کی طرف اشارہ کرتے کہنے لگا، "لیجیے یہ تین سو تیار ہے۔ ہمارے یہاں جو کام جیب سے لیا جاتا ہے اُن مالک میں آستین سے لیا جاتا ہے۔ ہمیشہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ آستین عسرب و شام و عراق وغیرہ کی جیب ہے۔"

ان کو قبول فرما کے اپنے امور ضروریہ میں صرف کیجئے۔ اتنا سنا تھا کہ ابو بکر خطیب کو غصہ آ گیا جھلا کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنی جانناڑ اٹھا کے جھاڑ دی وہ تمام دنیا ر مسجد کی چٹائی پر ادمر ادمر بکھر گئے۔ اور خود مسجد سے نکل کے اپنے فرد و گاہ کا راستہ لیا۔ وہ علوی ذلیل ہو کے رہ گیا۔ نسوی کہتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں نہ کسی کو اتنا برہم اور مستغنی دیکھا۔ جس قدر کہ اس وقت مجھے خطیب بغدادی نظر آئے۔ اور نہ میں نے کسی کو اتنا آدم اور ذلیل دیکھا جس قدر کہ اس وقت وہ علوی تھا۔ اس بیچارے نے آخر بچھتا کے وہ دنیا ر چٹائی کے شگافوں سے نکالے اور اپنے دل میں خود اپنے اوپر نفرین کرتا ہوا چلا گیا۔

جس زمانے میں ابو بکر کا تصور میں قیام تھا بیت المقدس کی زیارت کے لیے اکثر چلے جایا کرتے تھے۔ اور ہاں عبادت الہی اور وظائف مسنونہ میں زیادہ سرگرمی دکھاتے تھے۔ اٹھین دنوں اتفاق سے اُس قافلہ کا صور میں ہو کے گذر ہوا جو سرزمین شام سے حاجیوں کو مکہ معظمہ لے جاتا تھا علامہ ممدوح کا ایسا پیر جو شہ دنیا را در آرزو منش شخص کہو نکر اُس مقدس و مبارک قافلہ کا ساتھ چھو سکتا تھا۔ اُن کے دل میں بھی زیا رت بیت المقدس کا شوق ہوا اُس قافلہ کے ہمراہ عازم زیارت بیت اللہ شریف ہوئے۔ وہیں سے احرام حج باندھا۔ اور شرف حج سے ممتاز ہوئے۔ مناسک حج سے فراغت کرنے کے بعد ایک روز اتفاقاً جاہ زمزم پر گذر ہوا۔ اُس کی صورت دیکھتے ہی یاد آیا کہ جناب رسول اللہ صلعم نے اس کے بانی کی نسبت فرمایا ہے۔ ”متاع ذمزم لما شوب لہ“، یعنی زمزم کا پانی جس غرض کے لیے انسان پیے اللہ جل شانہ اُس غرض کو پورا کر دے گا۔ پیغمبر صلعم کے اس وعدہ برحق کا یاد آنا تھا کہ دل کی ساری آرزوئیں اور تمنائیں یکایک ابھر پڑیں۔ یہی مقام اُس راست باز اور دنیا را عالم کی نفسانی حالتوں کے اندازہ کرنے کا ہے۔ اگر اس مقام پر اور کوئی شخص ہو تا تو اس کی خواہش ہمارے عام خیال کی بنا پر یا تو دولت مند ہی سے متعلق ہوئی یا کسی جور و ش کے وصال کی تمنا ہوئی اور خاص حالتوں میں بھی کسی نہ کسی دنیاوی ہی امر کی آرزو کرتا۔ لیکن ابو بکر فیادی نے اس موقع پر کھڑے ہوئے تین چلو آب زمزم

کے پیے اور ہر چلو پی کے ایک دعا کی۔ اول یہ کہ میں ایک نہایت ہی مکمل اور سلم البشریت تاریخ بغداد لکھ سکوں۔ دوسری میں بغداد کی سب سے اعلیٰ اور جہ کی اور مشہور جامع اسی جامع مغربیہ میں احادیث و روایات کا درس دوں۔ تیسرے میرے مرنے کے بعد مجھے دفن ہونے کے لیے مقبرہ بشر حافی میں جگہ ملے۔ خدا اپنے پاک بندوں کی دعا قبول ہی کرتا ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی کی یہ کیمنون دعائیں قبول ہوئیں جس زمانے میں ابو بکر بغدادی بیت اللہ شریف کی زیارت کو تشریف لے گئے تھے اسی زمانے میں مشہور زمانہ محدث ابو عبد اللہ محمد بن سلام جن کی طرف ساری دنیا کا مرجع تھا وہ بھی بغرض حج بیت اللہ میں تشریف لائے ابو بکر بغدادی کو یہ موقع غنیمت معلوم ہوا۔ اُن کے سامنے ادب سے جا کے بیٹھے اور شاگردی کی درخواست کی۔ اُنھوں نے قبول کیا اور بہت سی روایات احادیث اُن کو سنائیں اور اجازت دی۔

تعلیم نسوان اُس عہد میں ترقی پر تھی۔ اور جس طرح مردوں میں اسانذہ فن اور اہل کمال موجود تھے اسی طرح بڑی بڑی باکمال عورتیں بھی موجود تھیں۔ چنانچہ کریمیہ بنت احمد بن ابی حاتم اُس عصر کی مشہور محدثہ اور مدرسہ تھیں۔ اور اس کمال کی محدثہ کہ خطیب بغدادی کے ایسے منتہی اور اعلیٰ درجہ کے طالب علم کو اُن سے درس لینے کا شوق ہوا۔ کریمہ محدثہ نے بھی تمام دنیاوی تعلقات چھوڑ کے مجاورت حرم محرم اختیار کر لی تھی اور جن دنوں خطیب بغدادی مکہ معظمہ میں تھے اُنھیں دنوں وہ بھی وہاں موجود تھیں ابو بکر بغدادی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صحیح محمد بن اسماعیل بخاری علیہ الرحمہ صحیح بخاری کے نام سے مشہور اسکو اول سے آخر تک کریمہ کی خدمت میں پڑھنے کے شد حال کی۔ اس تکمیل کے بعد ابو بکر بغدادی نے مکہ معظمہ سے سفر کر کے وطن مالوف دار السلام بغداد کی راہ لی۔ اب جو بغداد میں پہنچے تو اُن کے تہجد اور وسعت کا یہ عالم تھا کہ جمہور محدثین میں سے کوئی شخص اُن کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ ابن ماکو لا جو خود بھی بہت بڑا مستند و معروف محدث ہے کہتا ہے: "دار السلام بغداد کو دار قطنی کے بعد جو خطیب بغدادی کا پایا کوئی محدث نہیں نصیب ہوا" ابن ماکو لا ہی پر کیا مختصر ہے تمامی علماء اسلام جو بعد کے سب خطیب بغدادی کی مدح سرائی میں انتہا سے زیادہ رورق قلم دکھا رہے ہیں۔ ابو بکر بغدادی اس دفعہ جو اپنے وطن مالوف دار السلام بغداد میں آئے تو

خوبیاجم کے ریحو اور بیشک اُنھیں اپنے وطن سے بڑی محبت تھی۔ اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ اُسکی ایک مکمل تاریخ لکھنے کے لیے اُنھوں نے مارمزمین کے حضرت رب العزت میں دعا کی تھی اسکے علاوہ اس مرتبہ اہل بغداد نے اُنھیں گذشتہ ایام کی طرح ایک طالب علم نہیں بلکہ اب وہ ایک علامہ زمان اور محدث دوران تھے بغداد میں ابوکر کو جو اطمینان سکے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو اُنھوں نے تاریخ بغداد لکھنا شروع کر دی اسلامی تواریخ میں یہ کتاب نادر بے مثل اور نہایت ہی مستند و معتبر ہے۔ اس تاریخ میں ابتداء اسلام سے اس عہد تک جبکہ خطیب مدوح نے اپنی کتاب لکھی تمام حالات بغداد و اطراف بغداد و ریح وین کی علیٰ امتشاہیز اہل دول اور دیگر اقسام کے بالکل لوگوں کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں احادیث کے سلسلہ میں جن رجال کے نام آئے ہیں اُن کا بھی بخوبی پتہ لگایا ہے فقہاء اور محدثین میں سے ہر ایک کے نام و نسب کو خوب واضح طور پر بتایا ہے پھر اُن لوگوں کے حالات سے بحث کی ہے جو دیگر اطرافِ عالم سے آئے بغداد میں سکونت پذیر ہو گئے اُن کی زندگی کے واقعات کو بھی خوب عمدگی سے بتایا ہے۔ ان لوگوں کی تصنیفات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ تاریخ دس جلدوں میں ہے اس تاریخ کو اُنھوں نے اپنی زندگی ہی میں پھیلا دیا تھا۔ اور اپنے عہد کے مشہور ائمہ فن کو دکھا کے ثابت کر دیا ہے کہ گو اہام سیکس نے اُس کتاب پر اعتبار کر لیا۔ اور واقعی تاریخ خطیب بغدادی ایسی مقبول ہوئی کہ اسلامی عہد کے تصنیفات میں سے بہت کم کتابوں کو وہ مقبولیت عامہ نصیب ہوئی ہوگی۔ ابوسعید سمرقانی اور محب الدین ابن بخارہ وغیرہ کے ایسے مشہور زمانہ علماء اسلام نے اس تاریخ پر اضافہ کر کے غنیمت و رزق بڑھائے۔

یا قوت جموی کا بیان ہے کہ اتفاقاً خطیب بغدادی کو چند اوراق ہاتھ لگے جن میں وہ روایات لکھی ہوئی تھیں جو خلیفہ وقت قائم بام اللہ عباسی کو دیگر ساتذہ سے پہنچی تھیں۔ اُن اوراق کو ہاتھ میں لیکر خطیب مدوح دار الخلافہ کے دروازے پر گئے اور خلیفہ کی خدمت میں کھلا بھیجا کہ ”ابوکر آستان دولت پر حاضر ہو اور علم حدیث کو حضورِ ماحصل کرنا چاہتا ہے“ حجاب نے جب خلیفہ کی خدمت میں یہ پیغام عرض کیا تو خلیفہ نہایت ہی متحیر ہوا اور خطیب صاحب کی خدمت میں کھلا بھیجا کہ ”آپ آج تمام عراق و شام بلکہ ساری دنیا اسلام میں باعتبار نقل روایات و تحریر علمی کے مشہور ہیں ہمیں پتہ نہیں چلتا کہ آپ کی محبت سے آپ کی کوئی ایسی غرض نہیں متعلق ہو سکتی۔ آپ کا جو کام ہوا اسکو صحیح صحیح بلاتالان شاد

فرمائیے: یہ سن کے ابو بکر بغدادی نے کہا، اُن اس تہید سے میری اور غرض تھی حضور کو معلوم ہو کہ میں نے اپنی ساری عمر علم حدیث کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کی ہے اور میری کے متعلق میں نے مشہور اور مستند استادوں سے سُن سُن کے میں نے بہت سے فوائد اور نکات اپنے ذہن کے خزانہ میں فراہم کر رکھے ہیں۔ اب اُن کے رواج دینے اور پھیلانے کی ضرورت ہے۔ میں ایملہ یونین سے صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ مجھے جامع منصور میں حدیث کا درس دینے کی اجازت دیجائے۔ تاکہ وہاں ایک نہایت ہی عمدہ علمی محفل مرتب کر کے میں قول رسول کو اس کے سچے مستحقوں تک پہنچاؤں۔ ابو بکر کی اس درخواست کو خلیفہ قائم بامر اللہ نے قبول کیا اور اُنھوں نے جامع منصور میں ایک اتنی بڑی محفل علمی مرتب کی جس کی شہرت دور دور تھی اور جس کو زمانہ اور شائقان علم ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔ ابو بکر بغدادی کی دودھ مائیں تو پوری ہو چکی ہیں تیسری دعا باقی ہے اگرچہ اُن کا کوئی دوست اس دعا کی مقبولیت سے ڈرتا ہو گا مگر خدا اپنے اس مقبول بندے کی دعا کو قبول کرے گا۔

بغداد میں ابو بکر کو اس قدر شہرت ہوئی کہ آخر میں وہ خطیب بغداد مقرر ہوئے۔ جو اُن دنوں ایک بہت بڑا علمی عہدہ تھا۔ اس منصب پر ممتاز ہونے کی یہ وجہ تھی کہ اُن کو اور وزیر رئیس الرؤساء علی بن حسین بن محمد سے نہایت دوستی تھی۔ وہ ان کی بہت زیادہ قدر و منزلت کرتا تھا۔ جو اعتماد و زبرد کو رکھتا تھا اور انور شاہ کلل اور سند الوقت عالم کے ساتھ تھا۔ اُس کا آخر میں یہ نتیجہ ہوا کہ وزیر نے عام طور پر حکم دیدیا کہ کوئی قصہ خوان اور کوئی داستان نویس روایت و واقعہ کو نہ بیان کرے جب تک اُس کو علامہ ابو بکر بغدادی کے سامنے پیش کر کے نہ لے لے۔ اتفاقاً اسی عہد میں ایک یہودی صاحب پیدا ہوئے جنھوں نے ایک کاغذ پر یہ مذکور کے سامنے لاکے پیش کیا۔ اسکی عبارت۔ سے معلوم ہوتا تھا کہ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کاغذ لکھا گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ آنحضرت علیہ السلام نے خیبر کے یہودیوں کو حزیہ بیان کیا اور اس پر بہت سے جلیل القدر صحابہ کے دستخط تھے۔ اُس یہودی کا دعویٰ تھا کہ یہ ایک عمدہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیہ کے ساتھ کیا تھا۔ اور جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے کہ لکھا ہوا ہے۔ اس دعوے سے تمام علما سے بغداد میں ایک کشمکش پیدا کر دی۔ اس لیے کہ سلطنت پر اس کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور یہود سے جزئیہ اور محصل معاف ہوئے جاتے ہیں۔ اور اس وقت تک تمامی اسلامی دنیا کیا باعتبار سلطنت اور کیا باعتبار رعایا اسلام کی

مطبع ہنقاد تھی انگریزوں نے گجرات کے خطیب بغدادی کو لکھا۔ یہ ایک ایسا خیال تھا۔ جس کی وجہ سے تمام دنیا سے اسلام کو ایک حرکت جوگئی تھی اور اگر خطیب بغدادی غور کر کے اسکی اصلاح نہ کرتے تو کوئی شک نہیں کہ شرع اسلامی میں ایک بہت بڑا رخسہ بڑھاتا۔ وہ کاغذ جب خطیب بغدادی کے پاس پہنچا تو انھوں نے کسی قدر غور کر کے فرمایا۔ رئیس الروسا کا اقبال روز افزوں ہو رہا ہے اور یہ کاغذ جعلی ہے۔ اور یہ یہودی ہے۔ ایمان اور دغا باز ہے۔ اس نے حضرت رسول صلعم اور یاران رسول پر ہمت باندھی ہے۔ وہی صحابہ جن کی شہادت اس کاغذ پر لکھی ہے ان میں سے دو کے مقدس نام کاغذ کے جعلی ہونے کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اول تو معاویہ بن ابی سفیان کی شہادت لکھی ہے لیکن خیال کرنے کی بات ہے کہ غزوہ خیبر شبہ میں ہوا ہے۔ حالانکہ اس وقت تک معاویہ کا شمار مشرکین میں تھا۔ اور شبہ میں جبکہ مکہ فتح ہوا اس وقت ایمان لائے۔ دوسری شہادت سعد بن معاذ کی ہے جنھوں نے غزوہ خندق کے زمانے میں یعنی شبہ میں اتھال فرمایا۔ پھر وہ غزوہ خیبر کے وقت جو شبہ میں ہوا کیونکہ موجود ہو گئے۔ ان دو باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کاغذ جعلی ہے اور بنا ہوا ہے۔

یہ تقریر رئیس کے وزیر کو نہایت ہی مسرت ہوئی۔ اور بے اختیار جلاس کے کمرے میں اسے ابو بکر تمیم پر ہزار آفرین کہہ کر مجھے اس جعلساز دغا باز کے قریب سے بجا لیا۔ اس کے بعد سے وزیر رئیس الروسا کو ابو بکر خطیب کی نسبت حسن اعتقاد پڑھ گیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ روز بروز دونوں میں ربط و ضبط اور انس و محبت کو بھی ترقی ہوتی گئی۔ ایک ایسے با اختیار رئیس کے معقد ہو جانے کی وجہ سے ان کی مرجعیت بھی نہ زیادہ ہونے لگی۔ اور ان کا مرتبہ بھی عام سبک کے نظریں بہت با وقعت ہو گیا اور آخر اسی نے ان کے نام خطابت بغداد کا فرمان جاری کیا۔ اور خطاب خطیب جو ان کے نام کے ساتھ قیامت تک چلا جائے گا اس کی بنیاد ہی وزیر رئیس الروسا تھا۔ ابو بکر بغدادی نے جو کہ علم کو بڑے مصائب اور بے انتہا مشقتوں کے ساتھ حاصل کیا تھا۔ لہذا ان کے دل میں علم اور طالبان علم کی بڑی قدر تھی۔ مشہور ہے کہ ان کو اپنے عہدہ اور عموماً طلباء کے بیک وقت کا نہایت خیال رہا کرتا تھا اور کوئی شائد امر اسے شہر سے سفارش کر دیتا ہو مگر وہ اپنی جیب خاص سے طلباء کو

کی خبر گیری کرتے رہتے تھے۔ مگر یہ تمام باتیں نہایت مخفی طور پر عمل میں آتی تھیں۔
 ابو بکرؓ کی اس تبریزی جو مشہور لغوی ہر اس کا بیان ہے کہ جن دنوں خطیب بغدادی
 کے تجاور کمالات کا شہرہ تمام اطراف عالم میں پھیلا ہوا تھا میں دارالسلام بغداد میں بطور
 طالب علمی کے داخل ہوا۔ اور اُن کی درس گاہ میں گیا۔ جو کہ جیسے استاد کو میں دھونڈھتا تھا
 خطیب مدوح مجھے ویسے ہی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کے نظر آئے۔ لہذا میں نے اُن کا درس
 اس مضبوطی سے پکڑا کہ ہزار روزانہ ہوسے مگر نہ چھوٹا۔ روز اُن کی خدمت میں حاضر
 ہوتا تھا اور اُن کی تعلیم و تقریر سے فائدہ حاصل کرتا تھا۔ اس زمانے میں میں جامع بغداد
 کے منار کے نیچے ایک حجرہ میں رہا کرتا تھا۔ ایک دن اُسی حجرہ میں بیٹھا مطالعہ دیکھ رہا تھا
 کہ کیا دیکھتا ہوں کہ جناب استاد حضرت خطیب تشریف لاتے ہیں۔ کھڑے ہو کے میں نے تعظیم
 کی اور نہایت عزت سے بٹھایا۔ فرمانے لگے ”میں تم سے ملنے کا نہایت شائق تھا۔ ہمیشہ آنے
 کا ارادہ کرتا تھا مگر دوات زمانہ سے مہلت نہ ملتی تھی“ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں
 ہوئی رہیں۔ آخر فرمانے لگے ”بھائیوں اور دوستوں کی خدمت میں ہدیہ اور تحفہ لیجا تا اثر
 اسلامیہ میں نہایت ہی عمدہ کام ہے۔ اور اس امر میں بہت سی احادیث اور خبریں مردی
 ہیں۔ صرف اُن حدیثوں کی تعمیل کرنے کے لیے میں کچھ تھوڑی سی رقم آپ کو ہدیہ و تحفہ
 دینے کے لیے لیتا آیا ہوں تاکہ آپ اسے اپنے مصارف قلم و دوات وغیرہ میں صرف کریں“
 یہ کہنے کا غد کی ایک بہت بڑی بیڑیا میرے سامنے رکھ دی اور اُٹھ کے چلے گئے۔ اُن کے
 جانے کے بعد میں نے کھول کے دیکھا تو اس کا قدین پانسو درہم پلے ہوئے تھے۔ اسی
 طرح ابو بکرؓ کی لغوی کہتے ہیں کہ پوچھنا تو اس کا قدین پانسو درہم پلے ہوئے تھے۔ اسی
 تشریف لائے اور ایک کا غد بیٹھا ہوا رکھ کے فرمانے لگے ”اس رقم کو تم قبول کرو۔ احادیث
 رسول اللہ ﷺ گھننے کے لیے تم کو کاغذ کی ضرورت خواہ مخواہ ہوگی۔ اسی رقم سے کاغذ
 منگواؤ“

ابو بکرؓ بغدادی کی خطابت اور شہرت و ناموری کے عہد میں بغداد ایک بہت
 بڑے فتنہ و فساد کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک اسلامی شہر میں جہاں کسی غیر مذہب کی حکومت
 کا کسی قسم کا اثر نہیں ہو سکتا تھا وہاں سوائستی اور شیعوں کے تنازعات کے اور کون
 فساد ہو سکتا ہے؟ ہم اس ہنگامہ روح فرسا کے مختصر حالات بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ

ہمارے شہر کے سُنی اور شیعوں اُس ہنگامہ کو دیکھ کے عبرت پکڑیں۔ ایران کے اجدادوں میں سے کسی سوداگر کے پاس ایک ہوشیار اور لائق غلام تھا۔ ابوالمحارث ارسلان بسا سیری اس سوداگر سے اُس غلام کو بہار اللہ بن حفصہ الزوہر دلمی نے خرید کر لیا۔ چونکہ زکی ہوشیار چالاک اور خوش سلیقہ تھا لہذا شاہی مہربانی اُس کی نسبت روز بروز بڑھتی گئی۔ ہوتے ہوئے اتنا بڑا شخص ہو گیا کہ تمام امور ملکی اور کل پولیسکل معاملات میں سے کوئی امر بے اس کے مشورے کے اجراء نہ آیا۔ تاہم آخر الامر وہ بغداد کا ایک بہت بڑا رکن اور صاحب اثر شخص ہو گیا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک غلام کو بہت بڑی ترقی ہو جائے گی تو وہ خواہ مخواہ جامہ انسانیت سے گزر جائے گا۔ اس مرتبہ پر پہنچ جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ انعام بامر اللہ خلیفہ عباسی کے نامور وزیر رئیس الروسا سے حسد کرنے لگا۔ اور اُن کی خرابی کے درپے ہو گیا۔ رئیس الروسا نے اُسے دبا نا چاہا تو وہ اور اُبھر گیا حتیٰ کہ خود خلیفہ کی اطاعت چھوڑ کر بغداد کے فساد کی آگ بھڑکانے لگا۔ بہت سے اور اہل بغی کی طرح اطراف و جوانب میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانے لگا۔ بہت سے گاؤں میں آگ لگا دی اور اکثر مقامات تباہ و برباد کر دیے۔ خلیفہ نے یہ بھی چاہا کہ وہ راضی ہو سکے بغداد میں چلا آئے اور اُن تھکے ڈون سے دست بردار ہوئے۔ مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ بلکہ اپنے پاس بہت سی فوجیں مرتب کر لیں۔ اور قزاقی سے ملک گیری کی حیثیت میں آگیا۔ اور اب یہاں تک نوبت پہنچی کہ بلاد عراق کے اکثر مہجرین پر خطبہ میں خلیفہ کے نام کے بعد اس کا نام پڑھا جانے لگا۔ خلافت کی فوج اس فتنہ کے زد کرنے کے لیے کافی نہ معلوم ہوئی اور یہ بھی یقین تھا کہ عربوں سے اس امر میں کچھ مدد نہ مل سکے گی۔ لہذا خلیفہ نے چاہا کہ سلطان طغرل بیگ سبکتی کے ذریعہ سے اس فتنہ کو دفع کرانے اور خلافت بغداد کے فرمان کے بموجب سلطان طغرل بیگ بغداد میں آ پہنچا۔ طغرل بیگ کا نام سننے ہی بسا سیری کے دل میں لرزہ پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں ایسے قوی سلطان کا مقابلہ ہرگز نہیں کر سکتا۔ اب اُس نے اور منصوبہ ٹھہرایا۔ وہ یہ کہ مصر میں خلفائے نبوی علیہ السلام کا دور دورہ ہرمان کی قوت بھی ترقی پر ہوا۔ وہ بھی عباس کے پورے حریف ہیں اُن سے اس امر میں اعانت لی جائے۔ لہذا عراق سے مصر میں گیا۔ اور رجبہ میں ٹھہر کے ایک عرصہ درشت خلیفہ المستنصر باللہ عیسیٰ کی خدمت میں روانہ کی۔ مستنصر باللہ اُسکی

عرضداشت دیکھ کے نہایت خوش ہوا۔ اُسکے نام رجبہ کی گورنری اور اپنی نیابت کا ایک زمان بھیج کر بنو عباس سے مقابلہ کرنے کی تاکید کی۔ اور خلافت بغداد کے تباہ کرنے پر اُسکو بہت کچھ کا مادہ کیا۔ اور مدد کا وعدہ کیا۔

اور طغرل بیگ کا حال یہ ہر کہ اس نے بہت سی ہزار فوج کے ساتھ شہر قری بغداد میں منزل کی۔ اور جمعہ کی نماز میں خطیب بغدادی نے خلیفہ بغداد کے حکم کے بموجب خطبہ میں خلیفہ القائم بامر اللہ کے نام کے بعد طغرل بیگ کی ثناء و صفت بیان کی۔ اور اس کے بعد دولت دیا لمہ کے پچھلے بادشاہ ملک رحیم کا نام لیا! اتفاقاً اسی زمانہ میں عوام بغداد اور طغرل بیگ کے ہمراہی سرکون میں ایک ایسا سخت فساد ہو گیا کہ بہت سے ترک قتل ہو گئے۔ اور سلطان طغرل بیگ کی فوج کو بہت بڑا صدمہ پہنچ گیا۔ اور بیشک اسکی وجہ صرف شیعوں کی زیادتی تھی۔ اس لیے کہ سلطان طغرل نے ہمراہی شیعیہ اور خاندان دیا لمہ کے لوگ اور متعلقین عموماً شیعہ تھے جن کو طغرل بیگ کا اماناوار گنہگار اور یہی خیال خود سلطان کو بھی ہوا۔ کہ خود ملک رحیم کے اشارہ سے یہ ساری خرابیاں ہوئیں۔ اُس نے حکم دیدیا کہ دیلمی لوگوں میں سے جو کوئی ملے بے مال قتل کر دالا جائے۔ اور خلیفہ سے خود ملک رحیم کو طلب کیا۔ خلیفہ نے ملک رحیم کو بھیجا! مگر طغرل بیگ کو ایسا عقد نہ تھا کہ یونین فرو ہو جاتا۔ مجبوراً خلیفہ نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ ملک رحیم کو طغرل بیگ کے پاس بھیجا۔ ترکمانوں کی نظر جیسے ہی ملک رحیم پر پڑی اُنھوں نے کسی کا بھی خیال نہ کیا اور فوراً ملک رحیم اور نیز ہمراہیان خلیفہ کو لوٹ لیا۔ اور ملک رحیم کو قید کر لیا! اسی وقت سے خاندان دیا لمہ تباہ ہونے لگا۔ گناہی کے پردے میں غائب ہو گیا۔

ترکمانوں اور بغداد کے عوام اہلسنت کو یہ موقع اُن کے جوش تعصب کے موافق ہاتھ لگا۔ اُنھوں نے تمام شیعوں پر دست ستم درانداز کیا۔ بغداد کا محلہ کرخ جس میں عموماً دیا لمہ در شیعہ رہا کرتے تھے اسکی چھتوں پر سے دیا لمہ کا علم سبز گرا دیا۔ اور بنو عباس کے عام مرکز کے موافق سیاہ پیر پرے اڑا دیے۔ قصہ خاندان اور نقیبوں کو حکم دیا گیا کہ تمام کرخ میں فضائل خلفائے ثلاثہ علی الاعلان بیان کریں۔ الغرض شیعوں پر اس مرتبہ سخت ظلم و جور ہوا۔ اور ان کی تباہی میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھایا گیا۔

ابو عبد اللہ بن جلاب جو شیعوں کے بہت بڑے عالم اور مقتدا تھے اور باب الطاق واقع محلہ کرخ میں رہتے تھے قتل کر ڈالے گئے۔ شیخ ابو جعفر طوسی صاحب ہتھمار جو اس فتنہ کے خوف سے بھاگ کے جزائر میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ ان کے گھر میں آگ لگا دی گئی اور ان کا بیش قیمت کتب خانہ جلا کے خاک کر دیا گیا۔ جس کرسی پر بیٹھ کے وہ درس دیا کرتے تھے اس میں خاص آگ لگائی گئی۔ یہ فتنہ اس حد سے بھی گزر گیا۔ حتیٰ کہ کاظمین شریفین بھی لوٹ لیے گئے۔ اور ان مقبروں میں بھی آگ لگ گئی۔ خاندان دہالم کے قدیم نامور لوگوں کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ کہ سڑی گلی ہڑیان بھی مل جائیں تو ان سے انتقام لیا جائے اس کے ساتھ آل عباس میں سے قدیم نامور خلفا اور زبیدہ خاتون کے مقبروں کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اگرچہ سینوں کی اتنی زیادتی تھی مگر شیعہ بھی خاموش نہ تھے ان کے بنائے جو کچھ بنایا تامل وہ بھی کر گزرے۔ اُنھوں نے بھی علماء اہلسنت کی اکثر قبروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا۔ اور اکثر قبریں کھود ڈالیں۔

مگر وہ اتفاقات زمانہ بھی عجب چیز ہیں۔ ہمیشہ ایک نیا امر ایک نئے پہلو سے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ اتفاقاً سلطان طہرل کو خبر ہو چکی کہ اُس کے بھائی ابراہیم نیال نے بغاوت کی۔ اتنا سنتے ہی اس نے سرزمین عراق کو چھوڑ کے ہمدان کی راہ لی۔ سلطان طہرل بیگ اُدھر گیا کہ بسا سیری گویا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ وہ اپنی فوجوں کے ساتھ بغداد میں آدھمکا۔ خلیفہ کو تو پناہ مل گئی مگر وزیر رئیس الروسا بسا سیری کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ بسا سیری کو پورا گمان اُن گزشتہ مظالم کا رئیس الروسا ہی کی طرف تھا۔ اور عداوت تو تھی ہی۔ اس نے نہایت ظلم کے ساتھ رئیس الروسا کو کڑیوں سے پٹوایا اور پھر اہل کرخ کے سپرد کر دیا کہ طرح طرح کے عذابوں کے ساتھ قید رکھیں۔ اس کے ساتھ ہی حکم دیا کہ تمام دار الخلافہ بغداد و لوٹ لیا جائے۔ بغداد کی دولت کی کوئی انتہاء تھی۔ روپیہ۔ اشرفی۔ جواہرات۔ سونے چاندی کے برتن لوٹ کے اُس قدر جمع کیے گئے کہ اُن کی کوئی انتہاء تھی اس کے بعد چارہ دنہ زیر رئیس الروسا پھر عذاب دینے کے لیے قید خانہ سے نکالا گیا زلت و کبرے بچھا کے اور اونٹ پر اُلٹا سوار کرا کے وہ تمام شہر بغداد میں بھرا یا گیا۔ تمام شیعہ جو سڑکوں پر تاخت و تاراج کرتے پھرتے تھے اس کی صورت دیکھ دیکھ کے اسے گالیاں دیتے تھے۔ اور وہ اُسی

ذلت کی حالت میں بیٹھا نہایت رضا و تسلیم کے لہجے میں یہ آیت بار بار پڑھتا تھا۔ قُلِ اللّٰهُمَّ
مَا لَكَ اَمْلَاكَ قَوْلِي اَمْلَاكَ مِنْ غَشَامٍ الخ اس کے بعد ایک بیل کی کھال اس کو بچائی گئی اور
اُس سے وضع سے اس کو سوئی دیدی گئی۔ تمام علماء بغداد جو اہلسنت تھے ان پر سخت آفت
نازل ہو گئی۔ قاضی القضاۃ ابو عبد اللہ واسغانی پر تین ہزار دینار جرمانہ کیا گیا۔ اور
زبردستی مستنصر باللہ غمی کی بیعت لی گئی۔ علاوہ بسین بغداد کے تمام مشاہیر اور کل فقہاء کی
ذلت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا۔ ابو منصور بن یوسف اور ابو الجحین بن النضر
اور دیگر اعیان دار الخلافت خصوصاً شرفائے خاندان عباسیہ سے جزا و قہر مستنصر
علوی کی بیعت لی گئی۔

خلیفہ بغداد القائم بامر اللہ گرفتار کر کے مہاراش عجمی کے حوالہ کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ اس
پر اسی قید میں طرح طرح کی زیادتیوں تھیں مگر اتنا موقع اسے مل گیا کہ دو سطر میں
منضم حالات بتا ہی بغداد دیکھ کے پوشیدہ طور پر کسی شخص کے ذریعہ سے سلطان طغرل
بیگ کے پاس بھیج دیں۔ جواب میں طغرل بیگ نے ایک آیت قرآنی لکھی جس کا مفہوم
یہ تھا کہ "ہم فوجین لے کے آئیں گے۔ اور انھیں ذلیل و خوار کر کے نکال دیں گے۔ اور
اس خط کے ساتھ ہی خود بھی روانہ ہوا۔ سلطان کے آنے ہی مہاراش عجمی نے حاضر و بار
ہو کے خلیفہ کو اس کی خدمت میں پیش کیا۔ خلیفہ پھر مندرجہ عزت پر بیٹھا گیا۔ اور شیعوں سے گذشتہ
مظالم کی باز پرس ہونے لگی۔ بسا سیری سلطان کی آمد کی خبر سننے ہی بھاگ گیا تھا۔ لیکن براہ
ہوشیاری طغرل بیگ نے اپنے ایک فوجی افسر کو کچھ فوج کے ساتھ ارمن شام کی طرف روانہ
کیا کہ اگر بسا سیری اُدھر جائے تو مقابلہ کر کے فوراً گرفتار کر لیں۔ آخر حوالی کو قدمین بسا سیری
کا پتہ لگا۔ اور خود سلطان طغرل نے جا کے اُس کا سر کاٹ لیا۔

یہ ایک ہنگامہ تھا جو شیعہ و سنی میں ہوا۔ جس نے اسلامی وقعت کو خود اپنے ہاتھ
سے کھو دیا۔ کاش دو دن متحد رہتے تو خلافت بغداد خواہ کسی کے ہاتھ میں ہوتی مگر آج
ہیں کسی قدر مضبوط نظر آتی لیکن وہ عورت کی زندگی درکنار اب اس نکتہ و فلاکت کی زندگی
میں بھی ہمارے ہی شہر کے شیعہ و سنی اُسی طرح لڑ رہے ہیں۔

خطیب بغدادی نے فتنہ بسا سیری کے وقت دیکھا کہ مجھے بھی وہی دقتیں نصیب ہوں گی
جو دیگر اہل بغداد کو نصیب ہوئیں۔ بلکہ میرا مرتبہ کسی قدر برعکاس ہی ہو گا۔ اس خیال سے

سوا ترک وطن کے اُن سے اور کچھ نہ بن پڑا۔ بیچارے نے نہایت خموشی کے ساتھ بغداد کو چھوڑا اور سرزمین شام کی راہ لی۔ اُن کا یہ سفر ایسا خوف و اضطراب کا تھا کہ بیچارے کو بہت دنوں تک پھر گھر آنے کا موقع نہ ملا۔ کچھ دنوں دمشق میں رہ کر پھر وہاں ہر شہر صوبہ میں پہنچے۔ شہر صوبہ سے نکل کے طرابلس شام میں داخل ہوئے۔ وہاں سے حلب میں گئے۔ الغرض خدا جانے کہاں کہاں کی خاک اُڑائی۔ اور بارہ برس یونین خاندان بربادی و سرگردانی میں گزریے تو بغداد آنا نصیب ہوا۔

خطیب بغدادی کی عمر یونین اب آخر ہو چلی تھی۔ اس سفر نے اور توانائی و قوت سلب کر دی۔ فرشتہ اجل جو جوار حق میں پہنچانے کے لیے مدت سے انتظار دیکھ رہا تھا۔ اُس نے پیمانہ عمر لبریز پایا۔ اس لیے کہ اب جو بغداد میں آئے تو عمر ستر برس زیادہ ہو چکی تھی بہر حال بغداد میں ایک ہی سال پہنچے کہ سوا ماہ مبارک رمضان ۱۳۶۳ھ میں بیمار ہوئے۔ ابو بکر خطیب کو دارالسلام بغداد کی موجودگی اور مرجعیت عامہ نے نہایت

دولتمند اور مالدار بنا دیا تھا۔ اور خدا نے اولاد کی طرف سے بالکل مایوس رکھا تھا جب انتقال کا وقت قریب ہوا تو انہی اولاد کی اور اس دولت کثیر کا خیال کر کے بہت بریشان ہوئے۔ آخر اس مضمون کی ایک عرضداشت خلیفہ بغداد کی خدمت میں پہنچی۔ ”خدا امیر المومنین کو ہمیشہ زندہ و سالم رکھے۔ ہمارا وقت قریب آ گیا۔ دنیا میں کوشش و جدوجہد کر کے میں نے کچھ رقم فراہم کر لی ہے۔ اب مجھے سفر آخرت اور پیش ہوا و حیران ہوں کہ کیا کروں نہ کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی اور وارث ہے۔ خواہ مخواہ میرے بعد یہ سب جائیداد بیت المال میں داخل ہو جائے گی۔ لہذا میں خواستگار ہوں کہ مجھے اپنے مال پر اختیار دیا جائے کہ اُسے جس طرح اور جس کام کے لیے چاہوں خرچ کروں۔ اور جس امر خیر پر چاہوں وقف کر دوں“ خلیفہ نے یہ درخواست قبول کی۔ اور خطیب نے فوراً ایسا تمام روپیہ مسند فقہاء اور محدثین کو دیدیا۔ اپنی کتاب میں طلباء اسلام پر وقف کر دیں۔ ابوالفضل بن حیزون کو اپنے کتب خانہ کا متولی مقرر کیا۔ وصیت کی کہ مجھے بشر حافی کے مقبرہ میں دفن کرنا ان سب کاموں سے فراغت کر کے روزِ دوشنبہ ۲ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ میں انتقال کیا اور وہ وعدہ وفا کیا جو ہر جاندار بلکہ ہر مخلوق کے لیے موعود ہے۔ انا لله وانا اليه راجعون

قاضی ابن خلکان نے اپنی تاریخ میں حیرت کے ساتھ لکھا ہے کہ ایک ہی عہد میں دو مشہور و معروف حافظ حدیث تھے جنھوں نے دین کو فیض پہنچانے کے لیے آپس میں بانٹ لیا تھا۔ خطیب بغدادی حافظ ارض مشرق میں تھے۔ اور ابن عبد البر صاحب استیعاب حافظ مغرب تھے۔ ان دونوں نے ایک ہی سال میں انتقال فرمایا۔

خیر جب خطیب نے انتقال فرمایا تھا تو مدرسہ نظامیہ کے قریب سے جہان وہ سکونت پذیر تھے ان کا جنازہ اٹھایا گیا۔ تمام محدثین اور فقہاء اور علماء اہل بغداد کا بہت بڑا گروہ جنازے کے ہمراہ تھا جو مشہور اور بابرکت لوگ جنازے کو اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے ان میں ایک علامہ ابو اسحق شیرازی بھی تھے جن کا حال ہم لکھ چکے ہیں۔ اور جنازے کے آگے اہل علم کا پرکار کے یہ الفاظ کہتے جاتے تھے۔ "ہذا الذی کان یدب عن حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" "یہ وہ شخص ہے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر جو تہمتیں باندھی گئی تھیں ان کو مٹاتا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ کو دفع کرتا تھا۔"

ارض جنازہ محلہ کرخ سے گزر کر جامع منصور میں زمین پر رکھا گیا۔ قاضی ابو الحسن ہمدانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور وہاں سے اٹھائے باب الحریب میں لے گئے جہاں بشرحانی کا مقبرہ تھا۔ اب یہ وہ موقع ہے جب کہ خطیب بغدادی کی تیسری دعا کی مقبولیت ظاہر ہو جاوے۔ اتفاقاً احمد بن علی طریشیشی نے بشرحانی کی قبر کے برابر اپنے لیے ایک قبر پہلے سے کھدوا رکھی تھی اور وہاں روزوں بھر میں ایک دفع جاکے تلاوت قرآن مجید کیا کرتے تھے۔ لوگوں نے جانا کہ خطیب کو اسی قبر میں دفن کر دیں۔ احمد نے رد کا اور کہا "میتیں مویگئیں کہ میں نے اس قبر کو اپنے لیے کھود رکھا ہے۔ اور روزِ بیان بیٹھ کے تلاوت قرآن مجید کیا کرتا ہوں۔ اور بہت سہ ختم کلام اللہ کر چکا ہوں۔ میں کسی کو بیان دفن ہونے دون گا ابو البرکات اسماعیل ابن ابی صوفی کا بیان ہے کہ جب اس نزاع کی خبر میرے والد ابو سعید کو پہنچی تو انھوں نے احمد کو بلایا اور کہا "صاحب اگر خود بشرحانی زندہ ہوتے اور تم اور خطیب بغدادی دونوں ان کے پاس جاتے تو تم دونوں میں سے وہ کس کا اپنے پاس اور برابر بیٹھنا پسند اور گزرتا کرتے" احمد نے کہا "نہیں۔ انہیں میری کیا مجال تھی کہ خطیب سے تقدم کا جسہ اُت کرتا اور ان کے ہوتے بشر کے پاس جائے بیٹھ جاتا۔ ابو سعید نے یہ جواب سن کے فرمایا

تو اسے احمد یہ یقین جانو کہ اولیاء اللہ کی زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں جس پاس ادب کو تم ان کی زندگی میں مرعی رکھتے اب بھی اس کے مطابق عمل کرو۔ اس جملہ نے احمد پر ایسا اثر کیا کہ سکوت کر گئے۔ لوگوں کی درخواست قبول کی۔ اور یوں خطیب بغدادی کی آخری دعا پائی اجابت کو پہنچی تمام لوگوں نے خطیب کو اسی قبر میں دفن کیا۔

خطیب بغدادی کے انتقال سے اہل علم اور تمام عالم اہل اسلام کو بہت بڑا صدمہ ہوا۔ اکثر شعرا نے ان کے مرثیہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی حسرت و اندوہ کے جوش کو ظاہر کیا خصوصاً اسی عہد کے کسی شاعر نے یہ شعر کیا خوب کہا جو واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

لا تزلت قدامی فی التاتیم مجتہداً حق رائدک فی تاریخ مکتوبک
یعنی تو نے ہمیشہ اپنے ادب پر رنج و غم اور مصیبتیں اٹھائے تاریخ میں کہشیں
کیں۔ بیان تک کہ کیا دیکھتا ہوں کہ خود تیرا نام صفحات تواریخ پر لکھا ہوا ہے۔
خطیب کی تصانیف کو اسلام اور دنیا نے ہمیشہ وقعت اور فخر کی نگاہوں سے دیکھا
ابن جوزی ان کی چھٹیں تصانیف بتاتے ہیں۔ اور اکثر دن کا نام بھی لکھا ہے ان
کی تاریخ بغداد کا حال تو ہم بیان کر چکے۔ باقی تصانیف صرف اطلول و فنون
حدیث سے متعلق ہیں۔ جن کی فہرست بتانا شاید عام ناظرین کو دلچسپ نہ معلوم
ہوگا۔ لہذا اس مکتبے عمر اور مرجع و مقتدا سے دہری سوانح عمری کو ہم ہمیں
پر تمام کرتے ہیں۔



مقتول نے اس واقع کی تفصیلی اطلاع قیصر روم ہرقل کو دی۔ ہرقل نے اس کی کارروائیوں پر اعتراض کیا۔ اسکی رائے کو غلط بتایا۔ اور کہا فقط بارہ ہزار عرب تمھارے اوپر حملہ آور ہیں۔ اور تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے حالانکہ تمھارے پاس بے شمار قبلی ہیں اور اگر قبلی ہمارے مقابلے میں مسلمانوں کو اچھا سمجھتے اور جزیہ دینا گوارا کرتے ہیں تو تمھارے پاس اسکندریہ اور مصر کے دیگر مقامات میں ایک لاکھ سے زیادہ رومی سپاہ موجود ہے جس کے پاس کافی اسلحہ ہیں اور میدان جنگ کے لیے بخوبی تیار ہے۔ عربوں کی حالت اور ان کی کمزوری کو جانتے ہوئے پھر بھی تم ان سے کیوں نہیں لڑتے اور قبطیوں کی طرح اپنے آپ کو اور سارے رومیوں کو تم غلام بنائے ڈالتے ہو۔ اب تم یا تو ان سے لڑ کے فتح حاصل کرو یا سب کے سب قتل ہو جاؤ۔ اپنی قوت اور کثرت کو دیکھو اور عربوں کی قلت اور کمزوری کو۔ تمھارے سامنے وہ ایک نوا لہ ہیں۔ لہذا تم فوراً رومیوں کو جنگ پر آمادہ کرو اور بجز اس کے تمھاری اور کوئی رائے نہ ہونی چاہیے اسی مضمون کے خط ہرقل نے مختلف رومیوں کو بھی لکھے۔ ہرقل کا یہ خط پڑھ کے مقتول نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ عرب سٹھی ہو اور کمزور ہیں لیکن باوجود اپنی کمی اور کمزوری کے وہ ہم پر باوجود ہماری کثرت تعداد کے بھاری ہیں۔ ان کا ایک آدمی ہمارے سو آدمیوں کے برابر ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسی قوم ہے جس کو موت زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔ ان میں کا ایک شخص ہم سے لڑنے آتا ہے لیکن اس کی تمنا یہ ہوتی ہے کہ پھر اپنے گھر اور بال بچوں میں واپس نہ جائے۔ ان کو یقین ہے کہ

کافرون کو قتل کرنے سے ہمیں بہت بڑا جھڑپے گا۔ اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ہم قتل ہوں گے تو سیدھی جنت میں جائیں گے۔ انہیں دنیا کی طرف مطلق رغبت نہیں۔ دنیا کی لذتوں سے ان کو فقط اتنا ہی تعلق ہے کہ بقدر ضرورت بھوک پیاس بجھا سکیں۔ اور تن ڈھال سکیں۔ اور ہم لوگ موت کو ناپسند کرتے اور زندگی اور اسکی لذتوں کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ پھر بھلا ہم ان کے مقابلے میں کیا ٹھہر سکتے ہیں اور ان کی طرح مشکلات کا سامنا کیسے کر سکتے ہیں اور میو! میں تو اب خدا کی قسم اس عہد کو نہ توڑوں گا جو مسلمانوں کے ساتھ کر چکا ہوں اور اس صلح کے خلاف ہرگز نہ کروں گا جو مجھ میں اور مسلمانوں میں ہو چکی ہے۔ مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کل تم بھی میری راے کو پسند کر دو گے اور اس وقت کہو گے کہ افسوس ہم نے مفوس کا کہنا کیوں نہ مان لیا۔ یہ سب باتیں میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تمھاری اصلی حالت سے جس قدر میں واقف ہوں ہر قتل نہیں ہے۔ جو کچھ میں جانتا اور خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اُسے قیصر ہر قتل نہ تو جانتا ہے اور نہ دیکھ رہا ہے۔ افسوس تم یہ نہیں پسند کرتے کہ سال میں دو دینار دے کر اپنے جان۔ مال اور اپنے بال بچوں کی طرف سے ہمیشہ کے لیے مطمئن ہو جاؤ!

اس کے بعد اُس نے جناب عمر بن عاص سے کہا کہ قیصر روم نے میرا فعل کو ناپسند کیا۔ اور مجھے اور دیگر رومی سرداروں کو لکھا ہے کہ جب تک کسی کو فتح نہ ہو جائے بلکہ برآپ سے لڑتے رہیں۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے عہد سے پھر جاؤں۔ اور میرے آپ کے درمیان جو طے پا گیا ہے اس سے روگردانی کروں۔ لیکن میرا قابو اپنے اوپر ہے اور اُن لوگوں پر جو میرے کہے میں ہیں۔ لہذا میرے آپ کے درمیان صلح ہو گئی اور میں نے کوئی نقص عہد نہیں کیا۔ میں اور سارے قبیلے اُس صلح کو منظور کرتے ہیں جو میرے اور آپ کے درمیان ہو چکی ہے۔ باقی رہو رومی تو اُن سے مجھ کو کوئی مطلب نہیں۔ اور اب سری آپ سے میں جو نہیں ہیں حضرت عمر بن عاص نے پوچھا وہ کیا کہا اول تو یہ کہ قبیلوں سے کبھی نقص عہد کیا جاسے۔ اور مجھ کو بھی آپ اُن میں شامل سمجھیں اور جو جزیہ اُن پر مقرر کیا گیا ہے وہی مجھ پر بھی عاید کریں۔ اور چونکہ میں نے اور اُنھوں نے مل کر یہ

معاہدہ کیا جو۔ لہذا آپ جس طرح چاہیں گے وہ اس کو پورا کر دیں گے۔ میری دوسری خواہش یہ ہے کہ اب اس کے بعد اگر دقتی صلح کی خواہش کریں تو آپ ان سے ہرگز صلح نہ کریں۔ کیونکہ جب میں نے ان کو سمجھا یا تو وہ مجھ پر اعتراض کرنے لگے اور میری تیسری آرزو یہ ہے کہ جب میں مردن تو آپ اجازت دیں کہ میری لاش کو اسکندریہ میں لے جا کے لوگ کنیسہ ابی حنشل میں دفن کر دیں۔

عمر بن عاص نے نہایت مہربانی سے یہ درخواستیں اس شرط پر منظور کیں کہ دریائے نیل کے دونوں پہلوں میں مسلمانوں کے حوالے کر دیے جائیں۔ اور قبطی وہاں مسلمانوں کے اترنے اور رسد سانی کا بند و بست کر دیں۔ اور فسطاط سے اسکندریہ تک کے کل بازاروں اور پلوں پر ہمارا قبضہ ہو۔ قبطیوں نے اس کو منظور کر لیا اور آپ کے رفیق و مددگار بن گئے۔ رومیوں نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ جنگ کی تیاریاں کیں اور قسطنطنیہ سے ان کے پاس مدد بھی آگئی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں سے اور ان سے مقابلہ ہوا اور ایک سخت خونریز جنگ کے بعد خدا نے ان کو شکست دی۔ اسکے بعد مقام کرکون میں مقابلہ ہوا۔ یہ لڑائی دس روز تک جاری رہی اس معرکہ میں لشکر اسلام کے سردار مقدمہ الجیش حضرت عبداللہ بن عمرو تھے اور جھنڈا حضرت عمرو کے غلام وردان کے ہاتھ میں تھا۔ اس لڑائی میں حضرت عمرو نے صلوة خوف پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی۔ آخر خدا نے اس لڑائی میں بھی مسلمانوں کو فتح دی اور بہت سے رومی قتل ہوئے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اسکندریہ تک رومیوں کا تعاقب کیا۔ رومی اسکندریہ پہنچ کر قلعہ بند ہو گئے۔ اسکندریہ کے قلعہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ تھے کہ بغیر ایک قلعہ کو فتح کیے کسی طرح دوسرے کا رخ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں نے یہاں پہنچ کر مقام حلوہ سے قصر فارس کے آگے تک اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔ قبطیوں کے روسا اور معزین ان کے ساتھ تھے۔ جو سامان رسد اور گھوڑوں کے چارے کی فراہمی میں برابر مدد دے رہے تھے۔ ادھر ملک روم کے قاصد جہازوں کے ذریعہ سے برابر اسکندریہ میں آنے اور جاتے تھے۔ اور اپنے ساتھ سامان جنگ اور رسد پہنچا رہے تھے۔ قیصر روم ہر نقل کتا تھا کہ اگر عرب

اسکندریہ پر قابض ہو گئے تو پھر سری سلطنت کا تعلق افریقہ اور ایشیا سے بالکل منقطع ہو جائے گا اور رومی بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ رومیوں کے جس قدر بڑے گرجے اسکندریہ میں تھے قلمرو روم میں اور کین نہ تھے۔ جب مسلمان ملک شام پر غالب ہو گئے تو اسی زمانے میں یہاں اسکندریہ میں رومیوں کی ایک عید تھی۔ لہذا اس موقع پر قیصر نے دیکھا کہ اگر مسلمان اسکندریہ پر بھی قابض ہو گئے تو پھر ان کی سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ خیال کر کے اُس نے سب لوگوں کو اسکندریہ جانے کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا اور ارادہ کیا کہ اس فوج کی کمان خود اپنے ہاتھ میں لے تاکہ لوگ اس موقع کی اہمیت کو سمجھیں حکم جاری ہوا کہ کوئی رومی باقی نہ رہے جو فوج میں داخل نہ ہو۔ اس لیے کہ اسکندریہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد رومیوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ ہر قل ان انتظامات کی تیاری میں مصروف تھا جب اُسے فرصت ملی تو عرض صریح میں مبتلا ہو گیا۔ اور یہی مرض موت کا ہانا ہو گیا۔ اور مسلمان اُس کے صدمہ سے محفوظ رہے۔ ہر قل سیلیمہ میں مرا۔ مگر لیش بن سعد اس کا سنہ وفات مسئلہ ہوتا ہے۔ اس کے مرنے ہی رومی سطوت و عظمت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جو رومی اسکندریہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے وہ بھی یہ خبر سن کے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

اب اہل عرب اسکندریہ کے چاروں طرف پھیل گئے۔ زیادہ سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ حملے کرنے لگے۔ اور سخت معرکہ اراکمان کین۔ آخر ہر قل کی زندگی میں جارہینے اور اُس کے بعد نو مہینے تک محاصرہ قائم رکھنے کے بعد عربوں نے جمعہ کے دن ۱۰ محرم سنہ ۶۳۷ میں اسکندریہ کو فتح کر لیا۔

عمر بن عاص کئی مہینوں تک اسکندریہ کا محاصرہ کیے رہے۔ اور وہ فتح نہ ہوا۔ اس کی خبر حضرت عمر کو ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ بجز اس کے کہ مسلمان کی حالت میں کوئی تغیر ہو گیا ہو فتح میں تاخیر ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور عمر بن عاص لکھا کہ مصر کی فتح میں اس قدر دیر ہونے پر مجھے سخت تعجب ہے۔ تم لوگ دو سال سے لڑ رہے ہو۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید تم میں کوئی نئی بابت پیدا ہو گئی۔ اور اپنے دشمنوں کی طرح تم میں بھی دنیا کی محبت پیدا ہو گئی۔ حیدر کو

کہ خدا اسی قوم کے ساتھ ہو جس کی نیت سچی اور پاک ہو۔ میں نے چار ہزار فوج تمہارے پاس روانہ کی تھی۔ اور کچھ دیا تھا کہ جان تک میرا علم ہر اس میں چار آدمی چار ہزار کے برابر ہیں۔ ممکن ہے کہ اب ان میں بھی کچھ تغیر پیدا ہو گیا ہو۔ جس وقت میرا یہ خط تم کو پہنچے تو لوگوں کو جمع کر کے ان کے سامنے ایک تقریر کرو۔ ان کو ابھارو اور جہاد کا شوق دلاؤ۔ ساتھ ہی ان کو جہاد و نیک نیتی کی طرف متوجہ کرو۔ پھر ان چار آدمیوں یعنی زبیر بن عوام، مقداد بن اسود، عبادہ بن صامت اور سلمہ بن مخلد کو سب کے آگے بڑھاؤ۔ اور لوگوں کو بتادو کہ ایک شخص کی تکلیف سب کی تکلیف ہے۔ یہ سب کام جمعہ کے دن زوال کے وقت ہوں کیونکہ اس وقت خدا کی رحمت نازل ہوتی ہے۔ اور وہ اجابت و دعا کا وقت ہے۔ لوگوں کو اس وقت اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعا کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت عمر بن عاص نے ایسا ہی کیا اور خدا نے ان کو کامیاب کیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب فتح اسکندریہ میں دیر ہوئی تو عمرو بن عاص کچھ دیر تک چت لیٹ کے غور کرتے رہے۔ پھر اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے کہ میں نے اس لڑائی کے معاملے میں بہت غور کیا مگر یہ ہے کہ جس نے اسکی ابتدا اچھی ڈالی ہر اسی کی کوشش سے اس کا خاتمہ بھی اچھا ہوگا۔ ان کی مراد انصار لوگوں سے تھی چنانچہ انھوں نے عبادہ بن صامت کو بلائے بھندے ان کے ہاتھ میں دیا اور انھیں کے ہاتھ سے اسکندریہ فتح ہوا۔ یہ واقعہ ۶۴۱ء میں ہوا جب اللہ تعالیٰ نے عمرو بن عاص کو شکست دی اور اسکندریہ فتح ہو چکا اور ردھی خشکی و تری کے راستوں سے بھاگے تو حضرت عمرو بن عاص نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک ہزار آدمی اسکندریہ میں چھوڑ دیے اور خود باقی فوج کے ساتھ ان مفردین روم کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ جو خشکی کے راستوں سے بھاگے تھے آپ کے جاتے ہی وہ لوگ جو سمندرون اور جزیرہ یون میں منتشر ہو گئے تھے اسکندریہ کی طرف پلٹ پڑے اور جتنے مسلمان اسکندریہ میں تھے ان میں سے بہتوں کو قتل کر ڈالا۔ صرف چند لوگ اپنی جان بچا سکے۔ اسکی خبر حضرت عمرو بن عاص کو ہوئی تو فوراً اسکندریہ میں واپس آئے۔ اس کو دو بارہ فتح کیا اور وہاں ٹھہرے حضرت عمر کی خدمت میں لکھا کہ میں نے اسکندریہ کو بزدل و شمشیر بغیر کسی معاہدہ کے فتح کیا ہے۔ حضرت عمر نے اس کے جواب میں حکم دیا کہ اب تم اسکندریہ چھوڑ کے کہیں نہ جاؤ۔

جب اسکندریہ فتح ہو گیا جناب عمرو بن عاص نے اس کامیابی کی خوشخبری دینے کے لیے جناب معاویہ بن خدیجہ کو حضرت عمر کی خدمت میں روانہ کیا۔ معاویہ نے جلدی وقت پوچھا کیا کوئی خط حضرت عمر کو نہ دیجیے گا۔ فرمایا خط کی کیا ضرورت ہو؟ کیا تم عرب نہیں ہو کہ میرا پیغام صحت کے ساتھ پہنچا سکو؟ اور کیا تم نے یہ سب واقعات خود اپنی آنکھ سے نہیں دیکھے ہیں؟ حضرت معاویہ نے جب مدینہ میں پہنچ کر حضرت عمر کو فتح کی خبر سنانی تو آپ فوراً زمین پر سجدے میں گر پڑے اور فرمایا۔ الحمد للہ۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ حضرت عمرو بن عاص نے جناب عمر کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا جس میں لکھا تھا کہ حمد و نعت کے بعد آپ کو معلوم ہو کہ میں نے ایک ایسا شہر فتح کر لیا جو جس کی میں فقط اتنی حالت تباہا ہوں کہ اس میں چار ہزار گرج۔ چار ہزار حمام۔ چالیس ہزار یہودی اور چار سو بادشاہوں کی عزت لگا ہیں۔ ابن عبد العزیز بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرو نے فتح اسکندریہ کے بعد بارہ ہزار سبزی فروش اپنے جو بقیوں لاک اور ترکاریاں بیچتے تھے جس رات رعایا کو یہ یقین تھا کہ حضرت عمرو بن عاص شہر میں داخل ہوں گے شہر ہزار یہودی شہر چھوڑ کر چل گئے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ فتح اسکندریہ کا باعث یہ ہوا کہ ابن بسامہ امی ایک شخص نے جو شہر کے ایک پھاہک پر یقین تھا عمرو بن عاص سے کہا کہ میں اس شرط پر شہر کا دروازہ کھول سکتا ہوں کہ آپ مجھ کو اور میری اولاد کو ایمان دین اور میری جائیداد میرے ہی قبضہ میں رہے۔ حضرت عمرو بن عاص نے اسکی درخواست منظور کر لی۔ جس پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ اور آپ شہر میں داخل ہو گئے۔ اسوقت اسکندریہ میں دو لاکھ رومی تھے جو شہر فتح ہونے کے ساتھ ہی بڑے بڑے جہازوں میں سوار ہو کر ملک روم کی جانب روانہ ہونے لگے۔ ان جہازوں کی تعداد ایک سو سے زائد تھی اور اسی ضرورت سے اسکندریہ کی بندرگاہ میں روک لیے گئے تھے کہ وقت پر کام آئیں گے۔ ان جہازوں میں فقط تیس ہزار لوگوں کو مع اپنے اہل و اسباب کے جگہ لی سکی جو لوگ رہ گئے وہ قید ہوئے۔ اور ان پر خراج مقرر کیا گیا۔ ان باقی ماندہ لوگوں کی تعداد عورتوں اور بچوں کو الگ کر کے چھ لاکھ تھی۔

لوگوں نے حضرت عمرو بن عاص سے اصرار کرنا شروع کیا کہ یہ سب ہم لوگوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں بغیر حضرت عمر کی اجازت کے ایسا نہیں کر سکتا چنانچہ آپ نے بارگاہ خلافت میں خط بھیجا جس میں فتح کی اطلاع دینے کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ لوگ کہتے ہیں یہ قیدی تقسیم کر دیے جائیں۔ حضرت عمر نے تحریر فرمایا کہ قیدیوں کو ہرگز تقسیم نہ کرو۔ بلکہ انھیں چھوڑ دو۔ تاکہ اُن سے خراج وصول ہو تا رہے۔ اور وہ مسلمانوں کی مالی حالت کو سدھار سکے۔ اور اسکے ذریعہ سے دشمنوں کے مقابلے کے لیے ان میں قوت پیدا ہو۔ یہ جواب آیا تو حضرت عمرو نے سب لوگوں کو بیڑہ کے شانہ بٹا دیا اور اس کے بعد مصر کی مردم شماری کی گئی۔ ہر شخص پر خراج مقرر ہوا اور یہ علاقہ بھی صلح سے فتح ہو نیا۔ شہروں میں محسوب کیا گیا۔ چنانچہ فی کس دو دینار کے حساب سے جزیہ مقرر ہوا۔ دو دینار سے زیادہ کسی پر نہیں عائد کیا گیا۔ بجز اُس صورت کے کہ کسی کے پاس زمین ہو اور وہ اس کا محصول ادا کرے۔ مگر اسکندریہ چونکہ بڑے شہر فتح ہوا تھا اور مفتوحین سے کوئی عہد و پیمان نہیں ہوا تھا لہذا حکام کی تشخیص کے مطابق وہاں خراج اور جزیہ دونوں مقرر کیے گئے۔

اس کے بعد مصر کے بعض گاؤں میں بغاوت ہو گئی اور وہاں کے لوگوں نے نقص عہد کیا۔ اس پر بلا فروغہ ہو کے عمرو بن عاص نے ہمت حسیس سلطیس اور قرطس کے لوگوں کو گرفتار کر کے مدینہ طیبہ و مدینہ منورہ کی طرف بھیج دیا۔ انھیں وہاں کے لوگوں نے بغاوت کی تھی۔ جب یہ لوگ مدینہ طیبہ میں پہنچے تو حضرت عمر نے ان سب کو رہا کر دیا اور اپنے اپنے گاؤں میں واپس بھیج دیا۔ اور ان کو اور قبطیوں کو اہل ذمہ میں قرار دیا۔

ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ سلطیس حسیس اور ہمت کو لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی رومی گروہ کو مدد دی تھی۔ لہذا مسلمان جب غالب آئے تو ان سب کو اسیر کر کے لونڈی غلام بنانا جائز سمجھے اور کہا کہ اسکندریہ کی عقیمت کے ساتھ یہ بھی ہمارے ملکیت ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص نے یہ واقعہ بارگاہ خلافت میں لکھا تو وہاں سے جواب آیا کہ اسکندریہ اور اُن تینوں گاؤں کے لوگ ذمی ہیں۔ ان پر خراج مقرر کیا جائے۔ اور ان کا خراج اور نذرہ رقم جو قبطیوں

سے شرائط صلح کی بنا پر وصول ہو وہ مسلمانوں کو قوت دینے میں صرت کی جائے
لہذا وہ لوگ نہ قید کیے جائیں اور نہ غلام بنائے جائیں۔ اور اسی حکم کے مطابق
عمل کیا گیا۔

جب اسکندریہ فتح ہو چکا اور عمرو بن عاص نے اسکی عالیشان عمارتیں
دیکھیں تو آپ نے مستقل طور پر وہیں رہنے کا ارادہ کیا اور حضرت عمرؓ سے اسکی
اجازت مانگی۔ قاصد جب یہ خط لے کر حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تو آپ نے اس سے
دریافت فرمایا کہ ہمارے اور ان مسلمانوں کے درمیان جو اسکندریہ میں مقیم
ہیں کیا کوئی دریا بھی ہے؟ اس نے کہا جی ہاں دریا سے نیل بتاتا ہے۔ یہ سن
آپ نے جواب لکھوایا کہ میں یہ نہیں پسند کرتا کہ مسلمان کسی ایسی جگہ چھاؤنی ڈالیں
جس کے اور میرے اور درمیان جاڑوں یا گرمیوں میں پانی ہو۔ یہ خط آپ کے حضرت
عمرو اسکندریہ چھوڑ کر قسطنطین واپس آئے اور وہاں قیام کیا۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کو جب وہ کسریٰ کے دارالسلطنت
مدائن میں اترے ہوئے تھے لکھا کہ میرے اور اپنے درمیان کوئی دریا نہ رکھو تاکہ
جب میں چاہوں تمھارے پاس آ سکوں۔ چنانچہ حضرت مدائن کسریٰ کو چھوڑ کر کوثر
میں آکے فروکش ہوئے۔

جب عمرو بن عاص مصر میں تھے آپ کے لیے ایک خیمہ کھڑا کیا گیا جب
وہاں سے آگے اسکندریہ کی طرف کوچ کرنے لگے تو اس خیمہ کے اٹھاڑ نیچا حکم دیا۔
لوگ خیمہ اٹھاڑنے لگے تو دیکھا کہ اس میں جنگلی کبوتروں کے ایک جوڑے ڈھکھو اُتسل
بنایا اور انڈے دیے ہیں۔ آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا اس نے ہمارے یہاں پناہ لی ہے۔
لہذا خیمہ کو اسی طرح رہنے دو اور قصر کے حاکم کو یہ حکم دے کر روانہ ہو گئے کہ
جب تک کبوتر گرنے نہیں ہو کر یہاں سے نہ اُڑ جائیں۔ خیمہ اٹھاڑا جائے۔ پھر جب
مسلمان اسکندریہ کو فتح کر کے واپس آئے تو کہا اب ہم کہاں اتریں۔ لوگوں نے کہا
قسطنطین یعنی اسی خیمہ میں جس کو عمرو بن عاصؓ روانگی کے وقت یہاں چھوڑ گئے تھے
یہ وہ جگہ ہے جو آج دارالحصار کہلاتی ہے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ اسکندریہ سے واپس آئے مقام قسطنطین

ہونچے تو قبائل عرب ٹھہرنے کی جگہوں کے لیے آپس میں جھگڑنے لگے۔ حضرت عمرو نے ان کے سرداروں کو بلا کر حکم دیا اپنے اپنے لوگوں کے لیے مقامات مقرر کریں۔ فسطاط میں سب سے بڑی مسجد وہی ہے جو عمرو بن عاص نے خاص اپنے خیمے کی جگہ بنوائی تھی۔ اسکی محراب اور منبر خاص اُس مقام پر ہیں جہاں آپ کا خیمہ نصب ہوا تھا۔ اسکے قریب عمرو بن عاص نے حضرت عمر کے لیے ایک مکان بنوایا۔ اور اُن کو لکھا کہ میں نے بیان آپ کے لیے ایک مکان جامع مسجد کے قریب تعمیر کرایا ہے حضرت عمر نے جواب میں لکھا کہ میں حجاز کا رہنے والا ہوں مصر میں گرنے کر کیا کر دوں گا۔ بہتر ہے کہ اسکو مسلمانوں کے لیے بازار بنادو۔ اور وہ مقام بازار بن گیا۔

فتح مصر کے بعد مقوقس نے حضرت عمرو بن عاص سے خواہش کی کہ کوہ مقطم کی چوٹی پر سے ہاتھ ستر ہزار دینار بیع ڈالی جائے۔ عمرو بن عاص کو اس خواہش پر خوب معلوم ہوا۔ اور یہ بات حضرت عمر کی خدمت میں لکھ بھیجی۔ آپ نے جواب دیا تم اس سے پوچھو کہ میں اس کو کون بیع ڈالوں جب نہ بیان کھیتی ہو سکتی ہے۔ نہ بیان کوئی خیمہ بنتا ہے اور نہ کوئی نفع بخش چیز ہے۔ اس ہدایت کے مطابق عمرو بن عاص نے اس سے

یہ سوال کیا تو اُس نے جواب دیا کہ ہم اپنی کتابوں میں اس کے متعلق لکھا پاتے ہیں کہ جس جگہ آپ اترے ہیں اُس کے اور اس پہاڑ کے درمیان جنت کا درخت اُگے گا۔

حضرت عمرو بن عاص نے اس کا یہ جواب حضرت عمر کی خدمت میں لکھ بھیجا جواب میں آپ نے تحریر فرمایا کہ اس نے بیع کہا۔ تم اس مقام کو مسلمانوں کا مقبرہ بنادو کیونکہ ہم کوئی جنت کی کھیتی ایسی نہیں جانتے جو بجز مسلمانوں کے کسی اور کے لیے ہو۔

لہذا جو لوگ پہلے سے وہاں مقیم ہیں اُس میں دفن کیے جائیں۔ اور کسی قیمت پر بھی اسکو فروخت نہ کرو۔ پہلے پہل خاندان مغافر کے ایک بزرگ جن کا نام عامر تھا۔ بیان دفن ہوئے اور اس کے بعد لوگ کہنے لگے کہ اب یہ مقام آباد ہو گیا۔

مصر ایک ایسا ملک ہے جس میں بارش بالکل نہیں ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ

نے زراعت کے لیے وہاں ایک اور ذریعہ پیدا کر دیا ہے۔ اس ملک میں دریاے نیل بہتا ہے جس کی سیکڑوں شاخیں سارے ملک میں بھیلی ہوئی ہیں۔ سال کو ایک مرتبہ زمانہ میں اس دریا میں سیلاب آتا ہے اور سارا ملک تہ آب ہو جاتا ہے۔ دو چار

روز کے بعد دریا کا پانی زمین کو سیراب کر کے اُتر جاتا ہے۔ کاشتکار اس سیراب شدہ زمین میں کاشت کرتے ہیں اور یہی ایک دفعہ کی سیرابی فصل پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ جب مسلمانوں نے مصر کو فتح کر لیا تو لوگ عمرو بن عاص کے پاس آئے اور کہا کہ بیان بہت قدیم نہ مانے سے ایک معمول پڑ گیا ہے۔ جس کے بغیر اس دریا نیل میں طغیانی نہیں ہوتی۔ آپ نے پوچھا وہ کیا؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم ایک کنواری لڑکی کو اس کے ماں باپ کی رضا مندی سے حاصل کرتے ہیں اور اُس کو بہت اچھے کپڑے اور زیور پہنا کر دریا سے نیل میں ڈال دیتے ہیں۔ اسے دریا سے نیل کی دو ٹھن کھتے ہیں۔ جب یہ کارروائی ہو لیتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی دریا نیل میں طغیانی شروع ہو جاتی ہے۔ عمرو بن عاص نے کہا اسلام میں ایسی کارروائی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اسلام اگلی غور سمون کو مٹانے کے لیے آیا ہے۔ وہ کارروائی اُن کے حکم سے رک گئی اور دریا سے نیل کی دو ٹھن اس سال نہیں پیش کی جاسکی مگر تین مہینے گذر گئے اور دریا میں مطلق طغیانی نہ ہوئی۔ لوگوں نے کہا کہ بغیر اس رسم کے ادا کیے دریا میں طغیانی نہیں ہو سکتی۔ اور اب ہمیں ملک چھوڑ کے کہیں اور چلا جانا پڑے گا۔ عمرو بن عاص نے جب یہ حالت دیکھی تو بہت پریشان ہوئے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں لکھا۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ تم نے ان لوگوں سے ٹھیک کہا کہ اسلام اگلی باتوں کے مٹانے کو آیا ہے۔ میں ایک خط بھیجتا ہوں۔ اسے دریا سے نیل میں ڈال دینا۔ یہ ایک رقعہ تھا جس میں لکھا تھا کہ از جانب بندہ خدا امیر المومنین عمر بنام دریا سے نیل حمد و نعت کے بعد معلوم ہو کہ اگر تو خود اپنے اختیار سے بتا ہے تو نہ جاری ہو۔ اور اگر تجھے خداوند واحد قہار بہا انا ہے تو ہم اس واحد قہار سے عرض کریں گے کہ تجھ میں طغیانی لائے عمرو بن عاص نے یوم عید صلیب کے ایک دن پہلے اس خط کو دریا سے نیل میں ڈال دیا۔ کیونکہ اسی دن اہل مصر شہر چھوڑنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عید صلیب کی صبح کو لوگ سو کے اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دریا سے نیل سولہ گز بلند رہا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں اُس قدیم ظالمانہ رسم کا خاتمہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو بد و عادی تھی جس سے دریا سے نیل خشک ہو گیا تھا۔ اور لوگوں نے ارادہ کیا کہ مصر کو چھوڑ کے کہیں

اور جالبین لیکن پھر آپ نے اس امید میں کہ یہ لوگ خداے واحد پر ایمان لے آئیں گے دعا کی اور دریا سے نیل سولہ گز بلند جاری ہو گیا۔ اسی طرح اس وقت خدا نے حضرت عمر بن خطاب کی دعا قبول کی۔
مصر اور اسکندریہ کے فتح ہو جانے کے بعد عمرو بن عاص مصر کے حکمران ہوئے اور اس طرح اس گیند کی پیشین گوئی پوری ہوئی جو ان کی آئین میں آئے گئے تھے۔

قدیم تمدن ایران

(از جناب لطافت حسین صاحب)

زبان ادب - تاریخ اور دیگر علوم و فنون

زبان | السنہ قدیمہ کا مطالعہ اور ان سے موجودہ زبانوں کا ارتقا اور نشو و نما بذات خود ایک ایسا وسیع علم ہے جس پر ہم اس مختصر مضمون میں ایک سرسری نظر بھی نہیں ڈال سکتے اس وقت صرف چند خاص باتوں کی طرف توجہ مبذول کرنا مقصود ہے۔ سب سے پہلے ہم یہ بتادینا چاہتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں جان کین آریہ قومیں آباد ہیں ان کی زبانوں میں چند ایسی خصوصیات مشترک پائی جاتی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان سب کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ قدیم ایرانی سنسکرت لاطینی و یونانی سب ایک ہی درخت کے شاخیں ہیں خصوصاً اوستائی زبان اور سنسکرت کو اگر توام بنیں کہا جائے تو کچھ بچانہ ہوگا۔ ان دونوں میں ایک دوسرے سے اس قدر مطابقت پائی جاتی ہے کہ تھوڑے سے تغیر اعراب و حروف کے بعد بالکل یکساں معلوم ہوتی ہیں۔ اول الذکر غالباً عہد کیا نیان میں باختر یا شرقی ایران میں مروج تھی اور زبان نجا منشی سے جو کتبہاں بے ستون و استخر پر کندہ ہے بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں ورش و داراے اعظم کے عہد میں اوستا کی زبان قدیم ہو گئی تھی بلکہ ممکن ہے کہ کتبات کی زبان بھی کسی قدر ہل گئی ہو کیونکہ اس زمانہ میں مختلف اقوام بابل و آشور کے اختلاط سے شامی زبان خصوصاً آرامائی نے قدیم فارسی میں ایک خاص تغیر پیدا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو بتدریج چند صدیوں کے بعد عہد ساسانیان میں زبان ہیلوی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور ساتویں یا آٹھویں صدی عیسوی تک کم و بیش قائم رہا۔ بعدہ ایک انقلاب

عظیم اس میں پیدا ہوا۔ جو اس زمانہ نے اس کی ہیئت پر بدل دی۔ فاجین عرب کی زبان نے ”پہلوی“ کے چہرے پر ایک نیا روغن پھیر دیا۔ یعنی فارسی جدید کا ظہور ہوا۔ یہ زبان جس کا طرز تحریر و صرف نحو وغیرہ سب عربی کے اصول پر ترتیب دیا گیا اپنے مورث اعلیٰ سے اس قدر مختلف ہو گئی کہ اب مشکل سے پہچانی جاسکتی ہے۔ حسب ذیل مثالیں اس کی شاہد ہیں۔

زبان اوستا	زبان پنجانشی	سنسکرت	فارسی جدید
دروگہ	دروادگہ	دروگھا	دروغ
دور	دوورہ	دوار	دروارہ
زستہ	دستہ	ہستہ	دست
اسپہ	اسپہ	اشوہ	اسب
ازم	اوم	اھم	من
گرہ	گرہ	گرہیہ	گرفتن

طرز تحریر اقوام آریہ گزریے کا غفلت کرتے ہیں تحریر کی ایجاد کا مادہ نہ تھا بلکہ دوسرے اقوام کے دست نگہ رہے۔ غالباً اوستا۔ سامیتک حروف تہجی میں لکھی گئی تھی۔ خطی نسخے جو عہد پنجانشی کو بعد میں رائج ہوئے اقوام بابل و آشور سے ماخوذ تھے۔ بعد ازاں پہلوی و فارسی جدید ان دونوں نے بھی سامیتک طرز تحریر کی تقلید کی۔ مگر اس میں ایسی اصلاح کی کہ رفتہ رفتہ اصل بہتر بنا دیا۔ اس کی ایک عمدہ مثال خط کوئی ہے جو اب تعلیق کی شکل میں کہیں زیادہ خوشنام معلوم ہوتا ہے ایک عرصہ رازنامہ استخر و بے ستون کے پنجانشی کلمات ایک راز سرستہ و عقدہ لانیجل رہے۔ گذشتہ صدی میں چند دانشمندان فرنگ نے جن میں سلو ستردی ساسی (فرانیسی) گروغند (جرمنی) بروفہ رالینس۔ ولس بارخ لومین و جانسن سب سے زیادہ ممتاز ہیں اس تحریری طے کو توڑنے کی کوشش کی اور آخر کامیاب ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف تمام کتبوں کا ترجمہ کر ڈالا بلکہ فارسی قدیم کی ایک لغت و گرامر بھی مرتب کر دی۔ جسے اگرچہ بالکل مکمل و صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ مگر وہ ایک ایسی غیر معمولی جدت تحقیق کا شاہد و عرفی ریزی کا نتیجہ ہے کہ اہل ایران کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور اپنی قوی

ضیغم و جامع العلوم کتاب تھی کہ اگر اُسے ایرینیون کا انیساکلو پیڈیا کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ اس میں آفرینش کائنات سے لیکر تاریخ جزائیہ، حکمت و فلسفہ، نجوم و طب، احکام شریعت و اخلاق وغیرہ سب ہی موجود تھے۔ مورخین کا بیان ہے کہ وہ بارہ ہزار پار جہاں جرم گا و پرطلالی حروف میں لکھی ہوئی خزانہ شاہی میں محفوظ تھی اور حملہ سکندری کے بعد مفقود ہو گئی۔ زمانہ ناسانیان میں موبدون نے اپنے حافظہ یا چند یا قیامندہ صحائف سے اسے پھر مرتب کیا اور زبان پہلوی میں اس کی ایک شرح لکھی جس کا نام نرند تھا۔ پھر اسکی بھی شرح کی گئی جسے پازند کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ دستا کے ۲ کتب یا نسخے تھے۔

انیسوان جو آجکل بھی موجود ہے (دندیداو) کے نام سے پکارا جاتا ہے اس میں اُس زمانہ کا جزائیہ و احکام نجاست و طہارت وغیرہ شامل ہیں۔ تیسرے یعنی ”دسپرد“ شائیش فرشتگان اور پیشوایان طب سے تعلق رکھتا تھا۔ چوتھا یعنی ”یاشت منظوم“ تھا۔ اور قہرمانان قدیم اور بزرگان قوم کے معرکہ آرائیوں و کارناموں کا ذخیرہ تھا۔ غالباً فردوسی نے اپنی شاہنامہ کے واقعات اسی سے اخذ کیے تھے۔ لیکن ان سب سے زیادہ دلچسپ اور ادستہ کی جان وہ حصہ تھا جسے کتاب ”تتا“ کہتے تھے۔ کیونکہ اسی میں ”گاتھا“ کے وہ سترہ سرود شامل ہیں جن کا مصنف زردشت تھا۔ گاتھا جس کا مراد سنسکرت میں گیتا، خود بمعنی سرود ہے۔ ان سرودوں کو جن کا وزن ترتیب۔ تافیہ وردین ہندوؤں کی رنگ وید سے بہت مشابہ ہے۔ ایک قسم کی نثر موزون کہنا چاہیے جس میں مختلف مذہبی مضامین کو نہایت خوبی اور شیریں بیانی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے۔ ایک میں نور و ظلمت کا فلسفہ ہے۔ دوسرے میں مناجات تیسرے میں تعریف گستاخ و مذمت دشمنان۔ چوتھے میں کہ خدائی دختر زردشت کا حال ہے۔ جو جامہ شب کے ساتھ قرار پائی تھی۔ اسی طرح ایک سرود ہے بہ طرز تمثیل یا ڈراما جس میں گائے جسے روح زمین تصور کیا گیا ہے۔ ہور مزد کے سامنے آ کے شکایت کرتی ہے کہ انسان اس کی پرستش نہیں کرتا۔ ہرمزد اس کام کے لیے زردشت کو منتخب کرتا ہے۔ زمین تعجب کرتی ہے کہ یہ شخص ضعیف اسکی

کیا حمایت کرے گا۔ مگر انجام کار انتخاب ایزدی کو قبول کرتی ہے۔
 اکثر سرد و اپنی بلندی خیال اور خوبی بیان کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے
 علم ادب کا نمونہ ہیں۔ ان کا ہر بند یا پانچویں مصرعہ پر ختم ہوتا ہے اور سوال جواب کی
 صورت میں ہے مثلاً ملاحظہ ہو۔
 از تو پرسم راست من فرما ہو را کہ آفرید پدر و بنکی (در) آغاز (یا قدیم)
 کہ (آفرید) خورشید و تارگان (و) ساخت راہ (اخلاک)
 کہ آن ماہ (ما) بزرگ (بدر) میسازد (و باز) ہلال می نماید جز تو
 چنین چیز را مزاد می خواہم (و اسرار) دیگر بدانم
 (سینا۔ گاتھا)

۱۹۲۸ء ۶

۱۔ سنہ ۱۹۲۸ء عیسوی تو جاتا ہے تو جا۔ اور ہنسی خوشی سے جا یہ ضرور ہے
 کہ کسی کو رخصت کرتے وقت ہمیں افسوس ہوتا ہے۔ مگر معلوم ہے کہ ہزار روکین تو ہمارے
 پاس نہ رہے گا لہذا ہم تجھ سے ایسی خواہش ہی کیوں کرنے لگے۔ تیری پی کیا کم ہر بانی کی نسبت
 اور معمولی برسوں کے تو ایک دن ہمارے پاس زیادہ ہمارے اور اس کے لیے ہم تیرے
 شکر گزار ہیں۔
 دیکھنا یہ ہے کہ تیرے زمانے میں ہم پر کیا گزری اور تو نے ہمارے ساتھ کیسا سلوک
 کیا۔ ہماری تہذیب اس کی اجازت نہیں دیتی کہ جانے والے ہمارے شکایت میں ایک لفظ
 بھی زبان سے نکالیں۔ لہذا ہم تجھے برا نہ کہیں گے مرنے والے کو ہمیشہ اچھے الفاظ سے
 یاد کرنا چاہیے۔ لہذا ہم ہی کہتے ہیں کہ یہ سال اچھا تھا اور بہت اچھا۔
 اہل یون ہے کہ یہ سال نہ برا تھا نہ بھلا۔ حقیقی بڑائی یا بھلائی خود ہم میں ہی ہوتی ہے
 بھلائیوں سے ہزاروں بلکہ لاکھوں کا فائدہ ہوا ہو گا۔ اور ہماری برائیوں سے خدا معلوم
 کتنی صحتیں و درہم و درہم ہوئیں اور کتنی آبادیاں کھنڈر ہو گئیں۔
 ہم ہزار چاہتے ہیں کہ شکایت میں کچھ نہ کہیں گے۔ سنہ ۱۹۲۸ء عیسوی تو نے
 اپنے آخری دور میں چلتے چلائے ہیں بہت پریشان کر دیا جس کی مجھ سے بڑی شکایت ہے۔

اور تیرے رخصت ہونے سے پہلے تیرے مونس پر کچھ دیتے ہیں اس زمانے میں چھوٹے شاہ جارج پنجم کی بیاری
سے تو نے جہن ایسا پریشان کر دیا کہ ہمارے ہوش و حواس تک بجا نہیں رکھے اور ہم اس وقت تک کی حالت میں
بسر کر رہے ہیں۔

اسکے علاوہ ہماری شمالی مغربی سرحد پر شاہ الامین اللہ خان کے خلاف بغاوت کے شعلے نمودار
ہو رہے ہیں اور مطلع بہت گرد آلود نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جدید اصلاحوں سے متاثر ہونے کے بعض پرانے
خیال کے ملاؤں نے لوگوں کو مشتعل کر دیا ہے۔ مگر وہ ان کے اصلی حالات کا ابھی تہہ نہیں چل سکتا بعد میں
ظاہر ہو گا کہ اصلیت کیا تھی ہمارے اوپر یہ مصیبت بھی تیری لائی ہوئی ہے۔

اب آگے چلے اور تیرے کی کے علاقے میں داخل ہو لیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ اس ایک سال
کے اندر سارے ملک کی حالت میں انقلاب واقع ہو گیا۔ لباس طرز معاشرت اور بود و باش غرض
ہر چیز بدلی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ رسم الخط بھی بدل گیا۔ وہ ملک ایک چوڑی ٹرک پر سرپٹ دوڑنے
کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ جس ٹرک پر وہ جا رہا ہے دراصل ترقی کی شاہ راہ ہے جس پر
بہت ممکن ہے کہ وہ شاہ راہ دوسروں کے لیے ترقی کا باعث ثابت ہوئی ہو۔ مگر یہ یقینی نہیں کہ وہ کوئی اس
شاہ راہ پر چڑ جائے یقینی کامیاب ہو سکے۔ مگر یہ قوم کی ترقی کے اسباب و اسباب کا نہ ہوا کرتے ہیں بعض
یورپ کی تقلید بہت ممکن ہے کہ ہم ایشیا والوں کو ترقی کے اعلیٰ مدارج تک نہ پہنچا سکے اور کوئی ایسا ناہان
کام جو یورپ کی نقالی کے علاوہ خود انھوں نے کر دکھایا ہو ہمیں ابھی تک نظر نہیں آیا۔

ہم خود اپنے کو دیکھتے ہیں کہ اس سال بھر میں ہم نے کیا کیا جتنا وقت ہمیں ملتا تھا سچ پوچھیے
تو اس کے اعتبار سے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا اور جو کیا وہ نہ کرنے کے برابر ہے۔

حضرت اولگڈ از کا یہ سال بھی بڑا نا اچھا جو اتفاقاً ختم ہو گیا اور سنی زید علی میں ایک سال کا
اضافہ ہوا۔ یہ سال دگلڈز کے لیے کیسا برا۔ اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔ مگر ہم تو اسے دگلڈز کے
لیے کوئی کامیاب سال نہیں سمجھتے۔ دگلڈز کو ہم اپنی مرضی کے مطابق اطمینان کے ساتھ نہ کمال
سکے۔ مگر ہمیں امید بلکہ یقین ہے کہ آئندہ سال حق پذیر رہا نہ زیادہ عہدگی اور پابندی اوقات
کے ساتھ کمال سیکھیں گے۔ گزشتہ سال دگلڈز کے خود بارون کی خدمت میں سلاطین انعامی ناول
کے بجائے ایک تاریخی کتاب نذر کی گئی تھی۔ اس سال بھی ناول کے تیار ہونے میں بہت دیر
ہو گئی ہے۔ لہذا اس ناول کو ہم آئندہ سال کے لیے اٹھائے رہے۔ لہذا ہمیں اور اس سال
انعام میں مولانا مولوی محمد عبدالحمید صاحب شرم مرحوم کی آخری زمانے کی تصنیف
”مختصر“ اسی ماہ کے آخر میں ہائیج کے آئندہ سال کا چندہ ذریعہ دی بی
وصول کر لیں گے۔

خاکسار محمد صدیق حسن۔ ایڈیٹر دگلڈز
کنو

دگلہ از

مولانا شہر رحوم کی یادگار داردو کا مشہور ادبی و تاریخی رسالہ جس نے زبان اردو کے علمی خزانے کو اعلیٰ ترین سطح پر لے کر آیا۔ یہ اردو ناول کو ایک سال خریدار رہنے کے بعد اگر وہ دوسرے برس بھی خریدار رہیں تو ایک نیا ناول مفت نذر کیا جاتا ہے۔ اور وہی سال اب اس کے چندہ اور محصول ناک پر ایک روپیہ بارہ آنہ دین دی کی روانہ کروایا جاتا ہے۔
شیخہ بیجو دگلہ از۔ لکھنؤ

تصانیف مولانا محمد عبد الحلیم صاحب مرحوم

سایح سواغھری اور لکچر وغیرہ

- (۱) جنید بغدادی حضرت جنید کے حالات۔
- (۲) ابو یوسف ثعلبی حضرت ثعلبی کے حالات۔
- (۳) حسن بن صباح ابی فرقہ باطنیہ کے حالات۔
- (۴) خواجہ سعید الدین خواجہ جامی کے حالات۔
- (۵) ملکہ زلیخہ سلت کی ایک مونی نثر ادب۔
- (۶) سکنتہ بنت حسین بن جناب کینہ بنت الامام حسین
- (۷) قرة العین اربین کی مشہور مجتہدہ اوی کے حالات۔
- (۸) ولادت سرور عالم مولانا شریف مسند علامہ ابو نعیم
- ابن جوزی کا ترجمہ شہ کا شہرین اور نظم کا نظم میں جلد
- (۹) سفر نامہ شافعی الامم روح کے سفر کے حالات
- (۱۰) سر سیمک دینی برکتیں۔
- (۱۱) قانون وراثت اسلام مولانا کا ایک لکچر۔
- (۱۲) ہندوستان کی موسیقی۔
- (۱۳) ثانی اثین حضرت صدیق اکبر کے حالات
- (۱۴) ذی النورین حضرت عثمان کے حالات
- (۱۵) ابوالحسن تھرت علی کے حالات

سمازخی ناول

- (۱۶) جزیرہ مصر عبد الحمی طون کا تاریخی ناول
- (۱۷) فتح آندلس اسپین پر یون کا حملہ
- (۱۸) برادر مہر البری روم پر گاتھوگون کا حملہ
- (۱۹) مفتوح قلع ایک نہایت دلچسپ تاریخی ناول
- (۲۰) فلپا باوریں اور ایں پر صحابہ کا حملہ

- (۱) فردوس برین جینے جی جنت کی سر۔
- (۲) قیس دلبنی شہو عاشق عبد الواسی

- سعد ذہبی
- (۲۳) لعبت جین محمد مجاہد کا تاریخی ناول
- (۲۴) مقدس نازتین ایک جینہ کا بون بن
- (۲۵) ماہ ملک غورون کا مروجہ اور مہجرات
- (۲۶) یوسف و یوسفہ کل جگہ جی سین پانی
- (۲۷) امام عرب جاہت عرب کی نقل تصویر و جہ
- (۲۸) جو مالے حق حضرت رسول اکرم کی سوانح
- عمری بطور ناول حصہ اول و دوم کا ناول
- (۲۹) زوال بغداد و شیعیہ سنوں کی انتہائی کا
- عرب تک تیرہ ناول کی تباہی
- (۳۰) شوقین ملکہ دوسرا مصلی لائی
- (۳۱) طاہرہ نہایت دلچسپ ناول
- (۳۲) سینا بازار مولانا کا سب سے اچھا ناول
- (۳۳) تیکلی کا پھل نہایت دلچسپ آخری تصنیف
- (۳۴) الفغانو ایک عاشقانہ ناول
- (۳۵) بابک خرمی سلطنت عباسیہ کے حالات
- (۳۶) حسن انجیلنا روس و روم کی لڑائی
- (۳۷) فلوریا فلوریا ہسپانیہ کے عہد خلافت کے واقعات
- (۳۸) ملک العربیز ورجنا رچر و شیرل اور
- صلاح الدین اعظم
- (۳۹) منصور و مہنا سندھ میں ایک انصاری
- خانان کے حالات

حکیم محمد سراج الحق فیروز دگلہ از کٹرہ بزن بیگانان لکھنؤ

